تحقیقی مقالہ

برائے سند ڈاکٹر آف فلاسفی جامعہ بلوچستان
کو پیش کیا گیا

براہوئی غزل آغاز وارتقاء

محقیق
عبدالحمید شاہوانی

زیرنگرانی : ڈاکٹر عبدالرزاق صابر

شعبہ براہوئی جامعہ بلوچستان ۔ کوئٹہ

2002

CERTIFICATE

This is to certify that the research work embodied in this thesis on the topic براہوئی غزل آغاز و ارتقاء has been carried out by Mr. Abdul Hameed Shahwani, Assistant Professor and Chairman, Brahui Department and Ph.D Student Registration No.1973/UB/99/R-33 Dated 31-05-1999 in the Department of Brahui, University of Balochistan, Quetta under my supervision.

The research work presented here in this thesis is of original nature and I consider that the thesis is suitable for submission for the award of Ph.D Degree in BRAHUI of this University.

It is further certified that it has not been accepted for any degree to any other University in consideration for any other degree.

(Dr.Abdul Razzak Sabir)
Associate Professor Brahui
And Director Balochistan Study Centre,
University of Balochistan, Quetta.
(SUPERVISOR)

Chairman,
Department of Brahui,
University of Balochistan.

Prof: Dr. Farooq Ahmed
Dean Faculty of Languages
University of Balochistan
QUETTA.

حلفیہ بیان

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے یہ تحقیقی مقالہ خالصتاً اپنی محنت اور کوشش سے زیرِ نگرانی ڈاکٹر عبدالرزاق صابر تیار کیا ہے اور یہ کہ میں نے یہ تحقیقی مقالہ کسی اور یونیورسٹی میں کسی بھی قسم کی ڈگری کے حصول کیلئے پیش نہیں کیا ہے۔

عبدالحمید شاہوانی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ براہوئی

جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

انتساب

میں اپنے اس تحقیقی کاوش کو اپنے والدِ بزرگوار
میر دوست **محمد خان شاہوانی** کے نامِ نامی سے منسوب کرتا ہوں
جن کا میری ولادت کے ابتدائی دنوں میں انتقال ہوا۔

میری والدہ **محترمہ** کے بھی نام جنہوں نے مجھے
مشکلات کے باوجود زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔

خصوصی اظہارِ تشکر

میں پروفیسر عبدالصبُور بلوچ، شعبہ بلوچی جامعہ بلوچستان کا خصوصی طور پر منت وار ہوں جو دورانِ تحقیق میرے ساتھ میرے سائے کی طرح رہے۔ اس دوران انہوں نے میری ہر ممکن مدد فرمائی۔

فہرست مضامین

عنوان		صفحہ نمبر
	☆ عرض صرف اتنا ہے	1
	☆ اختصار	3
باب اول :	تاریخ و تمہید	7
	۱۔ براہوئی زبان ایک مختصر جائزہ	8
	۲۔ براہوئی زبان کا لسانی جغرافیہ	14
	۳۔ براہوئی زبان کے لہجے	18
	۴۔ براہوئی زبان کا رسم الخط اور املا	22
باب دوئم :	براہوئی ادب	25
	۱۔ لوک ادب	26
	۲۔ براہوئی کلاسیکی ادب	54
	۳۔ براہوئی جدید ادب	71
باب سوئم :	براہوئی غزل آغاز و ارتقاء	85
	۱۔ براہوئی غزل کے ماخذ	86
	۲۔ صنفِ غزل کی بلوچستان آمد	89
	۳۔ براہوئی غزل کی ابتداء	112

۴۔ براہوئی غزل پر دینی اثرات 117
۵۔ براہوئی غزل قیامِ پاکستان کے بعد 123
۶۔ براہوئی غزل دورِ جدید میں 130

باب چہارم : براہوئی غزل کے فنی محاسن 139

۱۔ غزل کیا ہے 141
۲۔ براہوئی غزل اور بحر و وزن 144
۳۔ براہوئی غزل میں تشبیہات اور استعارے کا استعمال 149
۴۔ براہوئی غزل میں تخلص کی روایت 153
۵۔ ترک النقاط براہوئی غزلیں 159

باب پنجم : براہوئی غزل اور مضامینِ عشق 162

۱۔ عشق کیا ہے؟ 163
۲۔ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی 168
۳۔ براہوئی غزل اور مدحِ محبوب 174
۴۔ براہوئی غزل اور رندانہ مضامین 181
۵۔ براہوئی غزل اور عارفانہ مضامین 189

باب ششم : براہوئی غزل میں جدید رجحانات 200

۱۔ براہوئی غزل کا سیاسی اور معاشرتی پس منظر 203
۲۔ براہوئی غزل میں مقصدیت 215
۳۔ براہوئی غزل میں رومانویت اور کلاسیکیت 224
۴۔ براہوئی غزل میں الم نگاری 238

۵۔ براہوئی غزل اور مزاحمت 245
۶۔ براہوئی غزل تنقید کا عنصر 257
۷۔ براہوئی غزل میں نفسیاتی رجحانات 263

باب ہفتم : براہوئی غزل گو شعراء 275

۱۔ قدیم دور کے براہوئی غزل گو شعراء 276
۲۔ درمیانی دور کے براہوئی غزل گو شعراء 291
۳۔ جدید دور کے براہوئی غزل گو شعراء 315

☆ ماحصل (Conclusion) 336
☆ کتابیات (Bibligraphy) 344

عرض صرف اتنا ہے

بلوچ قوم نے تاریخِ عالم میں اپنی ایک منفرد پہچان و شناخت کے ساتھ ساتھ ایک مہذب قوم کے طور پر بھی خود کو تسلیم کروالیا ہے۔ اس قوم نے جہاں بھی قدم رکھے، یہ قوم جہاں بھی آباد ہوئی وہاں انہوں نے اُس خطۂ زمین پر امن اور خوشحالی کیلئے جنگیں لڑیں۔ اِن بلوچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد براہوئی زبان بولتی ہے جس کی وجہ سے اُنکا اپنا ایک تعمیری و تخلیقی ادب بھی وجود رکھتا ہے، جس کی ایک شاندار تاریخ اور تابناک ماضی بھی ہے۔

میرا تعلق چونکہ ادب کے شعبے سے ہے اسلئے میں نے اس گروہ کے ادب سے شاعری اور شاعری میں غزل کا انتخاب کر کے اُسے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ بہت سے علماء ادب براہوئی زبان کی شعری تاریخ کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی سے کرتے ہیں۔ براہوئی شاعری کو ان ادوار میں جو مقام حاصل ہوا وہ کسی بھی زبان کی شعری ادب سے کم تر نہیں۔

براہوئی ادبی سرمائے کو صحراؤں اور کوہ ودمن میں موجود گڈریوں، چرواہوں، ساربانوں اور خانہ بدوشوں نے سینہ بہ سینہ زندہ رکھا اور آگے بڑھایا وہ براہوئی ادیب اور دانشور قابلِ صد احترام ہیں کہ جنہوں نے سینوں میں مدفون ان ادبی خزانوں کو کتابوں میں منتقل کیا۔

براہوئی ادب پر جدید سائنسی خطوط کی بنیاد پر بہت کم کام ہوا ہے۔ میرے اس مقالے کے مکمل ہونے سے قبل براہوئی ادب پر صرف دو نام ایسے ہیں جنہوں نے تحقیقی کام کیئے ہیں۔ پہلا نام ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی صاحب کا ہے جنہوں نے "براہوئی اور اردو زبان کا تقابلی جائزہ" پر اور دوسرا نام ڈاکٹر عبدالرزاق صابر کا ہے جنہوں نے براہوئی اور بلوچی زبانوں کے روابط پر تحقیقی کام کیا ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے آئندہ کے محققین اور ادیبوں کیلئے سائنسی خطوط پر تحقیق کرنے کیلئے بنیاد فراہم کیا اور آج براہوئی ادب کے بہت سے پہلوؤں پر اسی انداز میں کام ہو رہا ہے یعنی راقم الحروف نے "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء" کے موضوع پر پروفیسر خدائیداد گل نے "براہوئی افسانہ آغاز و ارتقاء" کے موضوع پر ایم فل کے مقالے تحریر کیئے ہیں جبکہ ایک نوجوان ادیب خادم لہڑی "براہوئی ڈرامہ ایک تحقیقی جائزہ" پر اپنے ایم فل کے تحقیقی مقالے پر کام مکمل کر رہے ہیں۔

میں بھی اس کاروان میں شامل ہوں جس نے براہوئی زبان میں کہی گئی غزلوں کی تاریخ کا انتخاب کر کے اس موضوع کو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کیلئے منتخب کیا۔ موضوع کے حوالے سے یہ ایک محنت طلب اور مشکل ترین کام تھا جسے ایک چیلنج سمجھ کر میں نے قبول کیا اور شب وروز کی محنت سے اسے بخیر و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

تحقیق تو نئی دریافت یقیناً نہیں ہے مگر اس میں یہ پیچیدگی ضرور ہے کہ آپ ان مواد کو از سرِ نو ترتیب دیں گے جو غیر منظم اور غیر مربوط انداز میں بکھرے پڑے ہیں اور جن پر صدیوں کی دھول جمی ہوئی ہے۔ ان بکھرے ہوئے مواد کو اکٹھا کرنا، انہیں ترتیب کے مراحل سے گزارنا، ایک ایک کر کے ہر مواد سے ان کے دھول ہٹا دینا یقیناً کوئی آسان کام بھی نہیں ہے اسکے لئے برسوں کی مشقت درکار ہوتی ہے۔ میرے اس تحقیق کیلئے مجھے بھی ان مراحل اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

میں نے براہوئی غزل کو مختلف زاویوں، روئیوں اور رجحانات کے ساتھ ساتھ اسے عالمی اور ہمسایہ زبانوں کے ادب کے تناظر میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے اس پر میں کہاں تک انصاف کر سکا ہوں یہ فیصلہ میں وقت اور تاریخ پر چھوڑتا ہوں۔

دورانِ تحقیق جن احباب نے مجھے توجہ دی، پیار دیا اور میری اس چھوٹی سی علمی اور ادبی کاوش کیلئے ہمدردانہ رویہ رکھا میں تہہ دل سے اُنکے لئے دعاگو ہوں اور انکا شکر گزار ہوں ۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اُن کے احترام میں کس طرح میں اپنے جذبات کا اظہار کروں لیکن روایتاً مجھے اسکا اظہار بھی کرنا ہے۔ ان احباب اور دوستوں میں سب سے پہلے میں جامعہ بلوچستان میں بلوچستان اسٹڈی سینٹر کے ڈائریکٹر اور براہوئی ادب کے ممتاز دانشور پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنکی سرپرستی اور مفید مشوروں سے پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ میں جناب پروفیسر نادر قمبرانی صاحب کا مشکور ہوں کہ جن کی حوصلہ افزائی نے مجھے تحریک دی۔ میں نوشین قمبرانی کا صدقِ دل سے ممنون ہوں جن سے دورانِ تحقیق میرا بار بار واسطہ پڑا اور پرخلوص انداز میں انہوں نے میری مدد فرمائی۔ میں ڈاکٹر نجم الرشید، شعبہ فارسی، پروفیسر شرافت عباس، رئیس شعبہ فارسی، پروفیسر نذر محمد پانیزئی، رئیس شعبہ پشتو، پروفیسر عابد شاہ عابد، محترم عبدالکریم بریالے، پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری ہر ممکن مدد فرمائی۔ آخر میں جناب مقبول شاہوانی اور جناب سعید شاہوانی صاحب کا بھی شکریہ جنہوں نے کمپیوٹر کمپوزنگ کے دوران بہت ساری کوتاہیوں کو نظر انداز کیا اور جنکی دن رات کی محنت و مشقت سے میرا یہ مقالہ اختتام پزیر ہوا۔

عبدالحمید شاہوانی
اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ براہوئی،
جامعہ بلوچستان شالکوٹ
11 مئی 2002ء

اختصار Abstract

براہوئی غزل آغاز و ارتقاء کے موضوع پر لکھا ہوا اس تحقیقی مقالے کا بنیادی مقصد (object of study) پاکستان میں بولی جانے والی سب سے قدیم زبان براہوئی میں غزل اور اُسکے ارتقاء کا جائزہ لینا ہے تاکہ ملک کے دوسرے صوبوں اور شہروں میں آباد دیگر زبانیں بولنے والے لوگ اس زبان کے بارے میں اس کی ادبی تاریخ اور ادبی معیارات غرض اسکے جملہ ادبی سفر سے آگاہی حاصل کرسکیں جو آپس میں اتحاد، یگانگت اور بھائی چارے کی فضا کو برقرار رکھنے میں مددگار د معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

اس موضوع پر تحقیق کرنے کا بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ اس زبان میں کہی گئی شاعری کی تاریخ عموماً اور غزل کی تاریخ خصوصاً منظر عام پر آسکے جس سے دوسرے زبانوں کی ادب کی طرح اس زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی شاعری کے اس اہم صنف کی تاریخ سے روشناس ہو سکیں اور ساتھ ساتھ اس صنف میں کہی گئی تجربات اور رجحانات کو براہوئی شعری رویوں کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا جاسکے۔ اسکے علاوہ اس تحقیق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ تحقیق براہوئی شاعری کی تاریخ اور غزل پر کام کرنے والے آئندہ کے محققین کیلئے ابتدائی کاوش ثابت ہو۔ اس تحقیق سے براہوئی غزل کی صنف پر ایک ادبی بحث و مباحثے کے روشن امکانات پیدا ہونگے جس سے براہوئی شاعری اور غزل کے مستقبل پر بہتر اور مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

اس تحقیق کیلئے جو طریقِ کار (method) اپنایا گیا ہے اس میں براہ راست ادبی کتب سے استفادہ، ادیبوں اور شعراء سے بالمشافہ ملاقات اور انٹرویوز ادبی اداروں میں دستیاب ریکارڈ اور موضوع پر دستیاب امدادی کُتب اور حوالہ جاتی رسائل و جرائد اور اخبارات سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا دائرۂ کار (dillimitation) صوبہ بلوچستان ہے تاہم اسمیں دوسرے صوبوں اور دیگر ممالک میں شائع ہونے والے کُتب، رسائل، مقالے اور مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

"براہوئی زبان میں غزل آغاز وارتقاء" کے موضوع پر لکھا ہوا یہ تحقیقی مقالہ براہوئی زبان میں شعری ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس مقالے کے پہلے باب میں براہوئی زبان کا تعارف اس زبان میں مُروج مختلف لہجے، اسکی رسم الخط اور املا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس مقالے کا باب دوئم براہوئی ادب سے متعلق ہے۔ اس باب میں براہوئی زبان کی ادبی تاریخ بیان کی گئی

ہے جس میں اس کی لوک ادب کی تاریخ بھی شامل کی گئی ہے۔ براہوئی لوک ادب کی تاریخ بھی دنیا کے دوسرے مہذب زبانوں کی تاریخ کی طرح شاعری سے شروع ہوتی ہے۔ براہوئی کی لوک شاعری میں قدرتی مناظر، شادی بیاہ سے متعلق لوک گیت، خوشی، غم، جُدائی و فراق کے گیت، مرثیے سے لیکر ہر قسم کے رسومات سے متعلق گیت، نغمے، لوریاں وغیرہ شامل ہیں۔ نثری لوک ادب میں کہاوتوں، ضرب الامثال، جہارتوں، لوک کہانیوں اور داستانوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ اس باب میں براہوئی زبان میں تحریر شدہ قدیم ادب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں براہوئی کی قدیم شاعری، قدیم نثری ادب کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ نیز اس باب میں جدید براہوئی ادب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جسے 1947ء کے بعد تخلیق کیا گیا ہے۔ اس دور میں براہوئی زبان میں جو شعری اور نثری ادب تحریر ہوا ہے ان کا تفصیلی ذکر اس باب میں موجود ہے۔

اس مقالے کا تیسرا باب جو اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی اہم بھی ہے، براہوئی غزل کے آغاز اور ارتقاء پر مشتمل ہے۔ اس باب میں براہوئی لوک شاعری اور کلاسیکل شاعری کو براہوئی غزل کے ماخذ کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ غزل جن جن خطوں کا سفر طے کر کے بلوچستان پہنچی اور بلوچستان میں مختلف تجربات سے گزر کر جب براہوئی شاعری میں یہ صنف داخل ہوئی ان تمام کیفیات کو اس باب میں سمویا گیا ہے۔ براہوئی غزل کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟ پہلا براہوئی غزل گو شاعر کون تھا؟ اس عہد کی غزلوں میں کون کون سے رجحانات غالب رہے؟ ان سوالات کے تفصیلی جوابات بھی اس باب میں شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جہاں دوسری زبانوں کو اپنی اظہار کا اور اُن زبانوں میں ادبی وسعت کا بہتر موقع ملا، وہاں براہوئی زبان و ادب بھی آزادی کے اس عمل سے پوری طرح فیض یاب رہی۔ براہوئی ادب کے مختلف اصناف اس عہد میں اُبھر کر اور واضح اشکال کے ساتھ سامنے آئے۔ اس ادبی وسعت کا اثر براہوئی شاعری اور خصوصاً براہوئی غزل پر بھی پڑی۔ نئے محاسن کے ساتھ اور نئے نئے موضوعات اپنا کر اس عہد میں غزل بھی اپنی واضح شکل میں سامنے آگئی۔ اس باب میں ان تمام باتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس تحقیقی مقالے کا باب چہارم براہوئی غزل کے فنی محاسن پر مبنی ہے لیکن براہوئی غزل کے فنی محاسن پر سیر حاصل بحث کرنے سے پہلے اس باب کی ابتداء میں غزل کی تاریخی پس منظر اور فنی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس سے ایک طرف غزل کی قدامت اور فن کا پتہ چل جاتا ہے تو دوسری طرف اس تناظر میں براہوئی غزل کی فنی محاسن اور خصوصیات کو بھی منظر عام پر لایا گیا ہے۔

براہوئی غزل میں بحر اور وزن، تشبیہات اور استعارے کا استعمال کے علاوہ غزل کیلئے ضروری دوسری فنی خوبیوں کا ذکر بھی اسی باب میں کیا گیا ہے۔ فنی تجربات کے علاوہ غزل کے حُسنِ بیان اور ہیئتی خوبیوں میں نکھار پیدا کرنے کیلئے بہت سی دوسری زبانوں اور انکے ادب میں وقتاً فوقتاً محدود پیمانے پر کچھ تجربات ہوتے رہے ہیں جن میں اور دوسری باتوں کے علاوہ ترک النقاط غزلیں، فوق النقاط غزلیں اور تحت النقاط غزلیں کہنا بھی شامل ہے۔ براہوئی غزل میں بھی یہ تجربے گاہے بہ گاہے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں ان تجربات پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

"براہوئی غزل اور مضامینِ عشق" یہ اس تحقیقی مقالے کا پانچواں باب ہے۔ بقولِ کسے جہاں انسان بستے ہیں وہاں عِشق پروان چڑھتی ہے اور جہاں عِشق اپنا اظہار کرتی ہے وہاں غزل کا نمو پانا قدرتی امر ہوتا ہے۔ یہ باب انہی لمحات اور کیفیات کے مختلف موضوعات پر مبنی ہے۔ عِشق کیا ہے ؟ عِشقِ حقیقی اور عِشقِ مجازی کے منازل اور مدارج کہاں سے اپنی سفر کا آغاز کرتے ہیں ؟ ان سوالات کا تفصیلی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ انکے علاوہ اس باب میں براہوئی غزل اور مدح محبوب کو عمومی تناظر کے علاوہ مخصوص اور روایتی انداز میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ غزل چونکہ اپنے ہیئت کے اعتبار سے عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہے لیکن کبھی کبھار اس صنف میں دوسرے سماجی اور معاشرتی موضوعات بھی جگہ پاتے ہیں اسلئے اس باب میں براہوئی غزل میں رندانہ اور عارفانہ مضامین کے رجحانات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس تحقیقی مقالے کے باب ششم میں براہوئی غزل میں در آنے والے جدید رجحانات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ جس وقت براہوئی غزل ابتداء سے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی اسوقت اس خطے کے سیاسی اور معاشرتی حالات کیسے تھے ؟ اس باب کے ابتداء میں ان حالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ باب اس تحقیقی مقالے کا سب سے زیادہ دلچسپ اور منفرد باب اسلئے بھی ہے کہ اس باب میں انتہائی اہم موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ براہوئی غزل میں مقصدیت، رومانویت، الم نگاری اور مزاحمت کو براہوئی غزل کے مخصوص مزاج کے سانچے میں دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ نیز براہوئی غزل میں تنقید کے عنصر کو بھی اس باب میں موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ وہ موضوعات اور عنوانات ہیں جو نہ صرف براہوئی غزل کو ایک مخصوص پہچان کا حوالہ دیتے ہیں بلکہ ان موضوعات اور عنوانات کا براہوئی غزل میں سامنے کے بعد یہ براہوئی معاشرے اور عام فرد کے مزاج کا حقیقی عکس بھی ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کے باب ہفتم میں براہوئی غزل گو شعراء کا تعارف اور ان کی شاعری کے نمونے پیش کئے

گئے ہیں۔ان شعراء کے تعارف کو مزید واضح کرنے کیلئے اس باب میں ان شعراء کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں قدیم دور کے غزل گو شعراء ، درمیانی دور کے غزل گو شعراء اور عہد جدید کے براہوئی غزل گو شعراء شامل ہیں۔ ان شعراء کے تعارف اور ادوار کے تعین پر بحث کرنے سے یہ اختتامی باب دوسرے تمام ابواب سے جڑ جاتا ہے جو اس تحقیقی مقالے کے تسلسل کو نتیجے کے طور پر سامنے لاتا ہے۔

باب اول : تاریخ و تمہید

۱۔ براہوئی زبان کا مختصر جائزہ

۲۔ براہوئی زبان کا لسانی جغرافیہ

۳۔ براہوئی زبان کے لہجے

۴۔ براہوئی زبان کا رسم الخط

براہوئی زبان کا مختصر جائزہ

آج زبانوں کا مطالعہ سائنس کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ زبانوں کا مطالعہ وہ سائنس ہے جس کے ذریعے ہم گزرے ہوئے زمانوں یا آج کسی قوم کی سیاسی، سماجی، تاریخی اقدار، عروج و زوال کے بارے میں مخصوص معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب انٹرنیٹ اور ذرائع ابلاغ کی جدید ٹیکنالوجی کے توسط سے پوری دنیا سمٹ کر ایک گلوبل کاٹیج Global Cottage کی صورت اختیار کر چکی ہے بلکہ دنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک معلومات حاصل کرنے کے لئے جدید سے جدید ترین ذرائع ابلاغ جو Super Information Highway کہلاتی ہے، کے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں جس کی بدولت الفاظ نے اپنا سفر ہفتوں کی بجائے لمحوں بلکہ سیکنڈوں میں طے کرنا شروع کر دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اس تیز رفتاری نے انسانی سوچ و فکر اور زبانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بہت ہی مضبوط اور گہرا کر دیا ہے۔ زبان اظہار کا وہ وسیلہ ہے جو انسانی اندرونی کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بنتا ہے۔

براہوئی زبان کی قدامت کے بارے میں دنیا میں مختلف مکاتبِ فکر ہیں جو براہوئی زبان کے بارے میں ایک خاص اور منفرد نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں، اس باب میں دنیا کے مختلف ماہرینِ لسانیات کے نظریات کو یکجا کرنا یوں تو دشوار ہے تاہم ان میں سے چند ایک کا نام اور نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔

ہنری پوٹنگر Hanery Potingar وہ پہلے سیاح ہیں جنہوں نے سب سے پہلے براہوئی زبان کی تاریخی، لسانی اور سماجی قدروں پر جدید اصولوں کو اپنا کر بات کی ہے۔ ہنری پوٹنگر اپنی کتاب "سندھ و بلوچستان کی سیاحت 1816ء"، "Travels in Sindh and Balochistan 1816" میں پہلی بار بیرونی دنیا کو براہوئی زبان سے متعارف کراتے ہیں

براہوئی زبان کو باقاعدہ طور پر پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھنے والے ایک اور برطانوی افسر آر لیچ R.Leech نے 1838ء میں جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک مضمون چھپوا کر متعارف کرایا۔ پھر اس مضمون کی مزید جانچ پڑتال ہندوستانیات (Indologist) پر کام کرنے والے محقق Cherstien Lessen کرسٹائن لاسن نے 1848ء میں براہوئی زبان کو اپنے ایک مضمون میں ہندوستانی زبانوں کے ایک اہم خاندان دراوڑی گروہ سے بتایا۔

کرسٹائن لاسن کے اس نظریئے کو رہنما اصول بنا کر بعد میں براہوئی زبان پر تحقیق کرنے والے تمام غیر ملکی

محققین نے اپنایا۔ ان ماہرین لسانیات میں ڈینس برے ، بشپ کالڈ ویل اور ا-میو مشہور اور قابلِ ذکر ہیں۔

براہوئی زبان پر کام کرنے والے ماہرین لسانیات کی اکثریت اس بات پر متفق نظر آتی ہیں کہ براہوئی دراوڑی زبانوں کی مغربی شاخ سے ہے اور اس سلسلے میں دو دیگر زبانوں مالٹو(Malto) اور کرخ(Karukh) سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ براہوئی زبان اور دیگر دراوڑی زبانوں کی جغرافیائی تعلق اور درجہ بندی کے بارے میں ایک روسی ادیب و ماہر لسانیات ایم ایس اندرویوف M.S.Andronov کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ اندرویوف نے براہوئی زبان کے بارے میں اپنی کتاب "The Brahui Language, USSR Academy of Sciences Institute of Oriental Studies, Masco" جو 1980ء میں چھپی ہے سے ایک اقتباس ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے اپنی غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ میں لی ہے۔ وہ لکھتے ہیں " براہوئی زبان پر تحقیق کرنے والے ماہرین لسانیات کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ براہوئی دراوڑی زبانوں کے مغربی شاخ سے ہے اور اس سلسلے کی دو دیگر زبانوں مالٹو اور کرخ سے قریبی تعلق رکھتی ہے"۔ براہوئی زبان اور دیگر دراوڑی زبانوں کے جغرافیائی تعلق اور درجہ بندی کے بارے میں وہ مشہور روسی ادیب و ماہر لسانیات ایم ایس آندرویوف M.S. Andranov کے براہوئی زبان کے بارے میں رائے کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

"According to the modern conception, Brahui belongs to the north western group of Dravidian Languages. It is apparently most closely related to the north eastern group of these languages which includes Malto, and Karukh. Brahui is related more distantly to the Gandacoona group. Which includes Kul, Kuvi, Monda, Pengo, Kunda and Gundi, and still more distantly to the central group, which includes Parji, Gadabu, Kolami and Naiki. Southern group Kuruba, Kanada, Kota , Toda, Kurru, Malayalam and Tamil, are most distantly related to Brahui". (1)

براہوئی زبان کے ادیبوں میں ایک معتبر نام ڈاکٹر عبدالرحمان براہوئی کا ہے جو براہوئی زبان اور ادب کی تاریخ

ا۔ صابر، عبدالرزاق، "براہوئی زبان کا لسانی پس منظر" غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، 1994ء، صفحہ 54+55۔

پر مستند شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں، اپنی کتاب "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ" میں لکھتے ہیں :۔

"براہوئی السنہ دراوڑی سے تعلق رکھتی ہے اور پاکستان کی قدیم زبان ہے"۔ (۱)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی ایک مستشرق ڈینس برے Denys Bray کے نظریئے کو اپنا کر براہوئی زبان کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ :۔

"براہوئی زبان دراوڑی زبانوں کے گروہ سے نکلی ہے اور اس نے آزادی سے فارسی، بلوچی، سندھی اور دیگر ہمسایہ زبانوں کے الفاظ اپنائے ہیں"۔ (۲)

جناب ڈاکٹر براہوئی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"براہوئی زبان کے ضمائر استفہام، فعل اور ابتدائی تین اعداد دراوڑی ہیں، "تا" اور "ا" اور لاحقہ "ی" ملیالم اور تامل زبانوں کی طرح ہے۔ جمع کا قاعدہ "ک" دراوڑی گرائمر کے مطابق ہے۔ دراوڑی زبان کی تانیث کے اختتام پر " ڑ" آتی ہے۔ براہوئی میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ مثلاً مَسِڑ (لڑکی)، اِرِڑ (بہن)، لمُڑ (ساس) وغیرہ" (۳)

جس طرح براہوئی زبان کے بارے میں محققین اپنی الگ الگ رائے رکھتے ہیں اسی طرح براہوئی قبائل کے بارے میں بھی مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے کے مطابق براہوئی بھی تین ہزار سال قبل مسیح جنوب مغرب سے دوسرے آریائی قبائل کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوئے مگر اپنے دیگر ہم زبان لوگوں سے قریباً 800 میل کے فاصلے پر رہنے لگے۔ براہوئیوں کے بارے میں دوسری رائے آر گستائن نے 1923ء میں قائم کی۔ اُس کا خیال ہے کہ شاید قبل از تاریخ دراوڑی آبادی کا ایک طبقہ اپنی اصل وطن انڈیا سے الگ ہو کر اوپر کی جانب نقل مکانی کر گیا ہو۔

ان نظریات میں براہوئی زبان کو دراوڑی خاندان کی زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن بعض ماہرین لسانیات انکی اس رائے سے متفق نہیں کیونکہ خود انہی ماہرین لسانیات جنہوں نے براہوئی زبان کو دراوڑی زبان قرار دیا ہے ان میں سے بھی کئی خود اپنی رائے سے مطمئن نہیں ہیں جیسا کہ امیمو۔ وہ لکھتے ہیں :۔

۱۔ براہوئی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن۔ براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ۔ مرکز اردو بورڈ۔ لاہور 1982۔ صفحہ 51

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً

"Again further research on this problem is indicated; not all Dravidianists have been willing to accept Brahui membership in an north dravidian sub group" (1)

اگر انہی ماہرین لسانیات کی رائے من و عن تسلیم کر بھی لی جائے کہ براہوئی زبان واقعی دراوڑی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے تاہم پھر بھی براہوئی پر زبانوں کی نمایاں اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس بارے میں پھر مسٹر ایمنیو کہتے ہیں کہ :-

" It was early remarked that Brahui was swamped with Iranian vocabulary. The few scholars concerned soon began to see that in some structural respectal so Brahui had been ironianized or perhaps more specialy Balochised" (2)

علم اللسان کے ماہرین بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ براہوئی جنہوں نے دراوڑی زبان اپنالی ہے لیکن اُن میں کوئی دراوڑی نہیں ہے۔ تاہم زبان اور نسل کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا کوئی نئی بات نہیں۔(۳)

براہوئی زبان کے بارے میں ملک الشعراء بلوچی و براہوئی کے ممتاز ادیب، شاعر اور مؤرخ میر گل خان نصیر اپنی ایک الگ اور منفرد رائے رکھتے ہیں۔اُن کا خیال ہے کہ :-

"یہ اُن قدیم باشندوں کی زبان تھی جو قلات کے کوہستان میں بلوچی بولنے والے قبائل یا "کوردگالی" (موجودہ براہوئی) بولنے والے قبائل کی آمد سے قبل آباد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نووارد قبائل اس سرزمین پر آکر آباد ہوئے اور یہ زبان اختیار کی۔ ان نووارد قبائل میں بلوچوں کے کچھ حصے جو براہوئیوں سے قبل یہاں آباد تھے اور ترین افغان قبائل کے کچھ حصے جنہوں

ا۔ صابر، عبدالرزاق، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، 1994ء، صفحہ 55 ۔

2- Emonou M.B. 1980 "Language and Linguistic Area" Edited by Anwar S. Dil, Essays of M.B. Emeneau Storford California, University Press, Page 318.

۳۔ صابر، عبدالرزاق، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، 1994ء، صفحہ 56 ۔

نے براہوئیوں کی امداد کی اور کچھ یہاں کے قدیم باشندے (قدیم سیوائی
قبائل) آپس میں مدغم ہو کر اور کچھ جٹ اور جدگال قبائل بھی اُن کے ساتھ
ملکر ایک آزاد قبائلی تنظیم بنانے میں کامیاب ہوئے جس میں موجودہ
براہوئی زبان عالم وجود میں آئی"۔(۱)

اگر براہوئی قبائل کو کوچ کہا جائے تو مشہور عرب سیاح ابن حوقل جس نے ساتویں صدی ہجری میں یہاں کی سیاحت کی اپنی کتاب "صورت الارض" میں لکھتے ہیں کہ :۔

"زبان مردم کرمان فارسی اس
جز قفس (کوچ) کہ علاوہ بر آں
زبان دیگر نیز دارند" (۲)

ان محققین کی آراء کے علاوہ بلوچستان کے کچھ اور مقامی ماہرین کی رائے کو بھی اس مقالے میں جگہ دی گئی ہے تا کہ اس مقالے میں براہوئی زبان کا مطالعہ کرنے والے قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھا جاسکے۔ان آراء میں سے ایک رائے نور محمد پروانہ کا بھی ہے ان کا خیال ہے کہ :۔

"براہوئی قبائل نسلاً دراوڑی ہیں یا نہیں لیکن یہ بات تفصیلی و قطعی ہے کہ وہ
اپنے دوسرے بلوچ اور پشتون قبائل سے مختلف ہیں"۔(۳)

اس بارے میں انور رومان کا خیال ہے کہ :۔

براہوئی قدیم فارسی کا ایک حصہ ہے جس کا مطلب پہاڑی لوگوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔پشتو میں "روہ" پہاڑی کو کہتے ہیں۔لیکن قواعد کے اعتبار سے پروفیسر انور رومان براہوئی زبان کو وادی سندھ کی قدیم زبان قرار دیتے ہیں جو موہن جو داڑو میں آباد لوگوں کی زبان تھی۔(۴)

۱۔ نصیر، میر گل خان، "کوچ و بلوچ"، دوسرا ایڈیشن، 1983ء، صفحہ 42۔
۲۔ صابر، عبدالرزاق، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، 1994ء، صفحہ 57۔
۳۔ پروانہ، نور محمد، "ثقافت و ادب وادی بولان میں"، بزم ثقافت کوئٹہ، صفحہ 269۔
۴۔ رومان، انور، پروفیسر، "ثقافت و ادب وادی بولان میں"، بزم ثقافت، کوئٹہ، صفحہ 269۔

جبکہ ان تمام آراء سے یکسر مختلف ایک رائے بلوچستان کے معروف مؤرخ اور دانشور آغا نصیر خان احمد زئی کی ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"جب انگریزوں نے بلوچستان پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت بلوچستان پر بلوچوں کا وہ گروہ جو براہوئی کہلاتے ہیں حکمران تھے۔ انگریزوں نے یہاں بھی برصغیر والی پالیسی اختیار کی۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا۔ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نفرت کرانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہاں بلوچستان میں حالات مختلف تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہاں زبان کو مسئلہ بنا کر براہوئی اور بلوچی زبان بولنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے اُنکو جدا قومیں قرار دیا تاکہ وقت آنے پر بلوچستان پر قبضہ آسانی سے کیا جائے۔ یعنی بلوچ اپنے آپ کو جدا قوم تصور کر کے براہوئی کی مدد نہ کریں۔ انگریزوں کی دوسری حرکت یہ ہوئی کہ انہوں نے براہوئی زبان کو دراوڑی زبانوں کی خاندان سے ایک زبان قرار دیا اور ساتھ ساتھ یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی گئی کہ نسلاً براہوئی دراوڑ ہیں"۔(۱)

آغا نصیر خان تاریخ مردوخ جو شیخ محمد مردوخ کردستانی کی تصنیف ہے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"براخوئی (براہوئی) کُرد قوم کا ایک بہت بڑا طائفہ ہے جنہوں نے کرد قوم کے ساتھ 3700ق م میں مرکزی ایشیا سے جنوب کی طرف نقل مکانی کر کے موجودہ ایران کے شمال مغربی علاقہ جو آجکل آذربائیجان کہلاتا ہے سکونت اختیار کرلی اور انہی اکراد کی وجہ سے علاقہ (ماد) کے نام سے موسوم ہوا۔ بعد کے ادوار میں یہی اکراد کے قبائل مزید جنوب کی طرف بڑھ کر موجودہ کُردستان کے کوہستان پر قابض ہو کر متوطن ہوئے۔ کُردوں کے سردار اعظم کیقباد نے کردوں کے چھ اہم قبائل پار تاسنی، آستروشات، آری زانت، بودی ماد اور بوڑ کو متحد کر کے 883 سال قبل از مسیح فارس میں سلطنت مادستان کی بنیاد رکھی۔ اسی دور میں طائفہ براخوئی نے جو کہ قبیلہ بودی کا ایک بڑا طائفہ تھا توران موجودہ سطح مرتفع قلات پر شہنشاہ کیقباد کے منشاء کے مطابق قابض ہو کر اپنی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ اسی تاریخی حوالے کی تائید میں آج بھی بلوچستان کے جنوبی اور سندھ کے زیریں علاقوں میں براہوئی زبان کو کُردگالی اور براہوئیوں کو کردگال کہتے ہیں۔(۲)

ا۔ آغا نصیر خان زئی، "براہوئی زبان وادب" (ایک جائزہ)، مرتب قیوم بیدار، براہوئی ادبی سوسائٹی، پاکستان 1986ء صفحہ 25,26

ا۔ بیدار، عبدالقیوم "براہوئی زبان وادب" (ایک جائزہ)، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1986، صفحہ 25-56

براہوئی زبان کا لسانی جغرافیہ

براہوئی زبان بلوچستان میں سراوان، جھالاوان، کچھی، چاغی، خاران، لسبیلہ، کوئٹہ، بولان، سبی کے علاوہ سندھ کے خیرپور، نواب شاہ، لاڑکانہ، حیدرآباد اور کراچی ڈویژن کے علاوہ ایران کے سیستان اور زاہدان کے علاقوں، افغانستان کے ہلمند اور نمروز کے علاقوں میں بولی جاتی ہے جبکہ ایک مختصر تعداد روسی ترکمانستان کے علاوہ مرو میں اب تک براہوئی بولتے ہیں براہوئی زبان جغرافیائی اعتبار سے ہندو، ایرانی اور ہندیورپی زبانوں کے درمیان صدیوں سے بولی جاتی ہے۔

اس زبان کا لسانی جغرافیہ کچھ اسطرح ہے کہ براہوئی زبان کے مغرب میں پشتو کا قندھاری لہجہ اور بلوچی کا رخشانی اور مغربی لہجہ مشرق میں بلوچی زبان کا مشرقی لہجہ، پشتو اور کچھ علاقوں میں سندھی لہجہ، شمال میں بلوچی کا رخشانی لہجہ اور جنوب میں بلوچی کا ساحلی اور کولائی لہجہ بولا جاتا ہے۔

انگریزوں کے دور میں تمام بلوچستان میں لسانی بنیادوں پر مردم شماری کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی چند سالوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن 1972ء اور اسکے بعد کے سالوں میں پاکستان میں مردم شماری تو ہوئی لیکن لسانی بنیادوں پر نہیں۔ جس سے یہ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ آجکل براہوئی بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ 1981ء کے مردم شماری میں براہوئی بولنے والوں کا تناسب کل آبادی کا 20.47 فیصد ہے۔

براہوئی کے ممتاز دانشور ڈاکٹر عبدالرحمان براہوئی اپنی تصنیف "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ" میں بر صغیر میں براہویوں کی تعداد سے متعلق لکھتے ہیں :۔

> "1901ء میں براہویوں کی تعداد تمام ہندوستان میں تین لاکھ کے قریب تھی۔ 1911ء میں بلوچستان میں انکی آبادی ایک لاکھ ستاسٹھ ہزار سات سو ستاسی تھی۔ 1931ء کی مردم شماری میں یہ تعداد بڑھ کر دو لاکھ چوبیس ہزار چار سو پندرہ ہوگئی۔ جبکہ دوسری زبانیں بولنے والوں کی تعداد حسب ذیل تھی :۔
>
> "بلوچی زبان بولنے والے تین لاکھ سات سو چھتیس، پشتو زبان بولنے والے دو لاکھ تینتیس ہزار آٹھ سو بیاسی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ براہوئی کی آبادی بلوچستان میں دوسرے نمبر پر تھی۔ 1961ء

کی مردم شماری ایسے وقت میں ہوئی جب ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ جھالاوان کے براہوئی قبائل پہاڑوں میں روپوش تھے۔ اس کے علاوہ مردم شماری سردیوں کے مہینے جنوری میں ہوئی۔ ان دنوں کئی براہوئی خاندان سردیوں سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ تاہم اس مردم شماری میں براہویوں کی تعداد تین لاکھ پینسٹھ ہزار سات سو بہتر دکھائی گئی ہے"۔(۱)

اس سے پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ 1972ء، 1981ء اور اس کے بعد 1998ء میں مردم شماری لسانی بنیادوں پر نہیں ہوئی جس سے براہوئیوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ ان اعداد و شمار کے علاوہ براہوئی بلوچستان کے علاوہ سندھ، جنوبی افغانستان، مشرقی ایران اور ترکمنستان میں بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔

براہوئی زبان تاریخی اعتبار سے مختلف ناموں سے موجود رہی ہے۔ یہ زبان کبھی براہوئی، کبھی بروہی اور کبھی کردی یا کردگالی کے نام سے بھی موسوم رہی ہے۔

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "براہوئی زبان و ادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، 1980ء، صفحہ 32۔

براہوئی زبان کے لہجے

جس طرح براہوئی زبان اپنی قدامت کے لحاظ سے ایک الگ تاریخ کی وارث ہے اسی طرح یہ زبان ایک سے زیادہ خوبصورت لہجوں کی امین بھی ہے۔ دنیا کی اور بہت سی زبانوں کی طرح براہوئی زبان بھی کئی لہجوں میں بولی جاتی ہے۔ لیکن ماہر لسانیات اور ادیب براہوئی کے دیگر ذیلی لہجوں کی بجائے براہوئی کو صرف تین لہجوں کی زبان قرار دیتے ہیں۔ یعنی (الف) ساراوانی لہجہ (ب) جھالاوانی لہجہ (ج) رخشانی یا چاغی لہجہ۔ براہوئی زبان کا لہجہ ساراوانی اپنے جغرافیائی حدود اربعہ کے حوالے سے ضلع کوئٹہ، ضلع خضدار، ضلع مستونگ، ضلع قلات، ضلع بولان اور ضلع کچھی میں اکثریت کے طور پر ملتا ہے۔ براہوئی زبان کے اس لہجے کو براہوئی ادب کا اعلیٰ، معیاری اور ادبی لہجہ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ براہوئی کے پہلے شاعر مولانا ملک داد قلاتی سے لیکر دورِ جدید کے براہوئی شعراء اور ادیبوں میں سے اکثر نے اس لہجے کو اپنایا ہے۔

دوسرا لہجہ جو جھالاوانی لہجہ کہلاتا ہے براہوئی زبان کا یہ لہجہ ضلع خضدار کے مقام انجیرہ سے لیکر ضلع آواران، ضلع لسبیلہ اور صوبہ سندھ کے دادو، حیدر آباد وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے۔

براہوئی زبان کا تیسرا لہجہ رخشانی یا چاغی لہجہ کہلاتا ہے۔ براہوئی زبان میں ساراوانی لہجہ کے بعد براہوئی ادب میں اس لہجے میں بہت سے ادبی شہ پارے تحریر کیئے گئے ہیں۔ یہ لہجہ ضلع چاغی، ضلع خاران، ضلع پنجگور اور افغانستان کے بلوچ علاقوں، ہلمند، نیمروز کے علاوہ ایران کے سیستان و بلوچستان میں بولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ترکمانستان کے علاقے مرو میں بھی چند خاندان جو اب تک براہوئی زبان کو محفوظ کیئے ہوئے ہیں ان کے باعث براہوئی زبان کا یہی رخشانی لہجہ ان علاقوں میں مستعمل ہے۔(۱)

براہوئی زبان کی ان تین بڑے لہجوں کی تفصیل اسطرح ہے :۔

ساراوانی لہجہ

براہوئی زبان کا یہ لہجہ بلوچستان کے علاقہ ساراوان کی وجہ سے ساراوانی کہلاتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ براہوئی کے اس لہجے کو معیاری سمجھا جاتا ہے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ذرائع لبلاغ سے وابستہ ادیبوں کی اکثریت کا تعلق اسی لہجے

۱۔ صابر، عبدالرزاق، "براہوئی لکھوڑ"، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، پاکستان، 1998ء صفحہ 21,22,23۔

سے ہے۔ علمی اور ادبی طور پر اگر اس لہجے میں لکھے گئے علمی، ادبی، سماجی اور تاریخی مواد کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی بھی حق بجانب ہوگا کہ وہ ساراوانی لہجہ کو براہوئی کا معیاری اور ادبی لہجہ قرار دے۔ براہوئی کا یہ لہجہ انتہائی برق رفتاری سے ترقی کی طرف گامزن دکھائی دیتا ہے۔ اس لہجے کی اہم خصوصیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالرزاق صابر لکھتے ہیں کہ :-

۱۔ اس لہجے میں نہ تو جھالاوانی لہجہ کی طرح ہر جگہ بات پر زور stress دکھائی دیتا ہے۔ اور نہ نوشکی یا چاغی لہجہ کی طرح (ھ)(h) کی آواز سے خالی ہے۔

۲۔ اس لہجے میں بلوچستان کے بڑے بڑے شہروں جیسے کوئٹہ، مستونگ اور قلات میں کچھ صرفی و نحوی تبدیلی آرہی ہے جیسے اس لہجے میں گزرے بیس سالوں میں فعل حال جاری میں مصدر کے بعد حالت سے پہلے آنے والے "ٹی" کو عموماً ادا نہیں کیا جاتا مثلاً کرنے مصدر سے کننگٹی اے کو "کنگے" اور پاننگٹی اے کو پانگے ادا کرتے ہیں۔

۳۔ اس لہجے میں منفی مصادر کا استعمال عام ہے مثلاً مارنا مصدر سے خلنگ کیلئے خلپنگ، ردنا مصدر سے ہوغنگ کیلئے ہوغپنگ اور ڈولنا مصدر سے شولنگ کیلئے شولپنگ استعمال ہوتا ہے۔(۱)

چونکہ براہوئی زبان کا یہ لہجہ وسطی بلوچستان میں بولا جاتا ہے۔ تاریخی طور پر وسطی بلوچستان کبھی ایران اور کبھی افغانستان کی عملداری میں رہا ہے اور خود ریاست قلات کے خوانین کے دربار کی زبان بھی فارسی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس لہجے پر فارسی کے اثرات زیادہ ہیں۔ اس لہجے میں زبان کی نرمی بہ نسبت جھالاوانی لہجے کے زیادہ ہے۔ جھالاوانی اور رخشانی لہجہ میں لفظ کی ادائیگی حلق پر زور دیگر ادا کی جاتی ہے۔

جیسے کچھ الفاظ جھالاوان اور چاغی یا رخشانی لہجہ میں "ہ" پر زور دے کر ادا کیئے جاتے ہیں وہ ساراوان میں نرمی کے ساتھ (الف) کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

اُردو	ساراوانی	جھالاوانی یار خشانی لہجہ
دِل	اُست	ہُست
بکری	ایٹ	ھیٹ
کونسا	ارا	ھرا

اس لہجے میں "ہ" کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

۱۔ صابر، عبدالرزاق، "براہوئی لکھوڑ"، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، پاکستان، 1998ء صفحہ 21,22۔

جھالاوانی لہجہ

براہوئی کا یہ لہجہ ضلع خضدار کے مقام انجیرہ سے شروع ہو کر ضلع ہائے آواران و لسبیلہ تک بولا جاتا ہے۔
جھالاوانی لہجہ اپنی جغرافیائی حدبندی "یعنی مغرب سے بلوچی زبان کا رخشانی لہجہ ، شمال مشرق میں سندھی زبان اور شمال میں براہوئی کا ساراوانی لہجہ اس لہجے کے ہمسایوں میں موجود ہیں۔ جھالاوانی لہجے نے اپنے مشرق میں سندھی زبان سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے اور اس کا سبب کئی وجوہات کے علاوہ جھالاوانی لوگوں کا موسم سرما میں سندھ کی طرف نقل مکانی بھی ہے۔

اس لہجے کی خصوصیات کو ڈاکٹر رزاق صابر اپنی کتاب "لکھوڑ" میں یوں بیان کرتے ہیں :۔

ا۔ براہوئی جھالاوانی لہجہ میں ہائیہ آواز z۔ ہ(h) کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔

۲۔ جھالاوانی لہجہ میں آوازوں پر دباؤ الفاظ کے پہلے حصے میں آتا ہے۔

۳۔ اس لہجے میں سندھی زبان کی آواز میں مثلاً ٹ۔ج۔ و۔گ بھی صاف طور پر ادا کیئے جاتے ہیں۔

۴۔ اس لہجے میں دو آوازیں یعنی د ر ۔ت ر اکھٹے استعمال نہیں ہوتے مثلاً درخت کو ڈرخت ، دُرست کو ڈرست ، تران (گفتگو یا تقریر) کو ٹران ، ورنگ (کھائی) کو ڈرنگ اور وروغ (جھوٹ) کو ڈروغ ادا کیا جاتا ہے "۔(ا)

اس لہجے میں بعض اوقات ضمیر متکلم Personal Pronoun (کنا) کو جملوں میں مختصر کر کے حرف (کہ)

کہا جاتا ہے جیسے :۔

دیگر لہجے	جھالاوانی لہجے	اُردو
اِلُم کنا ہِتانے	اِلُم (ایلو) کہ ہتانے	میرا بھائی گیا ہوا ہے
چوٹ کنا کشکانے	چوٹ کہ کشکانے یا کشگانے	میرا جوتا پھٹ گیا ہے
کاٹم کنا غل کیک	کاٹم کہ غل کیک	میرے سر میں درد ہو رہا ہے

اس لہجے میں بعض اوقات (ت) کی آواز (ٹ) میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے مثلاً :۔

ترخنگ	ٹرخنگ	پھٹ جانا

ا۔ صابر ، عبدالرزاق ، "براہوئی لکھوڑ" ، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ ، پاکستان ، 1998ء صفحہ 23 ,22۔

تمہ	ٹمہ	گرد
تران	ٹران	گفتگو ر تقریر

جھالاوانی لہجہ میں فعل کا ماضی شکیہ میں نفی کی علامت (ف) لفظ کے درمیان میں آنے کی بجائے ضمیر میں آ جاتا ہے مثلاً :۔

اوبفر وئے	اوبروف	وہ شاید نہ آیا ہو
او کنپر وئے	او کنوف	وہ شاید نہ کھائے
ہوہنپر وئے	او ہنوف	وہ نہ گیا ہوا ہو

جھالاوانی لہجہ میں ماضی مطلق جاری Past Continuous میں فعل کیساتھ (اٹ) کا سابقہ لگایا جاتا ہے مثلاً :۔

ا۔ پرغسہ ۔ پرغسہ اٹ　　　۲۔کنیسہ ۔کنیسہ اٹ

۳۔ اوغسہ ۔ اوغسہ اٹ (۱)

نوشکی یا رخشانی لہجہ

بلوچستان کے ضلع چاغی، خاران، پنجگور، آواران اور افغانستان کے صوبے ہلمند، نیمروز، ایران بلوچستان کے سیستان وبلوچستان، ترکمنستان کے علاقے مرو (مارے) میں براہوئی کے اس لہجے کو رخشانی یا نوشکی لہجہ کہا جاتا ہے۔ براہوئی کے اس لہجے پر باہر یا ہمسایہ زبانوں کے اثرات بہت کم ہیں اور سب سے شیرین لہجہ بھی کہلاتا ہے۔ براہوئی اولسی اور رزمیہ شاعری کا ایک خاصا حصہ اس لہجے میں ہے۔

اس لہجے کی خصوصیت درج ذیل ہے :۔

ا۔ اس لہجہ میں ہائیہ آواز aspirated voice بالکل ادا نہیں ہوتی۔

۲۔ اس لہجے کی معکوسی سی آوازیں retroflex voices (ٹ)، (ڈ)، (ڑ) کا استعمال کم ہوتا ہے مثلاً :۔

اُردو	باقی لہجے	نوشکی لہجہ
یہاں	واڑے	وارے یا داوئے

ا۔ صابر، عبدالرزاق، "براہوئی لکھوڑ"، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، پاکستان، 1998ء صفحہ 23, 24 ۔

وہاں	اوڑے	اورے یا اودے
اُدھر	ایڑے	ایرے یا ایدئے

اس لہجے میں لفظ کا آخری حصہ ساکن ہوتا ہے جبکہ دوسرے لہجوں میں خاص طور پر وہ لوگ جو براہوئی زبان کو عرصہ سے اچھی طرح سیکھ گئے ہوں وہ فعل کے آخری syllable کو ساکن کرنے کی بجائے متحرک کرنے کیلئے اس میں اضافی ک لگادیتے ہیں مثلاً :۔

اُردو	عام براہوئی لہجہ	نوشکی لہجہ
کھاتا ہے	کنیک	کنیئک
کہتا ہے	پائک	پائیئک
آتا ہے	بریک	بریئک
روتا ہے	اوغک	اوغیئک

نوشکی لہجے میں بعض اوقات فعل امر imperative کا حرف پہلا syllable کہا جاتا ہے جبکہ براہوئی کے دوسرے لہجوں میں ساکن ہوتے وقت آخری حصے میں (a) short a کہا جاتا ہے مثلاً :۔

اُردو	دوسرے لہجے	نوشکی لہجہ
دھونا	سلہ	سل
لاؤ	اَتہ	اَت
چڑھو	لگہ بو	لگ بو
کھینچو	چِکہ	چِک۔ (1)

نوشکی لہجے میں منفی مصدر negative infinitive کو عام استعمال میں لایا جاتا ہے جبکہ دوسرے لہجوں میں انکا استعمال اب موجودہ دور میں متروک ہورہا ہے مثلاً :۔

اُردو	دیگر لہجے	نوشکی لہجہ
نہ کرنا	ناکننگ	کپرنگ یا کپنگ

ا۔ صابر، عبدالرزاق، "براہوئی لکھوڑ"، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، پاکستان، 1998ء صفحہ 26 ,25۔

نہ آنا	نا بتنگ	بُفرنگ یا بُفنگ
نہ دینا	نا تِننگ	تَفِنگ یا تَفرنگ

براہوئی زبان کے اس لہجے میں حد سے زیادہ clustral consonant بنانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس لہجے کی زبر short a ہے۔اس لہجے میں بعض اوقات دو دو تین تین مصتمہ vowels اکھٹے ہوتے ہیں مثلاً :۔

اُردو	دیگر لہجے	نوشکی لہجہ
رات کو	ننکان Nanekan	ننکان Nankan
کماؤ	کٹبو Kattabo	کٹبو Katbo
رُک جاؤ	سلوا Salawa	سل وا Salwa (2)

المختصر براہوئی زبان بھی اپنے اردگرد دوسری زبانوں کی طرح ایک سے زیادہ یعنی تین بڑے لہجوں پر مشتمل زبان ہے۔ تاہم براہوئی زبان کے لہجوں کے درمیان اتنا زیادہ اور وسیع فرق موجود نہیں کہ ایک لہجے والے دوسرا لہجہ بولنے والوں کی بات اور مقصد کو نہ جان سکیں لیکن پھر بھی براہوئی زبان کی اِملا میں یکسانیت ،ادبی، معیاری زبان کی ترقی اور ارتقاء کیلئے ضروری ہے کہ براہوئی زبان کے ایک لہجے سے دوسرے لہجے میں علمی، ادبی اور معیاری حیثیت تسلیم کی جائے یا ضروری ہے کہ براہوئی زبان کا ایک لہجہ دوسرے لہجے کی علمی، ادبی اور معیاری حیثیت تسلیم کرے۔

ا۔ صابر، عبدالرزاق، "براہوئی لکھوڑ"، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، پاکستان، 1998ء صفحہ 27۔

براہوئی زبان کا رسم الخط

براہوئی زبان فارسی رسم الخط میں اُردو کے طرز پر لکھی جاتی ہے لیکن ۱۱۷۳ ہجری مطابق 1760ء میں تصنیف شدہ براہوئی زبان کی پہلی شاعری کی کتاب کے مصنف مولانا ملک داد قلاتی نے براہوئی زبان کو عربی رسم الخط میں پشتو طرز پر لکھنا شروع کیا۔ بعض ماہرین کا خیال ہے ملک داد کی شاعری کی کتاب "تحفتہ العجائب" عربی نہیں بلکہ پشتو رسم الخط کی طرز پر براہوئی میں لکھی گئی ہے۔ چونکہ خود مولانا کا تعلق پشتونوں کے قبیلہ غرشین سے تھا لہٰذا انہوں نے جب براہوئی میں شاعری شروع کی تو پشتو طرزِ تحریر کو اپنایا۔ بعد ازاں دیگر تمام علمائے کرام جنہوں نے براہوئی میں تصنیف و تالیف کیا انہوں نے اس خط کو اپنایا۔ فی زمانہ بھی اگر اس طرز کو عربی رسم الخط مان لیا جائے تب بھی مولانا عبدالعزیز قلندررانی (مستونگی)، مولانا محمد یعقوب شرودی، مولانا اختر محمد مینگل، مولانا عبدالکریم لہڑی (سعودی عرب) وغیرہ نے آج بھی اُسی عربی رسم الخط کو اپنایا ہوا ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ براہوئی زبان نے کب تحریری شکل اختیار کی اور پہلی دفعہ کس رسم الخط میں لکھی جاتی تھی ، تاہم ماہرینِ لسانیات کی براہوئی زبان کے رسم الخط کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔

قدیم براہوئی رسم الخط کے بارے میں ممتاز دانشور میر گل خان نصیر رائے دیتے ہیں کہ :۔

بجولا کدفیزس جو تاریخ میں کدفیزس اول کے نام سے مشہور ہے کوشانی قبیلہ کا پہلا بادشاہ گزرا ہے۔ اس بادشاہ کے بہت سے کتبے اور مسکوکات ماہرین آثارِ قدیمہ نے دریافت کر لیئے ہیں۔ ان مسکوکات پر خُروشتی حروف میں جو زبان کندہ ہے اسے ایک معمولی تغیر حرفی کے بعد ہم قدیم براہوئی زبان کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ایک سکہ پر ایک طرف بادشاہ کو بیٹھے دکھایا گیا ہے اور دوسری طرف "مہشوارا" (پہاڑوں کا مالک) کی مورت کندہ ہے۔ بادشاہ کی مورت کے اردگرد خُروشتی حروف میں یہ الفاظ کندہ ہیں :۔

"مہاراجاسا۔ راجاداجاسا۔ دواپوتراسا۔ کاجولا کدفیزا"۔ میر گل خان نصیر کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ ایک معمولی تغیر حرفی کے بعد براہوئی زبان کے ہو سکتے ہیں۔ کدفیزس کا دور جو کہ 78 تا 40 سال قبل مسیح تک ہے تقریباً دو ہزار سال کی طویل مدت تک ایک زبان میں تبدیلیاں ناگزیر ہوئی ہیں۔ مثلاً اس جملے کی لفظ "سا" کو براہوئی زبان کے "سے" یعنی (ہے) اور "دا" کو براہوئی زبان کے "تا" یعنی (کا) جو قریب المفرج ہونے کی وجہ سے عموماً آپس میں بدل جاتے ہیں، تبدیل رائے کے بعد اس جملے کی

صورت براہوئی زبان میں یوں ہوگی (مہاراجاسے۔ راجا تاراجاسے۔ دواپوتراسے۔ کاجولاکدفیزاسے) اب اس جملے کو کسی بھی براہوئی کے سامنے رکھ لیا جائے تو سوائے دواپوترا کے اس کا اردو ترجمہ اسطرح کریگا:۔

"مہاراجاہے۔ راجاؤں کا راجاہے۔ دواپوتراہے۔ کاجولاکدفیزاہے"۔ یعنی یہ ہے کہ یہ مورت کجولا کدفیزا کی ہے جو مہاراجا۔ راجاؤں کاراجااور دواپوترایعنی آسمانوں کا بیٹاہے۔

ان تاریخی شواہد کی روشنی میں ہم بلاخوف وتردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج سے دوہزار سال قبل سندھ و جہلم کی وادی میں جو زبان "بھاشا" کے نام سے مشہور تھی وہ یقیناً براہوئی تھی۔ کجولا کدفیز س اول کنشکا اور اس خاندان کے دوسرے بادشاہوں کے دور میں سرزمین گندھارا جس میں توران (قلات) کا بھی بیشتر حصہ شامل تھا یہاں بھی یہ زبان رائج تھی۔ (۱)

براہوئی رسم الخط کے متعلق نامور محقق اور ادیب ڈاکٹر عبدالرحمان براہوئی اپنی کتاب "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ :۔

> "براہوئی ازمنہ قدیم میں ہیروغلفی طرز پر لکھی جاتی تھی تاہم ایک رائے یہ بھی ہے کہ موہنجوداڑو سے برآمد شدہ مہروں کا رسم الخط براہوئی کا قدیم رسم الخط ہے۔ کالڈویل کے خیال میں دراوڑی زبانوں کے رسم الخط اشوک کے کتبوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ آج سے دوہزار سال قبل زبانوں کے رسم الخط خروشتی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اور اسلام کے بعد عربی اور فارسی رسم الخط رائج ہوئے ہیں"(۲)

براہوئی زبان کے چند قدیم مسودات "خدمتِ دین" جو 709ہجری میں لکھی گئی 810ہجری کی تصنیف "مجمول الاسم" اور 980ہجری کی تالیف "عملیات گہربار" میں براہوئی زبان کے لئے عربی اور فارسی رسم الخط کو اپنایا گیا ہے۔

1877ء میں کراچی ہائی اسکول کے فارسی کے استاد مولوی اللہ بخش نے اپنی تصنیف Hand Book of Brahui Language میں براہوئی زبان کو سندھی رسم الخط سے لکھا ہے۔ جبکہ انگریز محققین اور عیسائی مبلغین نے براہوئی زبان کے لیے رومن رسم الخط کو اپنایا ہے۔ براہوئی کے لئے موجودہ فارسی نما اُردو رسم الخط قیامِ پاکستان کے بعد اپنایا گیا۔ اس کے

ا۔ نصیر، میر گل خان، "کوچ وبلوچ"، دوسرا ایڈیشن، قلات پبلشرز کوئٹہ، 1983ء، صفحہ 42۔

ا۔ براہوئی، عبدالرحمان، ڈاکٹر، "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، 1980ء، صفحہ 55۔

علاوہ ماہنامہ "بلوچی" کراچی وہ پہلا رسالہ ہے جس میں فارسی نما اُردو رسم الخط سے براہوئی کو لکھا گیا۔اس کے علاوہ براہوئی گرائمر اور بول چال پر مبنی ایک کتاب جس کی دستیاب کاپی پر نام مصنف اور اشاعت کا سال درج نہیں ہے۔ یہ کتاب بھی 1940ء کی تصنیف شدہ ہے۔اس میں بھی فارسی رسم الخط کو براہوئی کے لئے اپنایا گیا ہے۔(۱)

یکم اپریل 1989ء اور 27 مئی 1989ء کو براہوئی زبان کے معروف دانشوروں اور ادیبوں پر مشتمل براہوئی صورت خطی (لکھوڑ) کمیٹی نے براہوئی کے لئے فارسی نما اُردو رسم الخط کی منظوری دے دی۔اس وقت براہوئی فارسی نما رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تاہم اس میں اِملا کی طرز کے چند مسائل ہیں جواب بھی حل طلب مسائل میں شمار ہوتے ہیں۔ان مسائل پر اس کمیٹی کے کئی اجلاس منعقد ہو چکے ہیں۔کمیٹی کے ان اجلاسوں میں براہوئی زبان کے لسانی مسائل پر سیر حاصل مباحث ہوئے مثلاً براہوئی میں حمزہ (ء) کا صحیح استعمال اور الف /a/ اور رہ ر یعنی (h) کے علاوہ /e/ اور رےر (e) وغیرہ کے مسائل براہوئی صورت خطی کمیٹی نے براہوئی حروف تہجی میں فارسی ،اُردو، سندھی، سرائیکی، پشتو اور پنجابی وغیرہ کے طرز پر مستعار آوازوں کے لئے حروف کو بھی اپنی ابجد میں شامل کر لیا ہے۔ نیز ہندی کے دو چشمی حروف مثلاً بھ ۔ پھ ۔ ٹھ اور کھ وغیرہ بھی جدید براہوئی رسم الخط میں مستعمل ہیں۔

براہوئی رسم الخط کی انفرادیت دیگر پاکستانی زبانوں سے درج ذیل طریقے سے نمایاں ہے :۔

۱۔ براہوئی اور بلوچی دونوں زبانوں میں الفاظ کے آخری مصوتہ کو حمزہ کے اُوپر زبر (ءَ) نیچے زیر (ءِ) اور اُوپر پیش (ءُ) لگا کر الگ سے حروف تشکیل دیئے گئے ہیں جبکہ دیگر زبانوں میں ایسا نہیں ہے۔

۲۔ براہوئی زبان کی مخصوص آواز (ڵ) کے لئے ل (لام) کے اُوپر تین نقطے رکھ کر نیا حرف (ڵ) وضع کیا گیا ہے جو دیگر ہمسایہ زبانوں میں نہیں ہے۔(۲)

۱۔صابر، عبدالرزاق، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، 1994ء، صفحہ 56۔

۲۔صابر، عبدالرزاق، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، 1994ء، صفحہ 65۔

باب دوئم : براہوئی ادب

۱۔ براہوئی لوک ادب

۲۔ براہوئی کلاسیکی ادب

۳۔ براہوئی جدید ادب

براہوئی لوک ادب

کسی قوم کے اندازِ فکر و عمل، ذہنی ارتقاء اور تہذیب و تمدن کا اندازہ اُسکے ادب کے ذریعے ہی لگایا جاتا ہے۔ ادب زندگی کے اظہار کا نام ہے۔ ادب لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ و فکر بھی شامل ہوتے ہیں۔ احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہا جاتا ہے۔ ایک ایسی تحریر کو ادب کا نام دیا جاسکتا ہے کہ پڑھنے والا اس تحریر سے لطف اندوز ہو اور اسکے بولنے سے مسرت و خوشی حاصل کرے (ادب زندگی میں کسی چیز کے بدل کا نام نہیں ہے۔ اگر اسکی حیثیت کسی اور چیز کے بدل کی ہے تو پھر وہ ادب نہیں ہے)۔ ادب ایک ایسا اظہار ہے جو زندگی کا شعور اور ادراک حاصل کرنے کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کے تخلیقی تجربے کو اُبھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس تجربے کا ادراک کر لیتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہی زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ یہ ادب کا خاص منصب ہے۔ ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ادب کی سطح پر ہم اپنی ذات سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ ادب عملِ ادراک کی غیر معمولی قوت کے ذریعے ہماری عام ہستی کو بیدار کر کے شعور کی سطح پر لے آتا ہے۔

ادب زندگی سے معنے تلاش کرنے کا نام ہے اور اسی لئے ادب زندگی کے شعور کا نام ہے۔ اسی شعور کے ذریعے ہم بدلتے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہتے جو اسوقت ہیں اور اسی سے ہماری قوتِ عمل بیدار ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے جن سے ہمیں کبھی واسطہ نہیں پڑا، ادب کے ذریعے ہمارے تجربے بن جاتے ہیں اور ہمیں اور ہمارے اندازِ فکر کو بدل دیتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے ممتاز ادیب و دانشور اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :۔

> ''ادب کا کام تو زندگی میں معنے تلاش کرنا ہے اور اس کا رشتہ ماضی سے قائم کر کے مستقبل سے جوڑ دیتا ہے۔ ادب کا حوالہ تو زندگی ہے اور اُسے ہی آگے بڑھاتا ہے۔ ادب تو انسانی تجربہ کے مکمل علم و آگاہی کا نام ہے اور علم و آگاہی وہ غیر معمولی مرتب و منظم صلاحیت ہے جسکی اظہار کی صلاحیت صرف باشعور و دردمند انسان کے پاس ہے۔ وہ انسان جو نہ صرف اسکے اظہار پر قدرت رکھتا ہے بلکہ جس کا اظہار سچا بھی ہے اور حسین

بھی، مکمل بھی ہے اور موثر و مثبت بھی۔ اسی لئے ادب تنقیدِ حیات ہے اور زندگی کے گہرے پانیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا نام ہے"۔(۱)

ادب ہی کے ذریعے ہم اخلاقی قدروں سے متعارف ہوتے ہیں۔ اسکے مطالعے سے اُس قوم کے اسلاف کے اندازِ بیان اور خیالات سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ یہی ادب لوگوں کی اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ براہوئی کے ادبی شہ پارے اہنگ پہاڑوں کے دامن میں بود وباش رکھنے والے براہوئی قبائل کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ وہاں تک ہماری رسائی گو ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔(۲)

عام قاعدے کے مطابق لوک ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی :۔

۱۔ منظوم لوک ادب ۲۔ منثور لوک ادب

اول الذکر میں عشقیہ، رزمیہ، مزاحیہ منظومات، مختلف رسوم کے گیت، لوریاں اور منظوم پہیلیاں وغیرہ شامل ہیں۔ اور ثانی الذکر لوک ادب میں لوک کہانیاں، پہیلیاں، معلمعات، ضرب الامثال اور لطائف کو شمار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے دیگر زبانوں کے لوک ادب کی طرح براہوئی لوک ادب بھی منظوم لوک ادب اور منثور لوک ادب پر مشتمل ہے۔

(الف) منظوم براہوئی لوک ادب

زمین پر بسنے والے انسان اور قدیم تہذیبوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان دورِ قدیم سے ہی اپنی زندگی کے لمحات، دن و ماہ و سال کو خوشگوار اور پُر لطف بنانے کیلئے اظہار کے لطیف طریقے اختیار کئے ہوئے ہے اور ان لمحات کے اظہار کے لئے اس نے کئی رنگ، ڈھنگ اور پیرائے اپنائے ہیں۔ یعنی وہ اپنے غم، خوشی، رنج والم کو اپنی گیتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ اظہار انسان کی فطرت ہے۔ انسان نے جب سے اظہار کے طریقے اور وسیلے دریافت کیئے۔ انہی طریقوں اور وسیلوں کو اپنا کر اس نے اپنی کھتارسس کی۔ جس سے سماجی اور معاشرتی اقدار متاثر ہوئے۔ نئے معاشرتی اقدار وجود میں آئیں۔ جس سے زندگی کی تنظیم ہوئی۔ دنیا میں تیز رفتار ترقی اور ٹیکنالوجی کے ایجادات اور علم و آگہی نے نہ صرف معاشرتی اقدار کو متاثر کیا بلکہ اس کے معنے و مفہوم کے طور طریقوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔

۱۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، "ادب، کلچر اور مسائل"، پاکستان نیشنل اکیڈمی کراچی، 1981ء۔

۲۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1982ء، صفحہ 69۔

اظہار کے سلیقے میں شاعری کی حیثیت زیادہ قدیم، مسلم، اہم اور مستند تسلیم کیا گیا ہے۔ انسان نے اظہار کے اس وسیلے کو اپنا کر اپنے اپنے ادوار کی انفرادی اور اجتماعی احساسات، کیفیتوں اور جذبات اور رویوں کو خوبصورت لفظوں کے پیرائے میں بیان کیا۔ یہ کام شاعر کا ہوتا ہے کسی معاشرے میں شاعر بہت ہی حساس ہوتا ہے اور وہ ان لمحات وکیفیات اور جذبات کو محسوس کر کے آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کرتا ہے۔ شاعر کی زبان شاعری ہوتی ہے۔ دنیا میں مفکرین نے شاعری کیلئے مختلف طریقے اپنائے۔ یونان کے ارسطو نے شاعری کے بارے میں کہا:۔

"شاعری ہمہ گیر، آفاقی اور کائناتی صداقتوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہ زماں ومکاں کی اسیر نہیں ہوتی۔ شاعری آفاقی اور کائناتی صداقتوں کی تلاش کرتی ہے"۔(۱)

ورڈزورتھ کا خیال ہے کہ:۔

"شاعر لوگوں کے احساس کی تنظیم کرتا ہے۔ انہیں نئے احساسات سے رُوشناس کراتا ہے۔ احساس کو شائستگی، پاکیزگی اور استقلال عطا کرتا ہے احساسات کو فطرت سے ہم آہنگ کرتا ہے"۔(۲)

مختصر یہ کہ یونانی شاعر کو تخلیقار، عبرانی پیغمبر مانتے تھے۔ عرب بھی شاعر کو عزت واحترام دیتے تھے۔ براہوئی ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انکے ادب میں شاعری کا کام ڈوم کیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شعراء بھی خود یہی لوگ تھے جو گا گا کر لوگوں کو اشعار سناتے تھے۔ ڈوم ہی شعراء کا کلام ازبر کر کے اور گا گا کر لوگوں کو خوشی اور مسرت بہم پہنچاتے تھے براہوئی بلوچ سماج میں ڈوم کی حیثیت کمتر ہوتی ہے۔ شاعری میں اجتماعی اظہار کا بنیادی ذریعہ لوک گیت ہیں جو کہ تمام اقوام اور زبانوں کے ادب کے بنیادی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"دنیا کی تمام قوموں اور زبانوں میں اس کا رواج رہا ہے۔ لوک گیتوں کی تاریخ انسان کی ابتدائی تہذیب کی تاریخ ہے۔ چونکہ اپنی خوشی اور غم کا اظہار انسان کی فطرت ہے۔ اس لیئے انہی فطری تقاضوں نے لوک گیتوں کو جنم دیا۔ یہ گیت ہر قوم کا تہذیبی ورثہ ہوتے ہیں اور انہی سے انکے تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور مذہبی عقائد کا پتہ چلتا ہے"(۳)

ا۔ رضوی، سجاد باقر، ڈاکٹر، "مغرب کے تنقیدی اصول"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (طبع دوئم)، 1994ء، صفحہ

۲۔ رضوی، سجاد باقر، ڈاکٹر، "مغرب کے تنقیدی اصول"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (طبع دوئم)، 1994ء، صفحہ 203۔

۳۔ بلوچ، عبدالصبور، (مضمون سپت) "ماہِ نو"، ادارہ مطبوعات پاکستان لاہور، 1998ء، صفحہ 25۔

یہ کہا جائے کہ قدیم براہوئی شعری ادب کے ماخذ بھی یہی لوک گیت ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ براہوئی زبان میں بھی لوک گیتوں سے اظہار کے مختلف پیرائے سے کام لیا گیا ہے۔ ان لوک گیتوں میں فنی بندشوں اور پابندیوں کا خاص خیال تو نہیں رکھا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ لوک گیت اپنے مخصوص طرزِ آہنگ میں انتہائی سادہ اور سلیس ہیں۔

یہ لوک گیت شعریت اور موسیقیت سے بھرپور ہیں۔ شعریت اور موسیقیت کے امتزاج سے یہ گیت انتہائی رواں اور پُر لطف ہوتے ہیں۔ براہوئی سماج میں رواج پانے والے لوک گیتوں کی اصناف میں عشقیہ لوک گیتوں کے علاوہ مختلف رسموں کے مواقع پر گائے جانے والے لوک گیت بھی ہوتے ہیں۔ اُن میں سے چند کی تفصیل یوں ہے :۔

شادی بیاہ، ماتم، ڈکال، زلزلے، قدرتی آفات ہوں یا انسانی رنج و غم، رشتوں کے بندھن ہوں یا معاشرتی ڈھانچوں اور روایات کا پرچار، لوک گیت ہمارے مزاج کو بنانے والے بہت ہی مضبوط ذرائع ہیں۔

براہوئی لوک شاعری میں عشقیہ منظومات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ براہوئی شاعر اپنے محبوب سے جب بھی اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اسے مختلف ناموں سے یاد کرتا ہے۔ مثلاً زیبا، نازنا، ماہ لنج، سومری، جانی جیسے القابات دیکر شاعر اپنی محبت کے گیت گاتا ہے۔ براہوئی کے چند لوک گیتوں کے اصناف درج ذیل ہیں۔

ا۔ بر نازنا

براہوئی عشقیہ لوک گیتوں میں بر نازنا لوک شاعری میں ایک صنف کی حیثیت رکھتا ہے۔ بر نازنا چھوٹی بحروں میں ہے جو بہت ہی مشہور لوک گیت ہے۔ ہر دور، ہر زمانے میں اس کے اشعار میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ براہوئی ادب میں لوک گیتوں کا ایک منفرد مقام ہوتا ہے۔ چرواہا جب مویشیوں کو لیکر پہاڑوں کے دامن میں چلا جاتا ہے تو وہ ایسے پُر کیف وقت میں دل بہلانے کیلئے بر نازنا گیت کے اشعار گاتا ہے، اسی طرح کسان بھی ہل چلاتے یا کھیتوں میں کام کرنے کے دوران بر نازنا کے اشعار گا گا کر ایک نئے عزم کا اظہار کرتا ہے۔ اسکے علاوہ جب موسم سرما میں سندھ اور کچھی جانے کیلئے کارواں بولان سے گزرتے ہیں تو پوری وادی میں بر نازنا کی مسحور کُن آواز گونج اٹھتی ہے۔ جس سے پوری وادی میں ایک رومانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور پورے کوہ و دمن حجر و شجر جھوم جاتے ہیں۔(۱)

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "براہوئی زبان و ادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1980ء، صفحہ 64,65۔

برنازنا کے چند اشعار بطور مثال پیش کیئے جاتے ہیں :۔

”برنازنا ۔ برنازنا

برنازنا ۔ برنازنا

سیل ئے کرین ناساز نا

اُستے دریئکس باز نا

برنازنا ۔ برنازنا

توار نا مٹک اُٹ نازنا

کونجاک ہِنار بال ئی

پٹاٹ خناٹ نے شال ئی

خواجہ کنا نی اُس خُدا

کپیس کنے دوست آن جِتا

قُربان مریو نا گشت تا

پھُل اُس اریس نی بہشت نا

دِیرے وہوکا واہ تا

قادر کمک نا ساہ نا“(۱)

ترجمہ :۔ آجا میری دِلرُبا نازنین۔ تمہاری محفل اور مجلس تو بہت ہی رنگین ہوتی ہیں۔ تمہاری آواز اتنی مسحور کُن، میٹھی وشیرین ہے، جب تم بولتی ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ تمام ساز بج رہے ہوں۔ میں قُربان جاؤں تیری ہرنی جیسی چال کے، تم ایک پھُول ہو جنت کے باغ کے، نہروں میں رواں پانی کی طرح، اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔

۲۔ ماہ لنج

براہوئی شاعر کی محبوبہ اتنی حسین ہے کہ چاند کا حُسن بھی اُسکے سامنے ماند پڑ جاتا ہے اور چاند اپنے حُسن کی کم

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، ”گواڑخ“، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1969ء، صفحہ 14۔

مائیگی پر شرمندہ و شرمسار ہو جاتا ہے۔اسی لیئے اس غم میں چاند گھل کر گھٹتا جاتا ہے اور آخر گم ہو جاتا ہے۔لیکن دوسری بار اس خیال کے ساتھ طلوع ہو جاتا ہے کہ شاید اس بار میرے حُسن میں نکھار آجائے لیکن چودھویں رات کو چاند اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اپنے ستاروں کی جھرمٹ میں رہنے کے باوجود براہوئی شاعر کی محبوبہ کے حُسن کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔براہوئی شاعر اپنی محبوبہ کو ماہ لنج کہتا ہے۔ ماہ لُنج کے معنے ہیں اپنے حُسن ورعنائی کی وجہ سے مہتاب کو شرمانے والی۔براہوئی لوک گیتوں میں ماہ لنج بھی ایک اہم اور خوبصورت گیت ہے۔ماہ لنج کے اشعار سے کچھ کا انتخاب پیش ہے :۔

ولر کپوت نا کنا ماہ لنج

ساڑے الوک نا کنا ماہ لنج

کانہ بریتہ کنا ماہ لنج

نوکر نا مرینہ کنا ماہ لنج

چرینگو گلی تے کنا ماہ لنج

یات کیو ولی تے کنا ماہ لنج

گودی گدان نا کنا ماہ لنج

لیلی اُس اوانا کنا ماہ لنج "(۱)

ترجمہ :۔ میری ماہ لنج کبوتروں کا غول کس قدر خوبصورت ہے اور اے میرے ماہ لنج سوکن بُری چیز ہے۔میں ہمیشہ اپنے ماہ لنج کے گھر کے طواف کرتا رہتا ہوں۔اسلئے کہ میں اسکے بکھرے زُلفوں کے ہر تار کا اسیر بن گیا ہوں۔گلی کوچوں میں مجنوں بنا پھرتا ہوں۔تم میرے گھر کی زینت ہو میری ماہ لنج اور تم جنت کا پھول ہو اے میرے ماہ لنج۔

۳۔ کیلوڑا

کیلوڑا بھی ایک خوبصورت براہوئی لوک گیت ہے۔اس لوک گیت میں عاشق اپنے محبوب کی ہر ہر ادا پر قُربان ہونے،اُسکے ناز نخروں پر فدا ہونے کا عہد وپیمان کرتا ہے۔اس لوک گیت میں عاشق اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قُربانی دینے کے لئے بھی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہے۔کیلوڑا لوک گیت کے چند بول یوں ہیں :۔

۱۔براہوئی، عبدالرحمٰن،ڈاکٹر،''گواڑخ''،براہوئی اکیڈمی کوئٹہ،1969ء، صفحہ 45,46۔

Uni... Balochi...

"بر کنا کیلو جان ، کیلو جان کیوہ نے
دشمن تا نیامان پھُل تیکن ای دیوہ نے
برکنا کیلو جان کیلو جانب کیوہ نے
خلپہ کنے ظالم نی ڈھنگا دھکاتے
قیامت آن خُلہ نی ایتے کنا حق آتے
بر کنا کیلُو جان کیلُو جان کیوہ نے
خنک نا ڈلگو ، ڈگی آن لڑزرہ
پنچ ہندغ نا کچ آ زلفاک نا کڑزرہ
بر کنا کپلُو جان کپلُو جان کیوہ نے
مستنگ نا شیف ٹی دیری ءُ گوءُ سے
نے اللہ حیات کے سال ہٹے ٹوءُ سے
بر کنا کیلُو جان کیلُو جان کیوہ نے(ا)

ترجمہ :۔ آجا میرے دِل کے کھلونے اگر تُو نہ آیا تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان سے بھی نکالنے کیلئے آؤنگا۔ اے میرے ظالم محبوب مجھ کو جدائیوں کے عذاب میں مُبتلا مت کرو اور قیامت سے ڈرو۔ اگر تم مجھے ترساؤ گے تو اللہ قیامت کے دن تم سے میرا حق ضرور لے گا۔ مستونگ کے کچھ دُور آگے ایک کنواں ہے۔ میرے محبوب تم سلامت رہو۔ اگر تمہارے جُدا ہو جانے کو ایک سال بھی گزر جائے تو یہ سال بھی کل ختم ہو گا اور میں انتظار کرونگا۔

۴۔ لیلی مور

براہوئی لوک گیتوں میں ایک اور مشہور گیت لیلی مور کا ہے۔ اس گیت میں عاشق اپنے محبوب کی جُدائی پر ہجر و وصل کا اظہار کرتا ہے۔ گیت میں محبوب کا قافلہ سندھ میں سردیوں کا موسم گزارنے کیلئے جارہا ہے۔ یہ کیفیت عاشق کے لیئے بہت ہی تکلیف دہ ہے کیونکہ گرہن کے وقت سفر کو بہت ہی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ عاشق کو اپنے محبوب کی جُدائی کا بہت ہی غم ہے جسکا اظہار اس گیت میں ہوتا ہے۔

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن "گواڑخ" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1969ء صفحہ 45۔

بر کنا لیلی مور لیلی مور کیوہ نے
بر کنا لیلی مور لیلی مور کیوہ نے
عالم نا ہپے نے تؤبے ءَ ماہ گیرا
جِتا کپ نئے ملخموت ساہ گیرا

براھوئی لوک گیتوں میں لیلی مور کا گیت بہت طویل ہے۔ یہاں اس مشہور گیت کے چند بول کو جگہ دی جاتی ہے :۔

بر کنا لیلی مور نوکر نا جندنا
جِتائی تمانے موسم اے سندھ نا
نظر کنا تمانے ٹلی ءَ طوقا نا
مالے تینا لیلام کیوہ بریوہ شوقا نا
بر کنا لیلی مور رعدٹ نا زڑیوہ
اللہ غا نی باور کہ سندھو ءَ وڑیوہ
دُو ہٹین دُو کہ ، دُو بس پلو نا
سال نا زہیری ءَ انت کیک چلو نا
دَر کنا چلوے نیتو مرے نشانی
دِلبر تو ملتخو کنا شومنگا پیشانی
عالم نا ہپے نے مون کرے مون شیفی
نا ہِیتاک کنے پا دلبرُ کیوہ بے ہوشی
عالم نا ہمپنے وا مَش آن اے پارے
لیلی نا بنگ نا نے تون دے پارے
گُل گُلاب پھُل سے پھُل آتا پھلائے
لیلی کہ ہِنانے کُمک تہ اللہ ئے (۱)

ا۔ براھوئی، عبدالرحمن، ڈاکٹر، ''گواڑخ''، براھوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1969ء، صفحہ 52۔

ترجمہ :۔ اے میرے محبوب آجا۔ میں تمہارا خادم ہوں۔ لگتا ہے کہ یہ دِن جُدائی اور عذاب کے دن ہیں کیونکہ تمہارا قافلہ سردیوں کے دِن گزارنے سندھ جانے کو تیار ہے۔ جب تم سندھ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی میرا نظر تمہارے موتی بھرا سونے کے طوق پر پڑا۔ کچھ بھی ہو میں تمہارے ملنے کیلئے ضرور تمہارے پاس آؤنگا۔ میرے محبوب تمہارے سندھ چلے جانے کا مجھے بہت دُکھ ہوگا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ میں ضرور تمہارا دیدار کرنے سندھ آؤنگا۔ تم تو چلے گئے لیکن مجھے جُدائیوں کے عذاب میں مُبتلا کر دیا۔ گلاب کا پھول پھولوں میں سب سے حسین ہے۔ میرا محبوب مجھ سے جُدا ہو گیا ہے، اے پروردگار تم اُسکے حامی و ناصر ہو۔

۵۔ لال نا دانہ

براہوئی لوک گیتوں میں ایک مشہور و مقبول لوک گیت لال نادانہ بھی ہے۔ یہ گیت موسم بہار میں بہار کی آمد کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ اس گیت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

"لال نا دانہ ۔ لال نا دانہ
سنگت اُن کانہ ۔ لال نا دانہ
ہیت نا ہِنو ۔ لال نا دانہ
مُلک آ کنا خیتو ۔ لال نا دانہ
موسم ہمَنِن ءِ ۔ لال نا دانہ
پھُل آن گچین ءِ ۔ لال نا دانہ
دِیر ءِ وکن نا ۔ لال نا دانہ
مُر ءِ وطن نا ۔ لال نا دانہ
اللہ کے بیماری ۔ لال نا دانہ
مِنت کیو زاری ۔ لال نا دانہ
بول خے نا چڑاک ۔ لال نا دانہ
زُلفاک نا ھُنڈی ۔ لال نا دانہ(۱)

ا۔ مینگل، افضل، "شوشنگ"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992، صفحہ 38,39۔

ترجمہ :۔ اے گوہرِ نایاب، تم میرے محبوب ہو۔ میرے محبوب وطن میں بہار آئی ہے چار سو لہلہاتے کھیت حد نظر تک دکھائی دے رہے ہیں۔ اس موسم میں جب تم میرے پاس ہوتے ہو تمام تر رعنائی اور پھولوں میں دلکشی تمہارے لیئے ہوتے ہیں۔ موسمِ بہار کی رنگوں، شفق اور رعنائی نے تمہارے زُلفوں کو بول نے کی جڑی بوٹیوں کی طرح گُنگریالے بنالیا ہے۔

۶۔ لیلڑی آلا :۔

براہوئی لوک گیتوں میں سے ایک اور خوبصورت لوک گیت لیلڑی آلا ہے :

پٹ اُٹ پٹیو نے لیلڑی آ لا
شرط اُٹ کٹیو نے لیلڑی آ لا
خوکم نا تیلی لیلڑی آ لا
پچاک نا نیلی لیلڑی آ لا
سیبی و ہرنائی لیلڑی آ لا
دوست نا درنائی لیلڑی آ لا
نمّٹ کہ دیو نے لیلڑی آ لا
خشکیا کیو نے لیلڑی آ لا "(۱)

ترجمہ :۔ میرے محبوب، میرے جانم میں نے تمہیں صحراؤں میں تلاش کیا ہے۔ تمہیں تمہارے لوگوں نے کسوٹی پر انعام میں رکھا۔ جسمیں میں کامیاب ہوا ہوں اور تمہیں شرط پر رکھے ہوئے انعام میں، میں جیت گیا ہوں۔ اب میں تمہارے پاس اس لیئے آیا ہوں کہ تمہیں اپنے گھر لے جاکر زندگی بھر کیلئے اپنا سکوں۔ یہاں کوہستان میں پت جھڑ کا موسم ہے لیکن کچھی وڈھاڈر میں بہار کی آمد آمد ہے۔ ہر طرف چراگاہیں سرسبز و شاداب ہیں۔ آیئے گلے ملیں یہ گلے ملنے کے دن ہیں۔

یہ لوک گیت جو براہوئی میں لیلڑی آلا ہے۔ خوشی کے موقعوں پر عورتیں یا لڑکیاں مل بیٹھ کر گاتی ہیں۔

لیلڑی آلا دہ یہ لوک گیت ہے جو شادی بیاہ کے موقع پر عموماً لڑکے والوں کی طرف سے گایا جاتا ہے۔ جس آدمی کی شادی ہو رہی ہو اس لوک گیت میں اُسے باربار موضوع بنا کر اور نیئے نیئے نام دے کر اس کی شرافت، خوبصورتی اور دوسری خوبیوں کا ذکر کیا جاتا

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، '' گواڑخ'' براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1969ء، صفحہ 48۔

ہے۔براہوئی میں لیلڑی آلا کی بہت ساری قسمیں ہیں مثلاً لیلڑی آلا، لیلڑو، لاڈی لڈے، لڑے لاڈو، لیلڑے لاڈو، لڑے وغیرہ۔ یہ تمام اقسام اسی ایک لوک گیت کی ہیں جو شادی بیاہ یا دوسری خوشی کے موقعوں پر خاص طور پر گائے جاتے ہیں۔ان لوک گیتوں کی چند مثالیں یہاں دی جاتی ہیں جو مختلف مواقع پر مختلف رسموں کے گیت ہوتے ہیں۔

ا۔ ہالو

ہلو ہالو براہوئی کا مقبول لوک گیت ہے۔یہ گیت عموماً شادی بیاہ کے موقعوں پر گایا جاتا ہے۔اس گیت میں خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔

"ہالو ، ہالو کبو ۔ انُم نا براے
انُم نا براے مدد تے قُرآنے
دھول د دمامہ لگانے او تاڑی
ہالو ہالو کبو انُم نا براے
ارفے حنام ءِ دُوئی تہ گندی کو
ہالو ہالو کبو انُم نا براے
ہار ءِ خیُسُن نا ای تُکہ غان الیسوٹ
ہالو ہالو کبو انُم نا براے
چلوے خیُسُن نا ای دبئی آن الیسوٹ
ہالو ہالو کبو انُم نا براے
پھُلی ءِ خیُسُن نا ای زرگر آن الیسوٹ
ہالو ہالو کبو انُم نا براے
اُجرک ءِ انُم نا ای سکھر آن الیسوٹ
ہالو ہالو کبو انُم نا براے " (ا)

ا۔مینگل،افضل،"چوٹوئی"،براہوئی اکیڈمی کوئٹہ،1994ء،صفحہ 104۔

۶۔ جِنام ہندی

جِنام ہندی کے گیت براہوئی قبائل میں منگنی اور شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ منگنی یا شادی سے ایک دو رات پہلے دُلہن یا دُولہا کو جب مہندی لگائی جاتی ہے تو ایسے مواقع پر براہوئی لوک گیتوں میں جِنام ہندی یعنی مہندی کے رسوم کے گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ گیت خوشی اور خاص کر شادی بیاہ کے مواقع پر اظہارِ خوشی کی علامت ہوتے ہیں۔ مہندی سے متعلق چند اشعار درج ذیل ہیں :۔

"مبارک مبارک نے جِنام مبارک
کنا دوست کنا پھُل نے ہزار وار مبارک
جِنام ءِ بیغاٹ کیوہ دُوکے نا رنگی
تپرہ زیبا نے دیرہ ارانگی
جِنام ئی دُوکے تینا ٹِک نی پنائس
سنگھار اریس نی سانگ آ دِنا ہنائس
اینو نا شام ءِ نے دیرہ زیبا
پھُل نا جِنام ءِ نے دیرہ زیبا
سوار مہ گاڈی ئی نے دیرہ زیبا
ہوغپہ خوشی ئی نے دیرہ زیبا
بانگو نا بانگ ءِ نے دیرہ زیبا
انگم نا سانگ ءِ نے دیرہ زیبا

۷۔ لیکو

منگنی اور شادی بیاہ کے رسموں کے علاوہ اور بہت سی رسمیں ہیں جہاں براہوئی اپنے جذبات اور کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کوئی پردیس چلا جاتا ہے، واپس آنے میں دیر کرتا ہے تو ایسے میں بہنیں، مائیں اور بیٹیاں اپنے عزیز و اقارب کو جن جن الفاظ میں یاد کرتے ہیں براہوئی ادب میں اس کیفیت کے گیتوں کو لیکو یا زہیری کہتے ہیں۔ مثلاً :

پٹ اَٹ جلو کیو

دیر تون تینا چوری کن کلو کیو

اونا دیدار کن زہیر اُٹ

اورنگو وطن ءِ

چھٹی کنا چوری نا بتنے

لونا دیدار کن زہیر اُٹ"(۱)

جب گندم کی فصل تیار ہوتی ہے اور کٹائی کا کام شروع ہوتا ہے تو یہ موقع بھی براہوئی سماج میں خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ گندم کی کٹائی کیلیئے براہوئی مرد اور عورتیں ملکر کٹائی کرتے ہیں۔ اس موقع پر بعض نوجوان یہ گیت گاتے ہیں جو براہوئی لوک گیتوں میں "لاب ناشیر" کے نام سے مقبول ہیں :

لابائے کانہ کشی خلینہ

لابائے کانہ لائی ہتینہ

لابائے کانہ کانبو تفینہ

لابائے کانہ خوشہ ہتنہ

لابائے کانہ توشہ کپنہ

لابائے کانہ پُولی ہلینہ

لابائے کانہ دھول خلینہ

لابائے کانہ چھاپ خلینہ "(۲)

قحط سالی سے متعلق بھی براہوئی لوک گیتوں میں اشعار کہے گئے ہیں۔ قحط سالی یا ڈکال کے ایام کو گیتوں کے ذریعے بیان کرنے سے قحط سالی، بھوک و افلاس اور بدحال لوگوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے :

" مَش ءَ نا ہندغاک الحنو ماسہ

بن کنا ہیتے زیبا کہ داسہ

۱۔ ۲۔ مینگل، افضل، " شوشنک"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1994ء، صفحہ 237 ,180۔

کیوہ نے تو پاوہ ڈکال نا گمپ ءِ
تان ءَ نا ڈکال آن اُست کنا ٹپ ءِ
مَش تے ٹی گداران چِلہ و سیل تے
تانہ نا ڈکال چلیٹے میل تے
ڈکال آ تما رب ءَ نا اُچاک
ڈکال آن کسکور سہ بوز آ گوچاک
مَش تیٹی اڑہنگار دا نا ہچاک
ڈکال آن کسکرُ جوانگا نچاک
ڈکال آن سُنگر میل ک نا پیش تے
گوچہ غا کانہ ہتیو پش تے " (ا)

جب دُور دُور تک بارش کے آثار نہ ہوں اور اگر کبھی ایسے لمحات میں کالے بادلوں کی گھٹا چھا جائے تو خشک سالی سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ ایسے موقعوں پر یہ گیت گاتے ہیں :۔

" جھمر جڑ وکاک بسو
بِہ نا احوالے الیسو
مُرغی مستے بُش کیو
کچی گدان تے بش کیو
ہُبو جھمر نا بوگاتے
بابو دریئے گوگاتے
جھمر ریبے بال ءَ تون
پیرہ ہِنانے سال ءَ تون

ا۔ مینگل، افضل، "چوٹولی"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1994ء، صفحہ 134۔

خلبو گدان نا شک آتے

ہُو تروڈگو نا ڈِک آتے

جھر شاران لس میرءِ نا

معلوم متو در دِیرءِ نا

ہُو جھر نا سٹ آتے

دِیر سر مسونے پَٹ آتے" (۱)

۸۔ لوری (لولی)

ماں کی گود بچے کیلئے پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے۔ماں اپنی لوری کے ذریعے اگر ایک طرف بچے کو سُلانے یا خاموش کرانے کا کام لیتی ہے تو دوسری طرف اُس بچے کے ذہن میں معاشرے کے روایات اور اقدار کو بھی ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ اولاد تو اللہ کی دین اور گھر کی رونق ہوتے ہیں۔براہوئی ماں ہو یا کوئی اور ماں وہ صرف ماں ہوتی ہے۔لوری ماں کی زبان سے محبت، پیار اور تمنا کے چند میٹھے بول ہوتے ہیں لیکن وہ مستقبل میں اپنے بچے کو وقت کا بہت بڑا آدمی دیکھنے کی بھی خواہش رکھتی ہے اور بچے کو اپنی معاشرتی زندگی میں اخلاقیات کے ساتھ برتاؤ کا سبق دیتی ہے اور زندگی کی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہ رہنے کی تلقین بھی کرتی ہے۔

موضوعی اعتبار سے وقت کے ساتھ ساتھ لوریوں میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ پہلے زمانے میں جب کوئی ماں اپنے بچے کو لوری دیتی تھی تو اُسکو بہادری، شجاعت، سخاوت، شمشیر زنی اور گھڑ سواری کا درس دیتی تھی لیکن زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی میں تلوار کی جگہ بندوق اور جدید اسلحہ اور گھوڑے کی جگہ گاڑیوں اور جہازوں نے لے لی ہے۔

لوری ماں کے پیار کے ساتھ ساتھ ماں کی ممتا کا نام بھی ہے۔براہوئی لوک ادب میں لوری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔براہوئی میں بہت سی لوریاں کہی گئی ہیں لیکن یہاں ایک لوری اور اسکے اُردو ترجمہ کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

"لولی کنا ساہ لولی کنا گنج

بُوز اُس گون آنبار

دوست اُس خَن آنبار

۱۔ مینگل، افضل، "چوٹولی"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1994ء، صفحہ 141۔

لولی کنا ساہ لولی کنا گنج

خشک نا خُماری کنا ساہ

شیرین آ ناری کنا ساہ

لولی کنا ساہ لولی کنا گنج

پٹ نا فقیرتیاآن اِی سوال کریٹ

اللہ نا دربار ٹی اِی دُو تفیٹ

لولی کنا ساہ لولی کنا گنج

نمٹ داسا کنا ساہ

کیو نے دِلاسہ کنا ساہ

لولی کنا ساہ لولی کنا گنج

جوڑ جتی آ کنا ساہ

خشک نا تُغی آ کنا ساہ

لولی کنا ساہ لولی کنا گنج" (۱)

ترجمہ :۔ اے میرے مستقبل کے حسین نوجوان اور بہادر بیٹے۔اے میری کُل کائنات اور خزانے تم مجھے بہت ہی پیارے لگتے ہو۔اتنے پیارے، اتنے اچھے کہ تم مجھے اپنی خوبصورت آنکھوں سے بھی پیارے لگتے ہو۔میں تمہاری خُمار آلود اور شیریں انار جیسی آنکھوں پہ قُربان جاؤں۔اے میرے لال تجھے اللہ نظربد سے بچائے۔میں نے تمہیں صحراؤں میں پھر پھر کر فقیروں کے توسط سے اللہ سے مانگا ہے۔میرے لال میں ابھی آئی ہوں۔میں تمہیں اپنے گرم و نرم آغوش میں لیتی ہوں۔گلابی ہونٹوں والے حسین شہزادے تمہاری آنکھیں خوابیدہ ہیں۔تو سوجا سوجا سوجا۔

۹۔ مودہ

مودہ براہوئی زبان میں مرثیہ کو کہتے ہیں لیکن عموماً مودہ کی اصل رُوح وہ ہے جس گھر میں (اللہ نہ کرے)

۱۔براہوئی، عبدالرحمٰن،ڈاکٹر، "گوادرغ"،براہوئی اکیڈمی کوئٹہ،1969ء، صفحہ 62, 63۔

کوئی فوت ہو گیا ہو، کوئی باپ، کوئی بھائی اپنے بہنوں سے، کوئی بیٹا اپنی ماں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جُدا ہو گیا ہو تو برا ہوئی مائیں یا بہنیں موت کے پہلے، دوسرے، تیسرے دن عورتوں کے ساتھ ماتم کدہ میں بیٹھ کر ترنم کیساتھ فوت ہونے والے کی جُدائی میں اپنے غم اور اُسکی خوبیوں کو بیان کرتی ہیں۔

زمانہ قدیم میں قلات کے حکمران خاندان میں مودہ کی ایک عجیب و منفرد رسم چلی آرہی تھی جو اب متروک ہو چکی ہے۔ مودہ کی یہ رسم کچھ اسطرح سے تھی کہ ایلتیازئی خاندان میں مرنے والے کے غم کے اظہار کیلئے عورتوں کے ماتم کرنے کی رسوم میں ایک رسم "ڈڈ تونگ" شامل تھی۔ یہ رسم اسطرح ادا ہوتی تھی کہ زنان خانے کے ماتم کدہ میں ایک ڈھول بجانے والے کو لا کر درمیان میں کھڑا کر کے اُسکی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی۔ جس عورت کا بھائی، خاوند یا والد فوت ہوا ہو دیگر عورتیں اُسے سہارا دیکر اس ڈھول والے کے ارد گرد گول دائرہ بناتی تھیں۔ ایک خوش آواز کنیز یا کوئی اور عورت خوبصورت اور سوزو گداز آواز میں مرنے والے کی صفت بیان کرتی تھی اور باقی عورتیں اور وہ غم زدہ عورت کبھی سینہ یا کبھی سر کو پیٹ کر روتی رہتی تھیں ۔ یہ رسم قلات کے خانوں میں کافی عرصہ تک جاری رہا لیکن میر احمد یار خان کے دورِ اقتدار کے ابتدائی دنوں میں آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہو گیا۔

مودہ کے اشعار عموماً فی البدیہہ ہوتے ہیں اور موقع کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔

چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں :۔

ملی داسا بفک نُم اوڑکن خیرات کبو
نواسہ غاک بلی کن نُم قرآن خوانبو
ندر مَنَن بلی نا جلک ءِ دیر تروئے
بلی غریب نا دیر شفی ءِ گھوئے
بلی جان نواسہ غاتے نا دیر نواریفوئے
بلی غریب اوفتے کن قصہ دیر شاغوئے
بلہ غریب داسہ میل تے نا دیر ماروئے
بلی بیوس گڑوک ءِ نا دیر پکاروئے

بہشتی آ ملی جان بندہ لاچار ارے

اوغپہ بو نواسہ غاک خُدا زوراک ارے

ترجمہ :- دادی اب دوبارہ نہیں آئیگی۔ نواسوں تم انکے لیئے خیرات اور قرآن خوانی کرو۔ ہائے دادی جان کی وہ سُوت کون کاتے گا۔ اُن کا اُون کون بُنے گا۔ ہائے دادی اب کون تمہارے بعد قالین بنے گا۔ اۓ دادی اب کون تمہارے بھیڑ بکریوں کو چرائے گا۔ اۓ میرے بہشتی دادی اللہ کے سامنے بندہ لاچار ہوتا ہے کیونکہ اللہ طاقتور ہے جس نے تم کو ہم سے جُدا کردیا۔

براہوئی منثور لوک ادب

براہوئی زبان کے منثور لوک ادب میں لوک کہانیاں، پہیلیاں، ضرب الامثال، تلمیحات اور لطائف شامل ہیں۔ دنیا کے دیگر قدیم زبانوں کے ادب کی طرح براہوئی زبان کے لوک ادب میں بھی یہ ایک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ جو براہوئی زبان وادب کی قدامت پر دلالت کرتی ہے۔

لوک کہانیاں

لوک کہانیاں کسی بھی زبان میں کہی گئی ہوں وہ کہانیاں نہ صرف اُس قوم کے رہن سہن اور معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ یہی کہانیاں قوموں کی ثقافت کی امین بھی ہوتی ہیں۔ براہوئی لوک داستان یا کہانیوں میں بھی براہوئی بولنے والوں کے رہن سہن، مذہبی میلانات اور اعتقادات و توہم پرستیاں اور رسم ورواج کی واضح طور پر عکاسی ہوتی ہے۔ بعد از اسلام تخلیق ہونے والی کہانیوں میں اسلامی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے۔ براہوئی زبان کا منظوم ادب ہو یا منثور اگر ان سب کا جائزہ لیا جائے تو وہ چاہے لوک گیت ہوں یا لوک کہانیاں، ضرب الامثال ہوں یا لطائف ان سب میں اسلامی تعلیمات کو روشناس کرانے کی سعی کی گئی ہے۔ براہوئی لوک کہانیوں کے رویّوں سے ہی انکے قومی رشتوں کے تقاضوں اور مذہبی، سماجی، ثقافتی اور اخلاقی اقدار کی پہچان ہوتی ہے۔ ایک مشہور براہوئی لوک گیت ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی کی کتاب "براہوئی لوک کہانیاں" سے بطور مثال پیش ہے :-

لعل بادشاہ و بی بی کتور

ایک بادشاہ تھا جس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ آخر فقیروں کی دعاؤں سے اُسکے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جسکا نام

لعل بادشاہ رکھا گیا۔

ایک فقیر نے بادشاہ سے کہا تھا کہ جب تک لعل بادشاہ بالغ نہ ہو جائے اُسے گھر سے باہر آسمان کے نیچے نہ سونے دینا۔ اگر باہر نکالا گیا تو پریاں اُس پر عاشق ہو کر اسے لے جائیں گی یا پھر وہ خود کسی پری پر عاشق ہو کر تم سے دور چلا جائیگا۔ فقیر نے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ بالغ ہو جائے تو اسکی جلدی سے شادی کر دی جائے۔ فقیر نے بادشاہ سے کہا تھا کہ جب اسکی شادی ہو جائیگی تو سمجھنا کہ مصیبت سے نجات مل گئی کیونکہ پری عورت کے ساتھ سوکن جیسا سلوک نہیں کرتی۔

بادشاہ نے بیٹے کیلئے زیرِ خانہ یعنی زمین دوز مکان بنوایا اور اُسے وہاں لے گیا۔ باتیں تو جلدی ختم ہوتی ہیں مگر سالوں کو ختم ہونے میں دیر لگتی ہے۔ جب لعل بادشاہ سات سال کا ہوا تو بادشاہ نے اسکی تعلیم کیلئے ایک اُستاد مقرر کیا جو اُسے زیرِ خانہ پڑھاتا تھا اور دن رات وہیں رہتا تھا۔ اُستاد نے باہر کی دنیا دیکھی تھی وہ زیرِ خانے میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ چکا تھا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ ایسا طریقہ اختیار کروں کہ اس زیرِ خانہ سے خود بھی باہر نکلوں اور لعل بادشاہ کو بھی نکالوں۔ یہ سوچ کر اُس نے زیرِ خانے میں اُوپر کی جانب سے ایک سوراخ کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو سورج کی شعاعیں زیرِ خانہ میں پڑنے لگیں۔ لعل بادشاہ نے جب سورج کی شعاعیں دیکھیں تو حیران ہو گیا اور انکو غور سے دیکھنے لگا۔ آخر سہ پہر سے پہلے سورج کی شعاعیں غائب ہو گئیں تو لعل بادشاہ نے رونا شروع کر دیا۔ اُستاد اور دایہ سے تقاضا کیا کہ جسطرح بھی ممکن ہو وہی چیز مہیا کر دو ورنہ میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔ دونوں پریشان ہو گئے اور انہوں نے جا کر بادشاہ کو اطلاع دی کہ اچانک سورج کی شعاعیں غائب ہو گئی ہیں۔ لعل بادشاہ ضد کر کے ہمیں کہتا ہے کہ میرے لئے وہی چیز لاؤ نہیں تو اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔

بادشاہ نے یہ سُن کر خود آ کر شہزادے کو تسلیاں دیں مگر شہزادے کے سامنے باشاہ کی ایک نہ چلی۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر کہا کہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اُسے باہر نکال دو خُدا جو چاہتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ شہزادے کو زیرِ خانے سے باہر نکالا گیا۔ دنیا کو دیکھ کر شہزادے نے کہا سبحان اللہ۔ آسمان پر چاند ستارے دیکھے تو بہت حیران ہوا اور رات بھر نہیں سویا۔ جب صبح ہوئی تو دنیا کے نظاروں اور مخلوقِ خُدا کو دیکھ کر ہر چیز کے متعلق پوچھنے لگا۔ پھر اپنے باپ سے کہا کہ وزیر کے اور دوسرے لڑکوں کو طلب کرو تا کہ میں اُنکے ساتھ کھیلوں۔ بادشاہ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ وزیر کے لڑکے، ترکھان کے لڑکے اور غلاموں کے لڑکوں کو بلا کر اسکے حوالے کیا گیا کہ اُنکے ساتھ کھیلو۔

لڑکوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ وہ اب ہر روز ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے،

سیر و تفریح کیلئے جاتے اور کبھی کبھی شکار بھی کھیلتے۔ یہ تینوں حد سے زیادہ خوش تھے۔ بادشاہ نے سمجھا کہ فقیر جھوٹ بولتا تھا مگر ایسے فقیروں کی باتیں کبھی جھوٹی نہیں ہوتیں۔

اُدھر کوہ قاف کی پریوں کے بادشاہ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زیارت کیلئے گیا اور دُعا مانگی۔ اُسے جواب ملا کہ تمہاری قسمت میں نرینہ اولاد نہیں ہے اور اگر تمہارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اسکی شادی کسی آدم زاد سے ہو جائے گی۔ اُس نے کہا کہ پرواہ نہیں لڑکی تو پیدا ہو تا کہ میں اُسے دیکھ سکوں آگے اُسکی قسمت۔

اللہ کی شان دیکھیے کہ اب لعل بادشاہ جوان ہو گیا اور پریوں کے بادشاہ کی لڑکی لی لی کتور بھی جوان ہو گئی۔ ایک رات لی لی کتور نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ آؤ دنیا کی سیر کو نکلیں۔ چاندنی رات تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ تخت پر بیٹھی اور دیووں سے کہا کہ تخت کو اُٹھا کر اُڑا لے جاؤ تا کہ دنیا کی سیر کریں۔ سیر کرتے کرتے وہ آدھی رات کے وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ملک چین میں جا پہنچی۔ لی لی کتور کیا دیکھتی ہے کہ ایک خوبصورت نوجوان جس کے سامنے چاند کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ آرام سے ایک چارپائی پر سویا پڑا ہے۔ اُس نے دیوؤں کو حکم دیا کہ تخت کو یہاں زمین پر اُتار اجائے تا کہ میں تھوڑی دیر اس آدم زاد کا دیدار کر سکوں کہ وہ پریوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ دیوؤں نے کہا کہ یہ آدم زاد ہے اگر تم اسکے نزدیک بیٹھو گی تو اسکی خوشبو بھی تمہارے کپڑوں میں پڑ جائیگی۔ اگر تمہارے باپ کو معلوم ہوا تو ہماری خیر نہیں ہوگی۔

دیوؤں نے لی لی کتور کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر لی لی کتور نے دیوؤں سے کہا کہ اگر مجھے نیچے نہیں اُتارو گے تو میں پتھر سے اپنا کام تمام کر لوں گی۔ دیو مجبور ہو کر تخت کو نیچے اُتار لے گئے۔ لی لی کتور شہزادے کے قریب بیٹھ گئی اور اُسے دیکھنے میں محو ہو گئی۔ شہزادے کو دیکھنے سے اُسکا دل نہیں بھر رہا تھا۔ دیوؤں نے دیکھا کہ رات ختم ہو رہی ہے انہوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کو معلوم ہو گیا تو ہماری خیر نہیں اسلئے انہوں نے لی لی کتور سے کہا کہ چلو اب واپس چلیں۔ لی لی کتور نے ایک کاغذ پر اپنی تصویر بنائی اور لعل بادشاہ کے سرہانے کے نیچے رکھ دی اور اپنی انگوٹھی نکال کر لعل بادشاہ کو پہنادی اور اسکی انگوٹھی لیکر خود پہن لی اور کاغذ پر لکھا کہ میرا نام لی لی کتور ہے اور میں پریوں کے بادشاہ کی لڑکی ہوں۔ میں تم پر عاشق ہو گئی ہوں۔ اگر تم واقعی اپنے باپ کے فرزند ہو تو تم خود مجھے لینے کیلئے کوہ قاف آؤ گے۔ میں تمہارے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرونگی۔ یہ لکھ کر کاغذ وہیں پر رکھ چھوڑا۔

جب لعل بادشاہ صبح اُٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُسکے سرہانے کے نیچے ایک نہایت خوبصورت پری کی تصویر ہے اور

ایک خط لکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر اُسکے ہوش اُڑ گئے۔ بادشاہ کے تمام غلام جمع ہو گئے مگر وہ کسی سے بھی نہیں بول رہا تھا۔ آخر کار وزیر کے لڑکے اور ترکھان کے لڑکے نے آکر اُسے تسلی دی۔ وزیر کا لڑکا علم نجوم میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے علم نجوم کے ذریعے حساب لگا کر لعل بادشاہ سے کہا کہ فکر مت کرو چالیسویں دن تمہیں لی لی کتور کی جگہ پر پہنچا دوں گا۔ اسکے بعد ترکھان کے لڑکے کو کہا کہ دریا کی دوسری طرف ایک درخت ہے اُسے کاٹ کر لاؤ اور اُس سے ایک کھٹولا بناؤ۔ ترکھان کا لڑکا دریا کے پار جا کر درخت کاٹ کر ساتویں دن کھٹولا بنا کر لایا۔

لعل بادشاہ، وزیر کا لڑکا اور ترکھان کا لڑکا رات کو کھٹولے میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ دن رات اُڑتے چلے گئے، جب بھوک اور پیاس لگتی تو کھٹولے کو نیچے اُتارتے اور اُسے جنگل میں چھوڑ کر خود کھانا کھانے کیلئے شہر جاتے۔ آخر اُنتالیسویں دن وہ آگ اور خون کے دریاؤں کو پار کر کے کوہ قاف میں داخل ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہزاروں دیو اور پریاں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں، یہ دیکھ کر وہ چھُپ گئے۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ انہوں نے کہا کہ آج رات لی لی کتور آکر پریوں اور دیوؤں کے ساتھ بیٹھ کر مجلس منعقد کریگی۔

جس دن سے لی لی کتور سیر سے واپس آئی تھی اُس دن سے اُس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ آج کچھ خوش نظر آئی تھی۔ لعل بادشاہ یہ سن کر خوش ہوا اور وزیر کے لڑکے سے کہا کہ ایسا طریقہ سوچو کہ لی لی کتور کو ہمارے آنے کی خبر مل جائے کیونکہ اگر ہم اپنے آپ کو ظاہر کرینگے تو دیو ہمیں مار ڈالیں گے۔ وزیر کا لڑکا کھٹولے میں بیٹھ کر اُس درخت کے اُوپر پہنچا جہاں لی لی کتور مجلس منعقد کرنے والی تھی تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہاں تین آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے یا نہیں۔ اُس نے دیکھا کہ یہاں تین آدمیوں کے بیٹھنے کیلئے کافی جگہ ہے۔ اُس نے واپس آکر لعل بادشاہ سے کہا کہ اب سو جاؤ رات کو چلیں گے اور آپ اپنے ہاتھ سے اپنا نام کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لینا۔ شام کے وقت باغ میں چاروں طرف چراغ ہی چراغ نظر آرہے تھے۔ پریاں وہاں پہنچ گئیں تھوڑی دیر کے بعد لی لی کتور تخت پر سوار ہو کر اُس درخت کے نیچے اُتری۔ یہ دیکھ کر پریوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ اب وزیر کے لڑکے نے لعل بادشاہ کو کہا اُس کاغذ کو کسی ایسے طریقے سے نیچے پھینکو کہ وہ کسی طرح لی لی کتور کی گود میں گرے۔

لعل بادشاہ نے اللہ سے دُعا کی اور کاغذ کو نیچے پھینکا، کاغذ سیدھا جا کر کتور لی لی کی گود میں گرا۔ لی لی کتور نے کاغذ کو اُٹھا کر پڑھا اور حیران ہو کر اُوپر کی طرف نگاہ کیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ اُس کا منگیتر آیا ہے۔ اب ڈرنے لگی کہ ایسا نہ ہو دیو اُسے دیکھ کر مار دیں۔ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر اُس نے رقص و سرور کی محفل کو ختم کرنے کا حکم دیا اور پریوں اور دیوؤں سے کہا کہ مجھے نیند آ

رہی ہے لہذا میں سونا چاہتی ہوں، یہ کہہ کرانہیں رخصت کیا۔ پھر اپنی سہیلی سے کہا کہ اُس درخت پر چڑھ کر اُن آدم زادوں سے کہہ دو کہ نیچے آئیں۔ جب انہوں نے باتیں سنیں تو خود نیچے اُتر آئے اور انہیں بڑی خوشی ہوئی۔ لعل بادشاہ نے کہا کہ ٹی ٹی کتور میں آیا ہوں۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ اُس نے کہا کہ اگر میرے باپ کو خبر ہو گئی تو ہم سب کو مار ڈالے گا۔ اب تم دوسرے جمعہ کا انتظار کرو، ابھی میں تمہیں لے جا کر کسی جگہ چھپاؤں گی۔ جمعہ کی رات میرے والد اس جگہ دربار منعقد کریگا۔ اُسوقت تم تینوں میرے والد کے سامنے حاضر ہو جانا۔ میرا والد جب شراب پی کر نشے میں مست ہو جائیگا تو پکارے گا کہ مجھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم ہے جو کوئی مجھ سے کچھ مانگے گا میں اُسے دے دوں گا۔ اسوقت لعل بادشاہ میرے والد سے مجھے مانگ لینا۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ اس سال یہ آخری دربار ہو گا۔ اگر مقررہ وقت پر اور پہلی آواز پر حاضر نہ ہوئے تو پھر کچھ نہ ہو گا۔

آخر جمعہ کی رات آئی۔ پریوں کا بادشاہ آیا۔ دربار لگا۔ دوران محفل اور شراب کے نشے میں کہا ہے کوئی جو مجھ سے کچھ مانگے اور میں اسے دے دوں۔ لعل بادشاہ نے یہ آواز سنتے ہی فوراً کہا کہ جناب میری ایک عرض ہے۔ پریوں کے بادشاہ نے کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو ؟ لعل بادشاہ نے کہا کہ آپ مجھے اپنا داماد بنالیں۔ پریوں کے بادشاہ نے کہا کہ تمہاری یہ درخواست قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ تم آدم زاد ہو اور ہم پری کی اولاد ہیں لہذا یہ رشتہ ناممکن ہے۔ لعل بادشاہ نے کہا کہ میری یہی عرض ہے اور میں کچھ نہیں چاہتا۔

پھر ٹی ٹی کتور نے اپنے باپ سے کہا کہ اے باپ ! میرا خاوند ہے تو یہی ہے اگر آپ اُسکی عرض قبول نہیں کرینگے تو میں اپنے آپ کو جان سے مار ڈالوں گی۔ بحث و مباحثہ کے بعد آخر بادشاہ نے اُسکی عرض قبول کر لی۔ دوسرے جمعہ کو لعل بادشاہ کی شادی ہوئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عطا کردہ خلعت میں سے ایک پگڑی لعل بادشاہ کو دیکر پریوں کے بادشاہ نے کہا کہ تم ہر سال آنا مگر اس وقت میرا غصہ زوروں پر ہے تم فوراً چلے جاؤ ایسا نہ ہو کہ میری طرف سے تمہیں کوئی ضرر پہنچے۔ لعل بادشاہ ٹی ٹی کتور کے ساتھ روانہ ہوا۔ خوشی خوشی اپنے وطن پہنچا۔ وزیر اور ترکھان کے لڑکے نے بھی ایک ایک پری سے شادی کی۔ سب خوش وخرم رہنے لگے"۔(۱)

۔براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، " براہوئی لوک کہانیاں"، لوک ورثہ، اسلام آباد، 1985ء، صفحہ 172 ,167۔

براہوئی پہیلیاں

پہیلیاں کہنایا پہیلیاں بوجھنے کا رواج دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ پہیلی بولنے والا یہ جاننے کے متلاشی ہوتے ہیں کہ پہیلی بوجھنے والے کی ذہنی صلاحیت کیا ہے۔ جس طرح دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں پہیلیوں کو اہم مقام حاصل ہے اسی طرح قدیم براہوئی نثری ادب میں بھی یہ پہیلیاں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے کسی زبان کی قدرت، وقعت، جانچنے اور ذہنی سطح کو ناپنے کی پہچان ہوتی ہے۔ براہوئی کی ہمسایہ زبانیں اپنے ادب کے سرمایہ میں ان اولی موتیوں کو سموئے ہوئے ہیں لیکن براہوئی ادب بھی اس گوہر نایاب سے خالی نہیں۔ براہوئی زبان کے ممتاز محقق وادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی نے 1981ء میں کچھ پہیلیاں جمع کر کے براہوئی زبان میں پہلی پہیلیوں کی کتاب "چاچا" کے نام سے مرتب کی۔ اس سے پہلے کچھ پہیلیاں انگریزوں نے بلوچستان پر قبضے کے بعد براہوئی اور بلوچی زبان پر تحقیق کرنے کے دوران جمع کی تھیں۔

براہوئی زبان میں پہیلی کو چاچا کہتے ہیں۔ براہوئی میں پہیلی کو بوجھنے کا اپنا منفرد انداز ہے جو کسی اور زبان کو حاصل نہیں ہے۔ براہوئی میں پہیلیاں بوجھنے کا طریقہ اسطرح شروع ہوتا ہے کہ پہیلی بُجھانے والا کہتا ہے کہ :۔

چاچا چاچا

بال کیک اُ چک اُس اُف۔ مونے خاخوس اُف ۔ مرغ ارے نہ مُرس اس اف۔ باریم اُرف اُچس اُف۔

دنی پر غبو نہ اتسے۔ (۱)

ترجمہ :۔ اُڑتا ہے پرندہ نہیں۔ کالا ہے کوا نہیں۔ سینگ تو ہیں لیکن بھیڑ نہیں ہے۔ بوجھ اُٹھاتا ہے لیکن اُونٹ نہیں۔

بوجھو کیا ہے ؟

اب بوجھنے والے اگر ایک سے زیادہ تھے تو آپس میں صلاح ومشورے سے اِس پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سوچ وبچار کے بعد بھی فرض کیجئے کہ وہ اسے نہ بوجھ سکے تو کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ نہیں ہے۔ خود کہو۔

لیکن پوچھنے والا اس پہیلی کو خود بوجھنے سے پہلے کچھ روایتی جملے ادا کرتا ہے۔ جو پہیلی نہ بوجھ سکنے والوں کی لست اور کمزور دماغ کی عکاسی کرتے ہیں جو براہوئی زبان میں اسطرح ادا کی جاتی ہیں۔

"کوئٹہ ئے آخی باخی کبو کنبو

جوانگا گڑاک تے کنا باٹی

براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "چاچا"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1981ء، صفحہ 5۔

کراب انگا گڑاک تے نُملبائی

کنلباجی برے نُم ہڑ ہڑاٹ کُنیرے تہ

نُملباجی برے اِی ہفت مَش آن اے پار خسوتہ

اِی تولوبوپ غالی، نُم تولرے کناکچک ناجُل آ

اِی کُننو خیسُن ناتاس ٹی، نُم کُننو کچک ناکلنڈی ٹی

ترجمہ :۔ کوئٹہ کو فروخت کر کے کھا جاؤں۔ اِس کی اچھی اچھی چیزیں میرے مُنہ میں، بُری چیزیں تمہارے مُنہ میں۔ میرا بھیجا ہوا سالن تمہارے گھر آئے، تُم اُس پر ٹوٹ پڑو۔ لیکن تمہارے گھر سے میرے لیئے سالن آئے میں اُسے سات پہاڑوں کے اُس پار پھینک دوں۔ میں بیٹھوں قالین پر تُم بیٹھو میرے کُتے کی جگہ پر۔ میں کھاؤں سونے چاندی کے پلیٹ وگلاس میں، تُم کھاؤ میرے کُتے کے برتن میں۔ جب پہیلی بوجھانے والا یہ الفاظ ادا کرتا ہے تو پہیلی نہ بوجھ سکنے والے اپنے بارے میں اسکے تاثرات سننے لگتے ہیں اسطرح انہیں بہت ہی شرمندگی اور ندامت اُٹھانی پڑتی ہے۔

پھر پہیلی کو خود بوجھتا ہے۔

جواب۔ گھبیرلا۔

اسطرح وہ راتوں کو بیٹھ کر کافی دیر تک اسطرح پہیلیاں بوجھتے ہیں اور لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

براہوئی کی کچھ پہیلیاں یوں ہیں :۔

۱۔ کرنو وسپاک اُس پتاسہ غان پُرے

ترجمہ :۔ نیلا رُومال پتاشوں سے بھرا ہوا ہے۔

جواب :۔ آسمان اور ستارے۔

۲۔ او اُسٹ ،ایلو اِرٹ نا خانہ ءِ ہم کراب کیک ۔

ترجمہ :۔ وہ ایک ہے لیکن دو کے گھروں کو خراب کر دیتا ہے۔

جواب :۔دل۔(۱)

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، ''چاچا''، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1981ء، کے مختلف صفحات

۳۔ پیہُن آ گنبد نہ دَر نہ گلی۔

ترجمہ :۔ سفید گنبد در نہ دروازہ

جواب :۔ انڈا۔

۴۔ خیسُن آ بلاٹ خواران پُرے

ترجمہ :۔ سُرخ بلاٹ، موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

جواب :۔ انار۔ (۳)

۵۔ سُوتہ ہَنین ءِ سل تہ تُرین ءِ۔

ترجمہ :۔ گوشت میٹھا اور چمڑا کڑوا۔

جواب :۔ کھیرا۔

۶۔ خیسُن گُدی پدان پھُل ہنک۔

ترجمہ :۔ سرخ دوپٹہ والی پھول چُن رہی ہے۔

جواب :۔ دُلہن۔

۷۔ اِی ہیلا کیوہ لال کنے چونڈک ایتک۔

ترجمہ :۔ میں لیلیٰ کہتا ہوں۔ لال مجھے چونڈیاں دیتا ہے۔

جواب :۔ بیر۔

۸۔ اُسہ قبر سیٹی چِل مُردہ۔

ترجمہ :۔ ایک قبر میں چالیس مُردے۔

جواب :۔ ماچس اور دیا سلائی۔

۹۔ دریاب ٹی دوشہ ئس ئے۔ دوشہ نا باٹی لعل اسے۔

ترجمہ :۔ دریا میں ایک سانپ اور سانپ کے مُنہ میں ایک لعل۔

جواب :۔ چراغ۔۔۔لالٹین۔

۱۰۔ اُسہ تال سے تال ٹی گلو سے۔ تال ٹی چاقو سے، چاقو اخس کہ تڑک گلو چٹ مقک، تال بُد مقک۔(۱)

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، ''چاچا''، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1981ء، کے مختلف صفحات

ترجمہ :۔ ایک تھال، اسمیں تربوز اور چاقو، چاقو جتنا کاٹے تربوز ختم نہ ہو، تھالی نہ بھرے۔

جواب :۔ دُنیا۔

براہوئی پہیلوں کے بارے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی کی کتاب "براہوئی چاچاک" 1981ء میں چھپی ہے اس سے پہلے اور نہ بعد میں کسی براہوئی ادیب نے اس طرف توجہ دی۔ براہوئی ادیبوں کو خصوصی طور پر اس طرف توجہ دینی چاہیئے تاکہ صحراؤں، میدانوں، پہاڑی لوگوں اور اسی طرح شہری لوگوں میں مروج براہوئی پہیلوں کو یکجا کر کے انہیں کتابی صورت میں آگے لایا جاسکے۔

ضرب الامثال، کہاوتیں

کہاوتیں اور ضرب الامثال کے بغیر ادب بدمزہ اور پھیکا ہوتا ہے۔ یہ کہاوتیں دورانِ زندگی روزمرہ پیش آنے والے حالات وواقعات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کہاوتوں میں چور، سخی، بخیل، امیر، غریب، بھوک وافلاس، خوشحالی، مردانگی، ڈرپوکی، دوستی ودشمنی، سماج اور سماجیات، نیکی وبدی الغرض ہر قسم کے واقعات کو موضوع بنا کر ضرب الامثال اور کہاوتیں تخلیق کی گئی ہیں۔

کہاوت اُس جملے، بات، یا الفاظ کے اُس مجموعے کو کہتے ہیں جس کے پسِ پردہ ایک مکمل کہانی ہو جبکہ ضرب المثل کسی بھی ادب میں حکماء، علماء، فضلاء اور داناؤں کے اقوال زرّیں ہوتے ہیں جو صدیوں کے تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ یہ وہ حادثات وواقعات ہوتے ہیں جنکو بوقت ضرورت مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اگر کسی زبان میں ضرب المثل اور کہاوتیں نہ ہوں تو وہ پسماندہ زبان ہو سکتی ہے۔ اگر اُس زبان کے قدیم ادبی ذخیرے میں کہاوتیں، تلمیحات، لطائف اور ضرب المثل ہونگے تو وہ زندہ اور جاندار زبان کہلا سکتی ہے۔

براہوئی زبان کی کہاوتیں اور ضرب المثال بھی ایک مخصوص زمانے اور خاص دور کی آئینہ ہوتی ہیں۔ براہوئی زبان میں کہاوتیں اور ضرب المثل کو یکجا کرنے کا کام نامور انگریز محقق سر ڈینس برےؔ نے اپنی براہوئی انگریزی لغت میں شروع کیا تھا۔ آنجہانی برےؔ نے اپنی اس لغت میں کئی جگہ براہوئی کہاوتوں کو تحریر کیا ہے۔ اسکے بعد کامل القادریؔ نے براہوئی کی کوئی دو سو سے زائد ضرب الامثال اپنی کتاب "شروخ" میں جمع کر کے شائع کروائیں۔ پھر ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی نے پہلی بار براہوئی کہاوتوں پر مشتمل اپنی کتاب وسائتاک 1979ء میں اور ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے براہوئی کہاوتوں پر مشتمل کتاب "شاہی خردار"

1989ء میں شائع کروایا ہے۔ تاہم اس صنف پر مزید تحقیق اور کام کی ضرورت ہے۔ ذیل میں براہوئی کے چند ضرب المثل بطور نمونہ اُردو ترجمہ کیساتھ پیش کیے جاتے ہیں :۔

	براہوئی ضرب المثل	اُردو ترجمہ
ا۔	بھلا نا غم بھلن مریک	بڑوں کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔
۲۔	با ئنا باخوئے دُو ئنا باخو ئن دیر ایتک	نونقد تیرہ اُدھار۔
۳۔	ہدغ وختس شاہ ئے دختس گدا ئے	چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔
۴۔	ہرگس نا تینا بائے	جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔
۵۔	کور ئن دے و نن اَست او یا ہیش یا ئریش	اندھا کیا جانے بسنت کی بہار۔
۶۔	اشتاف کپہ اشتافی آن ٹچک کور و ئتری خنک	جلدی کا کام شیطان کا۔
۷۔	ہڑدے نا ہنوکے قدر اَف	قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا۔
۸۔	ہراڑے اُست کئے ہموڑے نت کائک	جہاں چاہ وہاں راہ۔(۱)

اگر کوئی کام بروقت نہ ہو، اگر ہو تو موقع پر نہ ہو تو ایسے لوگوں پر براہوئی کی مشہور ''نصرو کے ماں کا کفن'' والا کہاوت دہرایا جاتا ہے۔ اسی کہاوت کا عبدالرزاق صابر کے کہاوتوں کی کتاب ''شاہی خروار'' سے انتخاب کیا گیا ہے جس کا اُردو لُب لباب اسطرح ہے :۔

''کسی گاؤں میں نصرو نامی ایک شخص رہا کرتا تھا۔ انکی والدہ اکثر بیمار رہا کرتی تھیں۔ آخر زندگی کے دِن پورے ہوئے اور وہ انتقال کر گئیں۔ ماں کی انتقال کی خبر نصرو نے پورے شہر کو دی۔ گاؤں کے سارے لوگ نصرو کے گھر آ آکر جمع ہوتے گئے۔ وقت وقت کی بات ہے اُس زمانے میں گاؤں کے آس پاس ایسی کوئی دکان نہ تھی جہاں ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ کفن وغیرہ کا بھی بندوبست ہوتا مجبوراً شہر جانا پڑتا تھا لہٰذا یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جبتک مردے کو غسل دیا جاتا لوگوں نے نصرو کو مشورہ دیا کہ تم جلدی سے جاکر اپنے ماں کیلئے کفن خرید کر آجاؤ۔

نصرو کفن خریدنے کیلئے شہر کے بڑے بازار روانہ ہو جاتا ہے۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد لوگوں کو احساس

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، ''ومساہتک''، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1979ء، صفحہ 8۔

ہوا کہ مردے کو دفنانے میں دیر ہو رہی ہے اور کفن ابھی تک نہیں پہنچا۔ گھر میں جمع لوگوں نے کسی کو مشورہ دیا کہ وہ خود چلے جائیں وہ کفن لاکر نصرو کے ماں کو قبرستان لے گئے۔ مردے کو دفن کیا۔ لوگ قبر پر دعا مانگ رہے تھے کہ اسی دوران نصرو آگیا۔ اچانک کسی پتھر پر پاؤں کے پھسلنے کی وجہ سے اسکے پاؤں میں موچ آگئی۔ نصرو نے برجستہ کہا کہ جلدی کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں"(۱)

لطائف

براہوئی ادب میں سینکڑوں ایسی مزاحیہ کہانیاں اور لطیفے موجود ہیں جو اس زبان کی اپنی منفرد حیثیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مزاح کے متعلق مشہور ہے کہ کلام میں مزاح کا وہی درجہ ہے جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے۔ جسطرح نمک کے بغیر کھانے کا مزہ پھیکا ہوتا ہے اسی طرح مزاح کے بغیر ادب بھی پھیکا ہوتا ہے۔ براہوئیوں نے اپنے ادب کو پھیکا نہیں ہونے دیا۔

ذیل میں براہوئی کے چند لطیفے پیش کیئے جاتے ہیں جو براہوئی بولنے والوں کے ہاں مقبول ہیں :۔

"ایک شخص کسی ایسے گاؤں میں چلا گیا جہاں پسوؤں کی کثرت تھی۔ رات کے وقت جب میزبان بستر درست کرنے لگا تو اُس سے کہا کہ ہمارے یہاں پسو زیادہ ہیں اسلیئے رات کو لحاف اچھی طرح اوڑھ کر سونا، ایسا نہ ہو کہ پسو آکر تمہیں کاٹ لیں۔ اُس شخص نے کبھی پسو نہیں دیکھے تھے۔ جب سونے لگا تو اس ڈر سے اُسے نیند نہ آئی کہ پسو آکر کاٹیں گے۔ آدھی رات تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اچانک اُس نے لحاف سے سر نکالا تو ایک بلی پر نظر پڑی۔ اُس نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی پسو ہے اور اسے کاٹنے کو آرہا ہے۔ چنانچہ چیخنے چلانے لگا۔ شور سن کر لوگ دوڑتے ہوئے آگئے اور شور کی وجہ پوچھی تو اس نے بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" وہ پسو مجھے کاٹنے آیا ہے"۔

ایک شخص کو اپنے اکلوتے بچے سے والہانہ محبت تھی۔ ایک دن اُسکی بیوی نے اُس سے پوچھا کہ بچے میں وہ کونسی امتیازی صفت ہے جس کی وجہ سے تُم اسے بے حد پیار کرتے ہو۔ وہ بولا کہ بچے کے دانت نہیں ہیں اور جب وہ اپنی توتلی زبان میں باتیں کرتا ہے تو اسکی باتیں بے حد پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ جب یہ شخص کھیتوں میں کام کرنے گیا تو اسکی بیوی نے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے۔ رات کو جب وہ شوہر سے باتیں کرنے لگی تو اس کے شوہر کو اسکی باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اُس نے پوچھا کہ آج تم اسطرح کیوں باتیں کر رہی ہو؟ بیوی نے جواب دیا کہ صبح تم نے کہا تھا کہ بچے کے مُنہ میں دانت نہیں ہیں اس لئے میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے بھی اسی وجہ سے اپنے دانت توڑ دیئے ہیں کہ تم مجھ سے بھی محبت کرو۔(۲)

۱۔ صابر، عبدالرزاق، "شاہی خروار"، شال ایسوسی ایشن کوئٹہ، 1989ء، صفحہ 83۔

۲۔ براہوئی، عبدالرحمن، ڈاکٹر، " براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1982ء، صفحہ 75 ,74۔

براہوئی کلاسیکی ادب

کلاسیکی ادب وہ ادب ہوتا ہے جس میں قدیم ادبی اصول، قوانین اور ضوابط کو مد نظر رکھ کر کوئی ادب پارہ تخلیق کیا جاتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں منطق، وجوہات، علت و محلول کارائج ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے انفرادی اور تخیلات کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

کلاسیکی ادب میں شعراء اور ادباء کو کلاسیکل اساتذہ کے بتائے ہوئے مخصوص ڈھانچے کی پیروی کرنی پڑتی ہے اور اُنہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر کاربند رہنا پڑتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں زبان ہی وہ اہم جز ہے جو کسی بھی عام تخلیق کو کلاسیک بنا سکتی ہے یعنی ان اصول و ضوابط کے ساتھ ساتھ اس میں زبان کی تاثیر اور وزن بھی اہمیت رکھتی ہے۔ زبان جس قدر فلسفیانہ اور عام فہم ہو، خیال بھی کسی عام دنیاوی مسائل کی ترجمانی کر رہا ہو اور اس میں وہ شاندار قوانین کا عنصر بھی موجود ہو جو کسی کلاسیکی ادب پارے کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ تو وہ ادب پارہ کلاسیک بن جاتا ہے۔ کلاسیکی ادب کا ایک اور اہم جز و یہ ہے کہ کلاسیکل شاعری اور ادب didactic ہوتا ہے یعنی ایسا ادب جس میں اخلاقی اصولوں کا پرچار کیا جائے جس میں دینی مواد بھی شامل ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکل ادب ہر دور کے اچھوتے نظریات اور فلسفے کا سبق بھی دے۔ دنیا کے تمام ادیب و مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ہر ادبی تخلیق یا تو کلاسیکل ہوتی ہے یا رُومانوی، مگر کوئی بھی دور خالصتاً کلاسیکی یا خالصتاً رُومانوی نہیں ہوتا کیونکہ ذہنِ انسانی تخلیق کے مراحل میں کسی کا پابند نہیں ہوتا۔ اخلاقی اور دینی شعراء کے علاوہ کلاسیکی ادب میں سب سے اہم صنف رزمیہ شاعری ہوتی ہے جس میں قومی ہیروز کی زندگیوں، انکی بہادری اور کارناموں کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ یہ دنیا کی سب سے قدیم صنف ہے۔

براہوئی قدیم شاعری میں اگر کلاسیکل رجحانات تلاش کرنے ہوں تو ہمیں اس زبان کے شعراء کے کلام کو کلاسیکی نظر سے دیکھنا ہوتا ہے۔ ریکی، بشام اور قیصر خان وہ شعراء ہیں جنہوں نے رزمیہ شاعری کی اور ایمانداری سے کلاسیکی اصولوں کے پابند رہے تاہم ان سے قبل کی چند کتابیں جو براہوئی ادب میں کلاسیکل حیثیت رکھتی ہیں ان کا ذکر کیا جانا ضروری ہے۔ ان کُتب میں سے چند کی تفصیل اسطرح ہے۔

خدمتِ دین یہ کتاب 709 ہجری بمطابق 1293 عیسوی کی تالیف ہے۔ اس کے کل صفحات 100 ہیں۔ اسمیں پند و نصائح ہیں۔

مجہول الاسم خدمتِ دین کے بعد 810ہجری کی لکھی ہوئی ایک "مجہول الاسم" کتاب بھی ہے۔ اسکا نسخہ شوراوک افغانستان سے ضلع چاغی کے حضرت سید بلانوش کے خاندان کے ہاتھ آیا۔ اسمیں ایک جگہ ایک بزرگ تچو کا نام دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ حضرت بلانوش کے خاندان سے تھے۔ اُنکا اصل نام معلوم نہیں۔ اس کتاب میں سانپ کے زہر کے رفع کیلئے ایک عمل یوں تحریر ہے :۔

"دُوشہ کُننگ کس سے گڑادرہدہ ءِچل ویک وار خوانےو دُوشہ کنوکا جاگہ غاپھف کے۔
حکم اُث خُدا انازہر اثرکپک ہدا وادے"۔

ترجمہ :۔ اگر کسی کو سانپ کاٹے تو پھر اکتالیس بار اس دم کو پڑھ کر متاثرہ جگہ پر پھُونک دے۔ خُدا کے حکم سے زہر اثر نہیں کریگا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حکم خُدا نا۔ ہدہ دُوشہ نہ ازن پیر نا۔ سول دین کسک مسک۔ ہر کس بجوید۔ پچ اللہ نا دروہی نے خُدا نا۔ دروہی نے پیر نادروہی نے۔ زہر دفع مرک۔ حکمت خُدا انا۔ پنچگا تا دخداءِ مصطفیٰ نا"۔

ترجمہ :۔ (محقق کے مطابق پیر سول دین اور کسک مسک کے مطالب معلوم نہیں ہو سکے البتہ ترجمہ یوں ہوگا :)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حکم خدا کا۔ دم سانپ کے کاٹے کا۔ اجازت پیر سول دین سے کسک مسک جو کہے سب چیزوں پر اللہ تعالیٰ قادر۔ تجھے اللہ تعالیٰ کی قسم۔ تجھے پیر کی قسم تمام اولیاء وانبیاء کی قسم۔ اے زہر زائل ہو جا۔ خُدا کے حکم سے، پنج تن پاک اور خُدا اور مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے۔

عملیات گہربار یہ کتاب 12 ربیع الاول 980ہجری کی تالیف ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں محقق کے مطابق ہمزاد کی تسخیر حاضرات اور دفینہ پانے اور دوسرے باب میں دیو اور پری پر قابو پانے سے متعلق اعمال درج ہیں۔ اسطرح تیسرے اور چوتھے باب میں بھی کل 32 عملیات ہیں۔ جن میں چند دشمن کی سلحہ بندی اور زبان بندی سے متعلق ہیں۔ پانچواں باب دانت کے درد اور رزق کی کشائش سے متعلق ہے۔ اسطرح محقق کی تحقیق کے مطابق دوسرے حصے میں سر درد، بچے کے رونے وغیرہ کے متعلق عملیات ہیں۔ اسکے بعد استخارہ، دشمن کو ذلیل کرنے اور ہر بیماری سے نجات

پانے کے متعلق عملیات اور تعویذات تحریر ہیں اور کیمیا کا نسخہ کتاب کے آخر میں درج ہے۔(۱)

قدیم براہوئی ادب میں براہوئی ادب کا دوسرا اور درمیانی دور زیادہ مشہور ہے۔ یعنی براہوئی زبان میں قدیم ادب کا بیشتر حصہ اس دور میں تحریر ہوا ہے۔ قدیم ادب کو تحریر کرنے میں علماء کرام کا بہت بڑا حصہ ہے جس سے بحر صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان عوامل میں مکتبہ دُرخانی کا بھی عمل دخل شامل ہے جس کے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کرام نے براہوئی ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ لہذا اس ضمن میں یہاں اُن تمام عوامل کا مختصر جائزہ لیا جائیگا جو قدیم براہوئی ادب کی تخلیق کا سبب بنے یا وہ احباب اور علمائے کرام جنھوں نے براہوئی ادب اور خاص کر قدیم ادب کی آبیاری کی ہے، کے کارناموں پر روشنی ڈالی جائیگی لیکن پہلے مکتبہ دُرخانی کے قیام کے اسباب اور تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

مکتبہ دُرخانی

بلوچستان پر انگریزوں کے قابض ہونے کے بعد بلوچستان میں عیسائیت کی پرچار زور و شور سے شروع ہونے لگا اور اس دور میں برطانیہ اور دوسرے ممالک کے بہت سے عیسائی پادریوں نے بلوچستان کا رُخ کیا۔ بلوچستان آکر وہ عام لوگوں کو عیسائی بننے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ انگریزوں کی سرپرستی میں عیسائیت کی بڑھتی ہوئی تبلیغ اور عیسائیت کی پرچار نے بلوچستان کے مقامی مسلمان علماء کو اس تبلیغ کو روکنے کیلئے ایک ساتھ مل بیٹھ کر حکمتِ عملی وضع کرنے کیلئے مجبور کیا۔ اس دور میں برصغیر کے ایک جیدّ بزرگ حضرت سیدّ پیر ابوالخیر صاحب بھی بلوچستان تشریف لائے اور انہوں نے بھی بلوچستان کے علماء کو انگریزوں کے شر انگیز پروپیگنڈے اور عیسائیت کی پرچار کو مؤثر طور پر روکنے کیلئے مشورہ دیا۔

1883ء کے قریب مولانا محمد فاضل دُرخانی کے زیرسرپرستی گاؤں دُرخان بمقامِ ڈھاڈر میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ عیسائی تبلیغی جماعتوں کی طرف سے عیسائیت کی پرچار کو روکنے کیلئے مقامی زبانوں بلوچی اور براہوئی کو استعمال کیا جائے اور اسکے علاوہ اس مدرسے کی تدریسی زبان بھی انہی زبانوں کو رکھا گیا۔ اس مدرسے میں دینی علوم براہوئی اور بلوچی میں پڑھائے جانے لگے لیکن مکتبہ دُرخانی صرف مذہبی تبلیغ تک محدود ہوگئی۔ اس ادارے نے براہوئی ادب کی جمالیاتی اور عشقیہ شاعری کو یکجا کرنے کی کوئی سعی نہ کی۔ مکتبہ دُرخانی کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے ممتاز براہوئی دانشور، ادیب اور شاعر میر عبدالرحمٰن کُرد کہتے ہیں کہ :۔

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، ”براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ“، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1982ء، صفحہ 91,90,89۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مکتبہ دُرخانی کے علماء اور ادباء نے براہوئی زبان کو تدریسی زبان بنایا۔ رسم الخط کا تعین کیا اور اس کے تحریری ادب میں گرانقدر اضافہ کیا۔ یہ انہی علماء حضرات کے مسائی کا نتیجہ ہے کہ براہوئی زبان کی حیثیت محض بولی سے بڑھی اور ہم اس کیلئے اس کے شکر گزار ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ اگر دُرخانی مدرسہ کے شعراء اور ادباء براہوئی زبان کی نشوونما اور ارتقاء کیلئے خالص براہوئی فرہنگ اور پیرائے کو اختیار کرتے تو شاید آج براہوئی زبان کا ادب عام علاقائی ادب سے سبقت لے جاتا اور اسکی سطح اس قدر پست نہ ہوتی"۔(۱)

لیکن پھر بھی کچھ علماء اور ادباء نے براہوئی کے عشقیہ اور جمالیاتی شاعری کی طرف توجہ دی مثلاً:

براہوئی کلاسیک کُتب کے بعد اُن شعراء کا نام آتا ہے جن کی تخلیقات اور شاعری کو براہوئی ادب میں کلاسیک کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان شعراء کی مختصر احالات زندگی اور نمونہ کلام کو مثال کیلئے پیش کیا جاتا ہے :۔

مُلا محمد حسن

مُلا محمد حسن کے تاریخ پیدائش کے بارے میں معلومات نہیں ہیں البتہ انکی وفات 1852ء میں جیل میں ہوئی۔ مُلا محمد حسن براہوئی، بلوچی، اُردو اور فارسی کے اعلیٰ پائے کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ مُلا محمد حسن کا خاندان میر نصیر خان کے دور سے لیکر خان میر خداداد خان کے دور تک دربار قلات میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن بعد کے ایام میں خان میر خداداد خان کے دربار میں سیاسی چپقلش بازوں کی وجہ سے انکے اور خان کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے اور اسی پاداش میں ان کی زندگی کے بقیہ دن جیل کے نظر رہے۔ مُلا محمد حسن کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ براہوئی کے پہلے غزل گو شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مُلا محمد حسن نے براہوئی زبان میں غزل کے ساتھ ساتھ شاعرِ فطرت کے طور پر بھی خوب نام پیدا کیا ہے۔ اُن کا کلامِ فارسی "گلدستۂ قلات" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اسکے علاوہ براہوئی اور اُردو کی چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کے براہوئی گیت اور غزلوں کو براہوئی ادب میں کلاسیک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ انکی ایک غزل پیش ہے :۔

" او شام نا بردکا اُستے کنا دریس
احوالے ہندہ نا خورد پری کہ دلیس

ا۔ شاہوانی، عبدالحمید، "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء"، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 58۔

قاصد کہ نی کاسہ ، بِیتاتے نی چاسہ

خور و پری اے پاسہ اُسہ دم کہ نی برلیس

ٹکاک ءَ ، دانہ غاکو ، تیل و شانہ آکو

ہڑدے نا بہانہ آکو اُسہ دم کہ نی برلیس

آہو و مور و انج اُس ، دشمن تیان رنج اُس

محمد حسنؔ کن گنج اُس جولان تینون اُسہ دم کہ نی برلیس "(۱)

ملک داد قلاتی

مولانا ملک داد قلاتی براہوئی ادب کے تحریری دور کے سب سے پہلے شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش اور وفات کے بارے میں معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ ملک داد کے خاندان کے بارے میں براہوئی کے ممتاز محقق ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی لکھتے ہیں کہ :۔

"سترھویں صدی عیسوی کے ربع میں قندھار میں ایک غرشین گھرانے میں آدین نامی ایک شخص کی پیدائش ہوئی۔ والدین نے انکی تعلیم و تربیت پر پر خاص توجہ دی۔ جوانی میں آدین کی شادی قندھار میں ہوئی۔ انکے ہاں کتنی اولادیں ہوئیں اس بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ البتہ انکے بیٹوں میں سے ایک ملک داد بہت ذہین نکلا اور خوب نام پیدا کیا۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاشِ روزگار کیلئے قلات کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں میر نصیر خان نوری کا قلات کے حکمران تھے۔ ملک داد قلات آکر نصیر خان کے دربار سے منسلک ہوئے۔ اُس نے براہوئی، بلوچی اور پشتو میں شاعری کی۔ اُنکا بلوچی اور پشتو شاعری دست برد زمانہ سے نہ بچ سکی البتہ انکی براہوئی شاعری محفوظ رہی۔

ملک داد نے براہوئی میں شاعری کی۔ انہوں نے اپنی براہوئی شاعری کی کتاب کا نام تحفۃ العجائب رکھا۔ یہ کتاب تقریباً 1760ء میں لکھی گئی لیکن اس کتاب کو بعد میں مولانا حاجی نبو جان قلندرانی نے 1906ء میں دریافت کر کے شائع

ا۔ براہوئی، عبدالرحمن، ڈاکٹر، " قدیم براہوئی شعراء "، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، سن اشاعت ندارد ، صفحہ 24۔

کروایا۔ اس کتاب کے کل چالیس ابواب ہیں اور اشعار کی تعداد 275 ہیں۔ ان اشعار میں فقہ کے مسائل حنفی عقائد کے مطابق بیان کیئے گئے ہیں۔ اسکے علاوہ اس میں حمد، نعت، اور منقبت بھی ہیں۔ اس کتاب میں عجب طریقے سے وحدانیت اور کائنات کی تخلیق کرنے کا بیان ہے"(۱)

ملک داد قلاتی کے کتاب "تحفۃ العجائب سے چند اشعار پیش ہیں :۔

"ملک داد عالماتا خاکِ پائے
خُدا غان خواہک ، ایمان نا عطائے
لہ ابن آدین نا غرشین زاتے
ہرا دا بندہ ساکن فی القلاتے

ہزار و یک صد ہفتاد و سہ سال
رسولؐ نا ہجرت آن اے نیک اعمال
دے ذی حج نا نوک آ تمام مَس
گُوا تمام مَس تحفۃ العجائب
براہوئی دُوی اَٹ چا مناسب " (۲)

حاجی نبو جان

براہوئی کلاسیکل شاعری میں حاجی مولانا نبو جان بھی منفرد مقام و ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ حاجی نبو جان 1851ء میں مستونگ کے قریب چونو گاؤں میں محمد رمضان قلندرانی کے ہاں پیدا ہوئے۔ بچپن میں آپ کو دینی علوم پڑھنے کا شوق تھا چنانچہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس سے منسلک ہوئے۔ آپ اُن مذہبی رہنماؤں میں بھی شامل تھے جنہوں نے عیسائی مبلغین کی کوششوں کو بری طرح ناکام بنادیا تھا۔(۳)

مولانا پہلے عالمِ دین ہیں جنہوں نے لب رولور (شادی کے وقت بیٹی کو فروخت کرنے والی قیمت) جیسی

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر،" قدیم براہوئی شعراء"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، سن اشاعت ندارد، صفحہ 13,14۔
۲۔"ثقافت وادب وادی بولان میں"، پبلشر بزم ثقافت، کوئٹہ، 1968ء، صفحہ 214۔
۳۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر،" براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1982ء، صفحہ 66۔

قبیح رسم کے خلاف آوازاُٹھائی اور ان رسوم کے خلاف بھر پور انداز میں لکھا۔ قومی رسوم کے خلاف آوازبلند کرنا اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں ڈالنے کے برابر ہوتا ہے لیکن مولانا نے جرأت سے کام لیتے ہوئےاُس جہالت کے دور میں بھی اِس رسم کے خلاف لکھا اور ساتھ ہی شادی بیاہ کے موقعوں پر ایسے رسوم سے باز رہنے کو کہا۔ انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انکی وہ شاعری جس نے کلاسیک کی حیثیت اختیار کی بُرے رسوم کے خلاف آواز ہے، کہا کرتے تھے کہ یہ ناجائز عمل ہے کہ مرد اور عورتیں ایک ساتھ مِل کر ناچیں اور عورتیں بھڑکیلے لباس پہن کر اپنی حُسن کی نمائش کریں۔

ان کی شاعری میں ایک نظم کا انتخاب کیا جاتا ہے جو براہوئی ادب میں کلاسیک شاعری کے طور پر مشہور ہے :۔

" مسٹرے کرے تینت بہا
اودے پٹ کیو اے خاص و عام
لَب تِفک او گیشترا
اٹیکہ اَلکو مسترا
اِی اُم اَلیوہ الپرا
چاہو عقل تن مَس خام
ہَندا نفع چا گندہ اے
حیا خواجہ نا شرمندہ اے
اے ربِ تعالیٰ مہربان
ایتے پناہ نی والقیان
یا رب رحیم و رحمان
شیطان نا مکر و داماں
آسمان زمین نا نامان
بخشے ننے خُدایا " (۱)

ا۔ شاہوانی، عبدالحمید، "براہوئی زبان وادب"، سارلوان اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 87۔

ریکی

چاغی کی سرزمین مردم خیز ہے۔اس سرزمین نے بلوچستان کے ایسے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جنہوں نے تاریخ میں نام پیدا کیااور ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے جو رہتی دنیا تک یاد کئے جاتے رہینگے۔ چاغی کے اُن سپوتوں میں سے ایک نام ریکی کا بھی ہے۔ براہوئی زبان کے رزمیہ شاعر ریکی کا بچپن کھیل کود اور بکریاں چرانے میں گزرا۔ وہ موسموں کی تبدیلی مثلاً عصر، شام، بادل، گھٹا، بہار و خزاں کی تبدیلی اور قدرت کے فطری نظاروں سے بہت متاثر تھے اور انہی عوامل نے اُسے شاعر بنادیا۔ جب انگریزوں نے بلوچستان میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا تو ریکی نے بلوچ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور ، انہیں جذبہ ہمت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایسے حالات میں اُس نے جو شاعری کی وہ براہوئی زبان کی کلاسیک شاعری کے طور پر مشہور زمانہ ہے۔ اُنکے کلام میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

"دختے نصیر خان ولی برے

ئُلی نیام آن ترہ کرے

اینو عئنے دے دیگرے

پگہ نوا وارس برے

شاباش کبو وا مینگل ئے

باز اُشتر و سیاہ جنگل ئے

ابوئے خُدا انتس کرے

کافر لعین ئے مَست کرے

برخ ئے درے او کم کرے

خوار و غریب حیران مرے

شاہی کہ خروار اُسکہ

مہمان شرف ہم مسکہ

ایمان ہم درست اسکہ

گل بیگ سر و نز تون اسکہ

خوش ءِ احوال ئس ایسونے

ہر کس ئے گوہن درکار مرے

بڑزکو تلار تہ برے

گوہن و کشار گنپرہ

کور اُٹ ڈغارے خنپرہ

ارے عروت جنگ کرے

چِک و تاڑ شروع ارے" (۱)

بشام

بشام بھی براہوئی کے رزمیہ شعراء میں سے ایک مقبول نام ہے۔ انہوں نے بھی انگریز استبداد کے خلاف مینگل قبیلے کی رہنمائی کی۔ بشام کا تعلق نوشکی کے مینگل قبیلے سے تھا۔ 1839ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مینگل قبیلے کا سردار میر ولی محمد شہید ہو گئے۔ گوکہ سردار ولی محمد مینگل کا تعلق وڈھ سے تھا لیکن اس قومی سانحے کا اثر نوشکی کے مینگلوں پر بھی پڑا۔ ایسے میں بشام نے ایک قومی ہیرو کا کردار ادا کرتے ہوئے مینگل قبیلے کی اپنی شاعری کے ذریعے رہنمائی کی۔ انکی شاعری براہوئی کی کلاسیک شاعری ہے۔ انکی رزمیہ اشعار میں سے چند اشعار پیش ہیں:۔

"بُلبُل سر د نز ربابے

بشام نا اُست کبابے

شعر اتیک ملائک

شعر شے حسن رغامک

ہندی او بورس خواہک

بشام تو ہک پاہک

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، "براہوئی زبان وادب"، ساراوان اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 57 ,56۔

باران سخی نا مارے

خوش رنگ و زیب وارے

پال سنجر نا لوارے

حُب توار او شانک

دا امبل ءِ ارے حق

مینگل بد آتے ڈک

شاغا سپاہی تے اندر

اُف تا مَٹ در خور

زغم آتا خواجہ درست اے

زغم پارہ ہِن آن مست اے"(۱)

قیصر خان فقیرزئی

قیصر خان بلوچی اور براہوئی زبانوں میں شاعری کیا کرتے تھے۔1870ء میں لخی میں پیدا ہوئے۔ قیصر نے اپنی زندگی کا خاص حصہ دورِ غلامی میں بسر کیا۔اس شاعر نے دنیا کے دونوں عظیم جنگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ان کی زندگی میں ہی پاکستان (1947) میں معرضِ وجود میں آیا اور پھر یہ عظیم شاعر 1961ء میں فوت ہوا۔

قیصر خان بچپن سے شاعری کا ذوق رکھتے تھے انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ میر علی دوست نے جب انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کی اور انکے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ تو وہ 1932ء میں شہید کردیئے گئے۔ قیصر خان نے شہادت میر علی دوست پر جو نظم کہی وہ نظم براہوئی شاعری میں کلاسیک کا مقام رکھتی ہے۔

" لول کبو لولی میر علی دوست اے

سراوان نا سردار خان علی دوست اے

۱۔شاہوانی، عبدالحمید،"براہوئی زبان ولوب"، ساراوان اکیڈمی، کوئٹہ،1999ء، صفحہ 61 ,60۔

تار ہنا ڈہ تِس پنجگورے
حاکم نا حکم کل ءِ منظورے
دا کسر کاہک شش ثو نا پندے
غازی تا رندان وِتر نا گندے
داکان بھس دا ڈغار چابے
دا مَش آن اے مون زغما تالابے
شیراتے دریکہ اے باز گلٹ کارہ
قسمت اُٹ بدور دُراخ جوڑ دوار
خیُن آ مری نت آن لنگے
پا سخی سلطان کیس ننا پام ءِ
دشمن کہ بسونے دیگر و شام ءِ
نی ریفل خلپیسہ نے اینو انتے
ملخموت شینک تخار غازی تا خنتے
پُرد سیک بسُوبے زب و نالان
سوگ نا کونٹ آتے تُم کبو تالان
آلم تا بہے جاگہ تا دشت ائے
میر نا نصیب جنت و بہشت ائے
دا کتاب ءِ خوانار ملی و ملاک
نصیب نا مُر جنت نا پھُلاک " (۱)

ا۔شاہوانی، عبدالحمید، "براہوئی زبان وادب"، ساراوان اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 92,93,94۔

بلو شاعر

بلو شاعر بھی چاغی میں پیدا ہوئے۔ انکی پیدائش و وفات کے بارے میں معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ بد یہ گو شاعر تھے۔ بلّو نے صرف ایک نظم مثنوی طرز پر کہی ہے۔ یہ مثنوی ضلع چاغی کی المیائی داستان "ماہ گل" کی ہے۔ یہ نظم اس قدر مقبول ہو گئی کہ ساربان راتوں کو اُونٹوں پر سوار ہو کر اس نظم کو خوش الحانی سے گایا کرتے تھے۔ اور بہت سارے لوگوں نے اس کو زبانی حفظ کر لیا تھا۔

اس مثنوی کے اصل کردار "ماہ گل" کے بارے میں یہ معلومات فراہم ہوئے ہیں کہ ماہ گل اٹھارویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں چاغی میں پیدا ہوئی۔ حسین ہونے کی وجہ سے اس کا نام والدین نے پری رکھا لیکن وہ ماہ گل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ماہ گل کے حُسن کا چرچا دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ جب وہ جوان ہوئی تو علاقے کے بڑے بڑے زمیندار اور رئیس ان سے شادی کے خواہشمند تھے۔ اِن اُمراء میں سے ایک نبی بخش نامی شخص خوش قسمت نکلا جنکی شادی خوبصورت ماہ گل سے طے پا گئی۔ شادی ہوئی۔ چند سال خیر و خوبی گزرے۔ گھریلو ناچاقیوں نے سر اُٹھایا۔ میاں بیوی میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے روزانہ کے معمول بن گئے۔ آخر کب تک؟ ان گھریلو جھگڑوں کا علم ماہ گل کی کسی سہیلی کو ہوا۔ سہیلی نے ماہ گل کو مشورہ دیا کہ وہ شیر جان کے ساتھ تعلقات بڑھائے۔ وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آخر کار ماہ گل کے شیر جان کے ساتھ تعلقات استوار ہو جاتے ہیں۔ اس بات پتہ کا خفیہ طور پر ماہ گل کے شوہر کو چل جاتا ہے۔ وہ شیر جان کی تاک میں رہتا ہے اور ایک رات جب شیر جان ماہ گل سے ملنے اسکے خیمے کی طرف آ رہا ہوتا ہے تو نبی بخش جو پہلے سے گھات لگائے بیٹھا تھا خیمے کے قریب آتے ہی شیر جان کو کئی گولیاں سینے پر مار دیتا ہے اور وہیں اس عاشق کو شہادت کا جام نوش کرنا پڑتا ہے۔ نبی بخش کے اس عمل سے ماہ گل بہت رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ جس کا بر املا ماہ گل نے منایا۔ محبت کے اس قتل پر ماہ گل کے شوہر کو جلی کٹی سنائی اور اُسے شیر جان کے ساتھ اپنے تعلقات کا طعنہ دیئے اور کہا کہ مجھے بھی شیر جان کے ساتھ قتل کر دو۔ نبی بخش نے ایسا ہی کیا۔

بہر حال "ماہ گل" میں مثنوی کے جملہ فنی خوبیاں موجود ہیں۔ جس طرح مثنوی میں روانی و سلاست لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح اس مثنوی کی زبان بھی سلیس ہے۔ شاعر نے آخر تک زبان کی صفائی و سلاست کو بر قرار رکھا ہے۔ بیانِ واقعہ اور منظر کشی بھی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ واقعات کو جس طرح سے منظم کیا گیا ہے اس سے واقع کی صحیح تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس منظوم داستان نے براہوئی ادب میں شاہکار کے طور پر نام پیدا کیا ہے۔ جب ماہ گل کو قتل کیا جارہا تھا تو اُس

نے اپنی ساس کو اپنے بچوں کی نگہداشت کیلئے جو کچھ کہا شاعر نے ماہ گل کی ممتا کا منظر نامہ یوں پیش کیا ہے۔(۱)

سلیس تانہ ءِ تینا توار کرے

تانہ چُناتا نی غورے کُنگس

تکی نا چلنداۓ باخوس ارے

اس مثنوی میں براہوئی ثقافت کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں :

" سی گز گدان تو گندار مرے

کہ پھُل و لاڑو و چوٹل مرے

وٹ تا تفوک غُزت ارے

او چوٹل تا زیان کچک اُٹ ارے

نشحو ای زیات خوارث ارے

مُڈی تا سینہ غاۓ سواروک ارے "(۲)

تاج محمد تاجل

براہوئی زبان کے فطری شاعر تاج محمد تاجل کی سنِ ولادت کے بارے میں ادیبوں کی رائے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی انکی سنِ ولادت 1805ء لکھتے ہیں۔(۳) جبکہ بلوچستان یونیورسٹی میں شعبہ بلوچستان اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر اپنی مرتب کلام تاجل میں انکی سنِ ولادت 1833ء لکھتے ہیں(۴) اسی طرح انکی سنِ وفات پر مختلف آراء موجود ہیں بعض انکی وفات 1944ء اور بعض 1948ء تحریر کرتے ہیں۔ بہر حال سنِ ولادت اور وفات جو بھی ہوں براہوئی کے یہ ممتاز فطری شاعر نے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک زندگی پائی۔ اصل نام تاج محمد تخلص تاجل تھا۔ والد کا نام محمد صادق تھا۔ تاجل کے والد زمیندار تھے۔ اسلئے تاجل کے ابتدائی ایام زمینداری میں گذرے۔ تاجل نے ابتداء میں

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، " براہوئی زبان و ادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1982ء، صفحہ 108۔

۲۔ ایضاً، صفحہ 111۔

۳۔ ایضاً، صفحہ 120۔

۴۔ صابر، عبدالرزاق، "کلامِ تاجل"، شال ایسوسی ایشن، کوئٹہ، 1988ء، صفحہ 7۔

کلام پاک کے کچھ آیات حفظ کر لیئے تھے۔(۱) مذہبی گھرانہ ہونے کی وجہ سے انکے کلام میں لاالہٰ اِلااللہ کا جوہر کار فرما تھا۔ اور اسی کیفیت نے انہیں تصوّف کی طرف مائل کیا۔ جب تصوف کا رنگ انکے کلام میں شامل ہوا تو ان کی شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ تاجَل کو شاعر ہفت زبان کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔ ان کا کلام سندھ کے شاہ لطیف بھٹائی، سچل سر مست کے کلام کی طرح بدن میں حرارت اور تحریک پیدا کر دیتا ہے۔ انہی خوبیوں نے انکی شاعری کو کلاسک بنا دیا ہے۔ انکی شاعری اور کلام میں سے چند ایک اشعار پیش ہیں :

" ننے عشق صنم نا رب ستار نصیب کر
نن فقیر ارین زہیر ننے یار نصیب کر
صفت پاک پنجتن نا ننے دربار نصیب کر
سچا یار رسولؐ نا نے ہر چار نصیب کر
عجب باغ چمن گل ننے گلزار نصیب کر
صنم نا خنک نا خُماری ننے دیدار نصیب کر
محبوب عبدالقادر لکھے وار نصیب کر
شہباز جھولے مست شاہو کار نصیب کر
فقیر تاجَل ءِ نی عشق نا اقرار نصیب کر
عجب لوز بولی میم نا سینگار نصیب کر "(۲)

مولانا محمد فاضل دُرخانی

مولانا محمد فاضل نے ڈھاڈر کے قریب مدرسہ دُرخانی کی بنیاد رکھی۔ مدرسے میں اسلامی مضامین براہوئی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ اس مدرسے نے سینکڑوں کتابیں شائع کیں اور کئی نامور علماء پیدا کیئے۔

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، " براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1967ء، صفحہ 120۔
۲۔ صابر، عبدالرزاق، "کلامِ تاجل"، شال ایسوسی ایشن، کوئٹہ، 1988ء، صفحہ 30۔

مولوی محمد صدیق پنجگوری

آپ کا تعلق بلوچستان کے علاقے پنجگور سے تھا۔ آپ کی تصنیف "ذخیرہ سلیمان" موجود ہے۔ اسکے علاوہ آپ نے براہوئی میں بھی غزل لکھے۔(۱)

مُلامزار بدوزئی

آپ نے براہوئی میں شاعری کی۔ آپکی ایک مشہور زمانہ نظم "لاٹ کی بگھی" براہوئی، بلوچی، اُردو اور سندھی میں موجود ہے۔

مولانا عبداللہ دُرخانی

آپ نے عربی، فارسی اور براہوئی میں کتابیں تصنیف کی ہیں جنکی تعداد 7 ہے۔

سید دادن شاہ

تاریخ ولادت معلوم نہ ہوسکی۔ وفات 1933ء ہے۔ بے نمازیوں کی مذمت میں آپکی ایک نظم مشہور ہے۔

شاعر نوراللہ

براہوئی اور بلوچی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ولادت نوشکی میں ہوئی۔

مراد علی رئیسانی

آپ نے بیشمار کتابیں لکھی ہیں جن میں چند مشہور ہوئے مثلاً

گلشن غزلیاں، محمود نامہ، قصہ در الختیار، شان قدرت، تجربات کلیم بلوچستان ترجمہ کریما۔

آپ کی وفات کانک میں ہوئی۔(۲)

مُلاروش الدین

آپ کے حالات زندگی دستیاب نہ ہوسکے۔ آپکی تصنیف غایت النعت 1354 ہجری میں چھپی۔

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء"، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل) جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 61, 62۔

مُلا گہرام

آپ مینگل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ براہوئی میں شاعری کرتے تھے۔

فیض محمد فیضل

1884ء میں گاجان شہر میں پیدا ہوئے۔ آپکا کلام دیوانِ فیض کے نام سے دستیاب ہوا ہے۔

متشرقین نے انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں براہوئی نثر پر توجہ دی ان کی کاوشیں براہوئی ادب میں قدیم نثری ادب کے لیئے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے :۔

لیفٹیننٹ آر لیچ جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں لیفٹیننٹ تھے نے 1838ء میں براہوئی زبان کے گرائمر پر ایک کتاب تحریر کی۔ اسکے بعد دوسری اہم کتاب مولانا اللہ بخش نے "A Hand Book of Brahui Language"، کے نام سے تحریر کی جو 1877ء میں چھپی۔ اس کتاب میں گرائمر کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، کہاوتیں اور حکایتیں بھی درج ہیں۔

اسی سال کیپٹن نکلس نے انگریزی کے کچھ مواد براہوئی میں منتقل کیئے۔ ان میں گرانٹ ڈف کی مرہٹہ تاریخ، نیپیئر کی فتح سندھ کے متعلق اقتباسات شامل ہیں۔(۱)

اسی صدی کے ابتدائی سالوں میں انجیل کے چند براہوئی ترجمے رومن اور نستعلیق رسم الخط میں شائع ہوئے۔

پہلے 1905ء میں رومن رسم الخط میں "یوحنا" کا براہوئی ترجمہ، آنجہانی پادری ٹی جے ایل میئر نے شائع کیا۔ اسکے کل 144 صفحات ہیں۔ پھر 1906ء میں "یوحنا" کا دوسرا براہوئی ترجمہ لدھیانہ سے شائع ہوا۔ 1907ء میں "یوحنا" کا تیسرا ایڈیشن خط نستعلیق میں شائع ہوا۔ انجیل مقدس کے بعض حصوں لوقاتی، مرقس وغیرہ کے براہوئی تراجم انہی ایام میں رومن رسم الخط میں شائع ہوئے لیکن اس مجموعے پر سنِ اشاعت تحریر نہیں ہے۔ 67-1966ء میں ٹی جے ایل میئر کی کتاب "A Brahui Reading Book" کے تین حصے شائع ہوئے۔ اس میں کافی مواد موجود ہے۔ تیسرا حصہ کہانی ہے، 1906ء میں گریسن کی لینگوسٹک سروے آف انڈیا شائع ہوئی اسکے جلد چہارم کے صفحات 619 تا 639 میں براہوئی زبان کا ذکر موجود ہے۔ 1907ء میں جمیعت رائے کی کتاب نوٹس آن دی سٹڈی آف براہوئی لینگوئج "Notes on the Study of

---

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء"، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 81۔

مُلاّ گہرام

آپ مینگل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ براہوئی میں شاعری کرتے تھے۔

فیض محمد فیضل

1884ء میں گاجان شہر میں پیدا ہوئے۔ آپکا کلام دیوانِ فیض کے نام سے دستیاب ہوا ہے۔

متشرقین نے انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں براہوئی نثر پر توجہ دی ان کی کاوشیں براہوئی ادب میں قدیم نثری ادب کے لیئے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے :۔

لیفٹیننٹ آر لیچ جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں لیفٹیننٹ تھے نے 1838ء میں براہوئی زبان کے گرائمر پر ایک کتاب تحریر کی۔ اسکے بعد دوسری اہم کتاب مولانا اللہ نقش نے "A Hand Book of Brahui Language"، کے نام سے تحریر کی جو 1877ء میں چھپی۔ اس کتاب میں گرائمر کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، کہاوتیں اور حکایتیں بھی درج ہیں۔

اسی سال کیپٹن نکلس نے انگریزی کے کچھ مواد براہوئی میں منتقل کیئے۔ ان میں گرانٹ ڈف کی مرہٹہ تاریخ، نیپیئر کی فتح سندھ کے متعلق اقتباسات شامل ہیں۔(۱)

اسی صدی کے ابتدائی سالوں میں انجیل کے چند براہوئی ترجمے رومن اور نستعلیق رسم الخط میں شائع ہوئے۔

پہلے 1905ء میں رومن رسم الخط میں ''یوحنا'' کا براہوئی ترجمہ، آنجہانی پادری ٹی جے ایل میئر نے شائع کیا۔ اسکے کل 144 صفحات ہیں۔ پھر 1906ء میں ''یوحنا'' کا دوسرا براہوئی ترجمہ لدھیانہ سے شائع ہوا۔ 1907ء میں ''یوحنا'' کا تیسرا ایڈیشن خط نستعلیق میں شائع ہوا۔ انجیل مقدس کے بعض حصوں لوقاتی، مرقس وغیرہ کے براہوئی تراجم انہی ایام میں رومن رسم الخط میں شائع ہوئے لیکن اس مجموعے پر سنِ اشاعت تحریر نہیں ہے۔ 67-1966ء میں ٹی جے ایل میئر کی کتاب "A Brahui Reading Book" کے تین حصے شائع ہوئے۔ اس میں کافی مواد موجود ہے۔ تیسرا حصہ کہانی ہے، 1906ء میں گریسن کی لینگوسٹک سروے آف انڈیا شائع ہوئی اسکے جلد چہارم کے صفحات 619 تا 639 میں براہوئی زبان کا ذکر موجود ہے۔ 1907ء میں جمیعت رائے کی کتاب نوٹس آن دی سٹڈی آف براہوئی لینگوئج "Notes on the Study of

---

ا۔ شاہوانی، عبدالحمید، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، ''براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء''، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 81۔

مُلا گہرام

آپ مینگل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ براہوئی میں شاعری کرتے تھے۔

فیض محمد فیضل

1884ء میں گاجان شہر میں پیدا ہوئے۔ آپکاکلام دیوانِ فیض کے نام سے دستیاب ہوا ہے۔

متشرقین نے انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں براہوئی نثر پر توجہ دی ان کی کاوشیں براہوئی ادب میں قدیم نثری ادب کے لیئے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے :۔

لیفٹیننٹ آر لیچ جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں لیفٹیننٹ تھے نے 1838ء میں براہوئی زبان کے گرائمر پر ایک کتاب تحریر کی۔ اسکے بعد دوسری اہم کتاب مولانا اللہ بخش نے "A Hand Book of Brahui Language"، کے نام سے تحریر کی جو 1877ء میں چھپی۔ اس کتاب میں گرائمر کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، کہاوتیں اور حکایتیں بھی درج ہیں۔

اسی سال کیپٹن نکلس نے انگریزی کے کچھ مواد براہوئی میں منتقل کیے۔ ان میں گرانٹ ڈف کی مرہٹہ تاریخ، نیپیئر کی فتح سندھ کے متعلق اقتباسات شامل ہیں۔(۱)

اسی صدی کے ابتدائی سالوں میں انجیل کے چند براہوئی ترجمے رومن اور نستعلیق رسم الخط میں شائع ہوئے۔

پہلے 1905ء میں رومن رسم الخط میں "یوحنا" کا براہوئی ترجمہ، آنجہانی پادری ٹی جے ایل میئر نے شائع کیا۔ اسکے کل 144 صفحات ہیں۔ پھر 1906ء میں "یوحنا" کا دوسرا براہوئی ترجمہ لدھیانہ سے شائع ہوا۔ 1907ء میں "یوحنا" کا تیسرا ایڈیشن خط نستعلیق میں شائع ہوا۔ انجیل مقدس کے بعض حصوں لوقاتی، مرقس وغیرہ کے براہوئی تراجم انہی ایام میں رومن رسم الخط میں شائع ہوئے لیکن اس مجموعے پر سنِ اشاعت تحریر نہیں ہے۔ 67-1966ء میں ٹی جے ایل میئر کی کتاب "A Brahui Reading Book" کے تین حصے شائع ہوئے۔ اس میں کافی مواد موجود ہے۔ تیسرا حصہ کہانی ہے، 1906ء میں گریسن کی لینگوسٹک سروے آف انڈیا شائع ہوئی اسکے جلد چہارم کے صفحات 619 تا 639 میں براہوئی زبان کا ذکر موجود ہے۔ 1907ء میں جمعیت رائے کی کتاب نوٹس آن دی سٹڈی آف براہوئی لینگویج "Notes on the Study of

---

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء"، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 81۔

"Brahui Language" شائع ہوئی۔ اس میں ہمیں براہوئی نثر رومن رسم الخط میں ملتی ہے۔ 1939ء میں ڈینس برے کی براہوئی ڈکشنری شائع ہوئی جس میں اکثر الفاظ جملوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسطرح عام بول چال کے جملوں کے علاوہ اس کتاب میں ضرب الامثال بھی بیان کیئے گئے ہیں۔ اُنکی ایک اور کتاب براہوئی لوک کہانیاں 1939ء میں شائع ہوئی۔ اسمیں براہوئی میں چھ کہانیاں رومن رسم الخط میں تحریر ہیں، جو معہ براہوئی ترجمے کے ہیں۔(۱)

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء"، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 81۔

جدید براہوئی ادب(1947 تا2002)

1947ء کے بعد کے دور کو براہوئی جدید ادب کا روشن ترین دور کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ براہوئی ادب میں جدیدیت کے رجحانات اور رویوں میں ترقی پسندیت اور تبدیلی کا آغاز یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں مختلف مکاتبِ فکر کے علمی وادبی ادارے وجود میں آئے جنہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق سرکاری سرپرستی کے بغیر بھی براہوئی ادب کو دوسری پاکستانی قومی زبانوں کے ادب کا ہم پلہ بنایا۔ اس دور نے براہوئی ادب کے ایسے ایسے مفکرین اور دانشور پیدا کیئے جو جدید براہوئی ادب کے اکابرین میں شمار ہوتے ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل انگریزوں کے دور میں پاکستان کا صوبہ بلوچستان انتظامی طور پر دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا جس کی عملداری انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرا حصہ ریاستی بلوچستان کہلاتا تھا۔ جس پر خان آف قلات حکمران ہوا کرتے تھے۔ تحریک پاکستان ہندوستان کے دوسرے مسلم صوبوں کی طرح یہاں پر بھی زور شور سے جاری رہا۔ جب پاکستان علیحدہ وطن بنا تو بلوچستان کو اُسکا ایک صوبہ بنایا گیا۔ آزاد مملکت کے قیام کی وجہ سے پاکستان کے مختلف قومیتوں کے ادب میں بھی آزادی اظہار کا عنصر بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگا جن میں براہوئی ادب بھی شامل ہے۔

آزاد ملک میں جب دوسری پاکستانی زبانوں نے اپنے اپنے ادب کو ترقی دینے کیلئے کوششیں شروع کیں تو براہوئی زبان کے دانشور اور ادیب بھی اپنی زبان کی ترقی وترویج کیلئے کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اسکے علاوہ کئی اخبارات، رسائل اور جرائد وغیرہ میں بھی براہوئی تحریریں آنے لگیں۔ ماہنامہ معلم، ہفت روزہ نوائے وطن اور ماہنامہ بلوچی وہ پہلے رسائل، اخبارات اور جرائد میں جن میں جدید براہوئی ادب چھپنے لگا۔ وہ رسائل، جرائد اور اخبارات جن میں جدید براہوئی ادب شائع ہوئی تھی انکی مختصر اتفصیل یوں ہے:۔

ماہنامہ معلم

ماہنامہ معلم کا اجراء 1950ء میں کوئٹہ سے ہوا۔ اس رسالے کی ایڈیٹر اور مالک براہوئی زبان کے ممتاز ادیب اور شاعر عبدالباقی دُرخانی تھے۔ معلم کے قلمکاروں میں آغا صادق، میر رحیم داد مولائی شیدائی اور عبدالرحمان کُرد شامل ہوا کرتے تھے۔ ماہنامہ معلم ویسے تو اُردو میں شائع ہوتا تھا لیکن آخر کے چند صفحات پر کبھی فارسی، براہوئی اور بلوچی اور کبھی پشتو کی تخلیقات

کے لیئے مختص تھے۔ یہ رسالہ بارہ سال تک علم وادب کی خدمت کرتے ہوئے 1961ء میں پریس کیلیئے نئے قوانین یعنی پریس آرڈیننس کی وجہ سے بند ہوا۔(۱)

نوائے وطن

ہفت روزہ نوائے وطن کا اجراء 1953ء میں ہوا۔ جدید براہوئی ادب کی ترقی میں ہفت روزہ نوائے وطن کا بہت اہم کردار اور حصہ رہا جو بلوچستان کے جوان اور بے باک ادیب اور صحافی لالا غلام محمد شاہوانی اور عبداللہ جان جمالدینی کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ اخبار بھی کوئٹہ سے شائع ہوتا رہا۔اُردو اور بلوچی کے ساتھ ساتھ براہوئی زبان میں بھی تخلیقات اور مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔نوائے وطن نے 1954ء میں یوسف عزیز مگسی نمبر شائع کیا اسمیں ایک مظلوم لڑکی کی ایک خط شائع ہوئی اس خط کو بہانہ بنا کر اس کی اشاعت پرپابندی لگادی گئی۔(۲)

ماہنامہ بلوچی

جون 1956ء میں آزاد جمالدینی اپنے بھائی میر عبداللہ جان جمالدینی کے معاونت ورفاقت سے ماہنامہ بلوچی کراچی سے شائع کیا کرتے تھے جس میں ادب کے اہم اصناف مثلاً افسانہ آزاد نظم ، ڈرامے وغیرہ بلوچی زبان کے ساتھ ساتھ براہوئی زبان میں بھی چھپتے تھے۔ مئی 1958ء میں آزاد جمالدینی کے خرابئ صحت اور مالی مشکلات کی وجہ سے اس ماہنامے کا اجراء ممکن نہ رہا جس کی وجہ سے اس کی اشاعت کا سلسلہ رُک گیا۔ پھر 1978ء میں کوئٹہ سے اس ماہنامے کا دوبارہ اجراء شروع ہوا جو آزاد جمالدینی کی وفات تک جاری رہا۔کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد تیسری دفعہ یہ ماہنامہ پھر سے عبدالواحد بندیگ کی ادارت میں کوئٹہ سے شائع ہوا جس کی اشاعت اب تک جاری ہے۔(۳)

اس کے علاوہ 1960ء میں ہفت روزہ الکم کا براہوئی زبان میں اجراء ہوا جسمیں براہوئی جدید ادب کے اصناف شائع ہوتے رہے۔ اولس بلوچی 1961ء سے 1989ء تک شائع ہوتا رہا۔اس رسالے میں بھی براہوئی ادب پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ قومی احوال خضدار ، روزنامہ اعتماد کوئٹہ ، روزنامہ شال کوئٹہ 1981ء ، خانہ بدوش 1990ء ، ہفت روزہ کاشتکار ، ہفت روزہ گدان 1992ء ، ہفت روزہ خوشبو ،1990ء میں بھی براہوئی تخلیقات مقالے اور مضامین وغیرہ شائع ہوتے رہے۔

اس عہد کے ادب کی تفصیل کچھ اس طرح ہے :۔

ا۔۲۔۳ شاہوانی، عبدالحمید، ''جدید براہوئی نثری ادب'' سارا وان اکیڈمی، مستونگ،1999ء، صفحہ 52 ,49 ,48۔

حصہ نظم

اس دور میں براہوئی کے بہت سے شعراء بھی سامنے آئے جنہوں نے براہوئی زبان میں شاعری کے نئے نئے اصناف پر طبع آزمائی کی۔اس عہد میں براہوئی زبان میں وطن دوستی، فطرت اور قدرتی نظاروں کی منظر کشی اور دوسری موضوعات پر نئے آہنگ واسلوب کے ساتھ اشعار کہے گئے۔ایسے شعرائے کرام میں عبدالباقی دُرخانی، میر عبدالرحمان کُرد، نادر قمبرانی اور امیر الملک مینگل جیسے شعراء شامل ہیں۔ان شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالباقی دُرخانی

مولانا عبدالباقی دُرخانی مولانا عبداللہ دُرخانی کے فرزند ہیں۔1914ء میں ولادت ہوئی۔آپ نے براہوئی میں شاعری کی ہے۔انکی چند ایک شعری کتاب یہ ہیں :۔

۱۔ترقی نا رفتار :۔ 16 صفحات کے اس منظوم کتابچہ میں ضلع کچھی کی ترقی کا ذکر ہے۔

۲۔ارمان :۔ 32 صفحات پر مشتمل یہ منظوم کتابچہ اردو ترجمے کے ساتھ 1969ء میں شائع ہوا جس میں ایک بچی اپنے باپ سے بازار سے کوئی چیز لانے کی خواہش کرتی ہے۔لڑکی کا باپ بازار جاتا ہے اور بیٹی اپنے والد کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہتی ہے لیکن والد راستے میں قتل کیا جاتا ہے۔اس کتاب میں "بچوں کی فریاد" کے عنوان سے یہ بتایا گیا ہے کہ والد بہت دور روزگار کیلئے گیا ہوا ہے۔کئی دن غائب رہنے کے بعد باپ کی لاش گھر پہنچ جاتی ہے اور گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے۔

۳۔سوغات :۔ 48 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 1972ء میں شائع ہوئی اس میں جدید براہوئی شعراء کا کلام ہے۔(1)

مولانا کا نمونہ کلام پیش ہے :

میر عبدالرحمان کرد

میر عبدالرحمان کو جدید براہوئی شاعری کا سر خیل کہا جاتا ہے۔ میر عبدالرحمان نے جہاں نئے آہنگ میں غزلیں کہی ہیں وہاں انہوں نے رباعیات اور دوسرے شعری اضاف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی ایک نظم جو انہوں نے مزدور کی عظمت پر کہی ہے درج ہے :۔

۱۔براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر،" براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1967ء، صفحہ 149۔

" ہُربو محنت کشے اُست ئی فکر و غم
جان ئی لنگڑیان اَف ساہ و دم
محنت آن خوار و زارے قدم بہ قدم
پیسہ والا کرے اوڑا جور و ستم
او غریبی ئی ڈکال سینا خلوک
لنگڑیان کہ اس تینا بائے ملوک
نیم شام آ اُراٹا او موتے خنو
باردکا جان تو پڈ تہ خالی مرد
پارہ تہ وانا تقدیر نا گوازی ءِ
خواجہ ہندا ئی تینٹ عجب راضی ءِ"(۱)

نادر قمبرانی

نادر قمبرانی براہوئی کے ممتاز ادیب وشاعر ہیں۔ وہ براہوئی کے جدید شعراء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ نادر قمبرانی نے عشق، محبت، سماج، وطن دوستی، فطرت پر بے لاگ شاعری کی ہے۔ نادر قمبرانی بلوچستان یونیورسٹی میں براہوئی کے اُستاد اور پاکستان اسٹڈیز سینٹر کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ یہاں فطرت پر کہی گئی ان کی شاعری کا ایک نمونہ پیشِ خدمت ہے :۔

"روہواتے سیل نا سگینہ تینا بالغا
بادری ءَ پک ننے آخر ہتم ولدا بریک
پٹ و دامانک وا مریرہ خروسی آن ملغزار
بازُن آ درخت آتیا پھُل و بھرم ولدا بریک
اینو دھن بے باکی اُٹ او لاتما لِلّا ہنا
وا ہیتک اُست آ کنا مہرے صنم ولدا بریک

ا۔ گرد، عبدالرحمٰن، میر، شعری مجموعہ " شف گروک "، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 85۔

نرگس آتا خنک تورو کو کسرتا چاری ئ

اوفتا بے بالنگ کے لاڈی نا قدم ولدا بریک"(۱)

امیر الملک مینگل

امیر الملک مینگل براہوئی کے ممتاز شاعر ہیں۔ انکے دو شعری مجموعے "جور نا پھُل" اور "چِلہ نا توبے" شائع ہو چکے ہیں۔ امیر الملک نے براہوئی شاعری میں جدید عنوانات، رویّوں اور واقعات کو موضوع بنا کر براہوئی غزل کو جدید رنگ میں پیش کیا ہے۔ امیر الملک مینگل ایک سیاسی ورکر کے طور پر اُبھر کر سامنے آئے۔ قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ چند سال وکالت کی بطور جج بھی خدمات سرانجام دیں۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی مقرر ہوئے اور تاحال اس مقالہ کے تحریر ہونے تک بحیثیت گورنر بلوچستان خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی ایک غزل پیش ہے:۔

"رہبر و حاکم و مُلّائے خناث

اُستنا وڑد نا درمان متو

تھانہ و جیل و زندانے خناث

اُستنا پورہ چ ارمان متو

باز کاٹم تہ چراغاک کسفر

روشنائی ولے واسکان متو

باز ذگرِ نگا وِتتے شولار

وا ہم وا چِلہ بہاراں متو

اتس اِی کیوہ ۔ کریٹ اتس

اُست صافنگا پریشان متو

جذبہ گر کبک نا اُمیتی آن

عقل اخس جوان مرے جوان متو

ا۔ قمبرانی، نادر، شعری مجموعہ "تشنزہ وگروک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 112۔

یار ، قوم و وطن و راج کہ زند

دوستی کس نا ارزان متو

گل گلزارے امیر نا دفتر

داخہ شعراتن گلستان متو"(۱)

قیامِ پاکستان کے بعد کے دور میں براہوئی شاعری میں جہاں براہوئی غزل کو عروج ہوا وہاں اس دور میں شاعری کے دوسرے اصناف مثلاً نظم، رباعیات، سانیٹ، ہائیکو بھی براہوئی ادب میں متعارف ہوئے۔

براہوئی زبان میں ان نئے اصناف پر طبع آزمائی سے ایک طرف اگر براہوئی ادب نے وسعت اختیار کرلی تو دوسری طرف نئے نئے تخلیق کار بھی سامنے آئے جن کی کاوشوں سے براہوئی ادب کی ترقی کے احکامات مزید روشن ہوگئے۔ ان میں محمد اسحاق سوز، عزیز مینگل، یاسین بسمل، رزاق صابر، قیوم بیدار، حسن غمخوار، عارف ضیاء، افضل مراد اور ظاہر شمیم وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ا۔ مینگل، امیر الملک، شعری مجموعہ "جورنا پھُل"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 34۔

منظوم کتب

قیامِ پاکستان کے بعد درج ذیل شعری کتب جو مختلف شعری اصناف پر مبنی ہیں منظر عام پر آئے۔

۱۔ گواڑخ :۔ یہ کتاب ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے مرتب کی ہے جس میں لوک شاعری کے نمونے ہیں۔ یہ کتاب 1969ء میں

ادارہ ادب

بلوچستان کوئٹہ کی جانب سے چھپی کر منظر عام پر آئی۔

۲۔ احوالِ غم :۔ جوہر براہوئی کے غزلوں کا مجموعہ جو دو حصوں پر تقسیم ہے۔ 1976ء میں چھپا۔

۳۔ قدم قدم آباد :۔ بارڈر پبلسٹی بلوچستان کوئٹہ کی جانب سے 1978ء میں چھپی اسمیں مختلف شعراء کے کلام موجود ہیں۔

۴۔ کلامِ نور :۔ براہوئی ادبی سوسائٹی کی جانب سے 1978ء میں چھپی اسمیں مولانا نور احمد محمد شہی کے کلام کو پروفیسر

خدائیداد گل نے مرتب کی ہے۔

۵۔ چراغِ صابر :۔ ڈاکٹر رزاق صابر کی غزلوں کا مجموعہ جو براہوئی ادبی سوسائٹی نے 1981ء میں چھاپا۔

۶۔ بلسم :۔ مرتب کتاب جو مختلف شعراء کا کلام ہے 1983ء میں چھپی۔

۷۔ دُردانہ :۔ جوہر براہوئی کی غزلوں کا مجموعہ ہے، سن اشاعت ندارد۔

۸۔ مرواری :۔ میر محمد اُلفت کا شعری مجموعہ براہوئی ادبی سوسائٹی نے 1983ء میں چھاپی۔

۹۔ عبدالمجید چوتوئی :۔ مولانا عبدالمجید چوتوئی کی فن شخصیت جسے قیوم بیدار نے تحریر کر کے 1983ء میں چھاپی۔

۱۰۔ دِترئی ہور :۔ انور براہوئی کی غزلوں کا مجموعہ جو 1985ء میں چھپا۔

۱۱۔ گلزار شمیم :۔ ظاہر شمیم کے غزلوں کا مجموعہ جو 1989ء میں چھپا۔

۱۲۔ شمبلاخ :۔ قیوم بیدار کا غزلوں کا مجموعہ جو براہوئی سوسائٹی نے 1989ء میں چھاپا۔

۱۳۔ دروشم نابنا :۔ منظوم مینگل کا شعری مجموعہ جو 1991ء میں چھپا۔

۱۴۔ تلوسہ :۔ عزیز مینگل کا شعری مجموعہ جو 1991ء میں چھپا۔

۱۵۔شنز وگروک :۔ نادر قمبرانی کا شعری مجموعہ جسے براہوئی اکیڈمی نے 1992ء میں شائع کیا۔

۱۶۔مشوشنگ :۔ لوک شاعری جو افضل مینگل کی تصنیف ہے اور براہوئی اکیڈمی نے 1992ء میں شائع کیا۔

۱۷۔گیاوان نا پھُل :۔یاسین بسمل کا شعری مجموعہ جو 1992ء میں شائع ہوا۔

۱۸۔کَسَر نا چاری :۔ مولانا عبدالحق شاہوانی کا شعری مجموعہ جسے عبدالقادر شاہوانی نے مرتب کر کے 1992ء میں شائع کیا۔

۱۹۔جور نا پھُل :۔ جسٹس امیر الملک مینگل کا شعری مجموعہ جو 1992ء میں شائع ہوا۔

۲۰۔سہیل :۔ عاصم فرید جمالدینی کا شعری مجموعہ جسے راسکوہ ادبی دیوان نے 1994ء میں شائع کیا۔

۲۱۔چوٹولی :۔ لوک شاعری جو افضل مینگل کی تصنیف ہے جو 1994ء میں چھپی۔

۲۲۔سیشل :۔ عارف ضیاء کا شعری مجموعہ جسے براہوئی ادبی سوسائٹی نے 1993ء میں شائع کیا۔

۲۳۔دیوان راہی :۔ عزیز راہی کی غزلوں کا مجموعہ جو 1995ء میں شائع ہوا۔

۲۴۔دیوانبرفیچ :۔ براہوئی ہائیکو جسے عزیز مینگل تحریر کیا اور 1995ء میں شائع ہوا۔

۲۵۔ہشل :۔ عزیز مینگل کا غزلوں مجموعہ جو 1995ء میں شائع ہوا۔

۲۶۔جذبات اسلم :۔اسلم پروانہ مرحوم کا غزلوں کا مجموعہ جسے براہوئی اکیڈمی نے 1995ء میں شائع کیا۔

۲۷۔صدف :۔ براہوئی خاتون شاعرہ طاہرہ احساس کی غزلوں کا مجموعہ جسے براہوئی اکیڈمی نے 1995ء میں شائع کیا۔

۲۸۔صف گروک :۔ میر عبدالرحمٰن کُرد کا شعری مجموعہ جو 1996ء میں چھپا۔

۲۹۔توبے ناپتا :۔ حسن غمخوار کا غزلوں کا مجموعہ جسے براہوئی اکیڈمی نے 1996ء میں شائع کیا۔

۳۰۔تجلی :۔ پیر محمد زبیرانی کی صوفیانہ شاعری جسے براہوئی اکیڈمی نے 1996ء میں شائع کیا۔

۳۱۔کامیل :۔ افضل مراد کا شعری مجموعہ جو 1996ء میں چھپا۔

۳۲۔سُنبل :۔ یاسین بسمل کا شعری مجموعہ جو 1997ء میں چھپ کر سامنے آیا۔

۳۳۔برگشت :۔ منظور بلوچ کا شعری مجموعہ جو 1998ء میں چھپا۔

۳۴۔کناُست ناہند :۔ مولانا عبدالخالق لابکی کا البطر ظ (مودہ) جسے مکتبہ لابکی (مدرسہ اشرفیہ مستونگ) نے 1998ء میں شائع کیا

۳۵۔ ٹلوجان :۔ بچوں کیلئے شاعری جو یاسین بسمل کی تحریر ہے اور براہوئی ادبی سوسائٹی کی جانب سے 1998ء میں چھپی۔

۳۶۔اُست ناتوار :۔ پروفیسر عبدالواحد مینگل کا شعری مجموعہ جو براہوئی اکیڈمی کی جانب سے 1999ء میں چھپا۔

۳۷۔ پن ریچ :۔ محمد اقبال ناظر کا شعری مجموعہ جو 1999ء میں چھپا۔

۳۸۔ پھل نا بیگا :۔ عادل نسیم کی بچوں کیلئے نظمیں جو 1999ء میں چھپیں۔

۳۹۔ تیر ونک :۔ عزیز مینگل کی شاعری کی کتاب (رباعیات) جو 2000ء میں چھپی۔

۴۰۔ گڑدولی :۔ عزیز مینگل کی شاعری کی کتاب (رباعیات) جو 2000ء میں چھپی۔

۴۱۔ شگفتی :۔ لوک شاعری جسے افضل مینگل نے 2000ء میں شائع کیا۔

۴۲۔ سمپہ :۔ محمد حنیف مزاج کا شعری مجموعہ جسے براہوئی ادبی سوسائٹی نے 1996ء میں چھاپی۔

براہوئی لوک ادب کے ان نثری ادب کے تفصیل کچھ اس طرح سے ہے :۔

حصہ نثر

اکثر محقق اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ براہوئی جدید ادب کی شروعات 1947 یعنی قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سے ہوتی ہے۔ برصغیر کے بٹوارے کے بعد ہندوستان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اس کا ایک حصہ مذہب کے نام پر الگ ہو کر پاکستان بنا۔ بعد میں ریاستِ بلوچستان کو بھی اس نئے ملک میں ضم کر دیا گیا۔ اس نئے ملک کے شہری و سرکاری ملازم ایک شہر سے دوسرے شہروں کو منتقل یا نقل مکانی کرتے گئے جن میں جہاں سرکاری اہلکار اور مہاجرین شامل تھے وہاں ادیب، دانشور اور شاعر بھی مختلف شہروں اور علاقوں سے آکر بلوچستان میں آباد ہوئے جو براہوئی ادب میں مختلف ادبی اصناف کو روشناس کرانے کا سبب بنے۔

نثری ادب

اس عہد میں درج ذیل نثری اصناف جدید براہوئی ادب میں متعارف ہوئے۔

۱۔ افسانہ ۲۔ ڈرامہ ۳۔ انشائیہ ۴۔ سوانح عمری ۵۔ آپ بیتی

۶۔ سفرنامے ۷۔ تبصرہ نگاری ۸۔ طنز و مزاح ۹۔ سیرت نگاری ۱۰۔ مقالہ نگاری

۱۱۔ ناول نویسی ۱۲۔ تراجم وغیرہ

افسانہ

براہوئی زبان میں افسانے کا آغاز 1954ء سے شروع ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں نوائے وطن، معلم اور ماہنامہ بلوچی جیسے اخبارات ورسائل میں براہوئی زبان کے شروع شروع کے افسانے چھپنے لگے۔ یکم جنوری 1954ء کے نوائے وطن کے شمارے میں براہوئی زبان میں لکھا ہوا امیر ہیبت خان کا افسانہ "مسافر" کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن بعد میں براہوئی لکھاریوں نے اس صنف کی طرف خاص توجہ دی۔ کئی ادیبوں کے افسانوں کے مجموعے شائع ہوئیں۔ مختصر تفصیل اس طرح ہے:۔

ڈاکٹر تاج رئیسانی نے اپنے افسانوں کا مجموعہ انجیر نا پھُل (سال 1982) میں شائع کرواکر براہوئی ادب میں افسانہ نگاری کی بیل ڈالی۔ گل بنگلزئی کے افسانوں کا مجموعہ "درد آتا گواچی" اور "غریب نازند" عارف ضیاء کے افسانوں کا مجموعہ زراب وحید زہیر کے افسانوں کا مجموعہ شنزہ، مہر ناستا، خاتون ادیبہ آمنہ موج کے افسانوں کا مجموعہ بندوک اور ڈاکٹر نصیر عاقل کے پردساز و براہوئی کے معیاری افسانوں کے مجموعے شمار ہوتے ہیں۔

ناول

براہوئی زبان میں تخلیقی ناول لکھنے کو جناب گل بنگلزئی نے رواج دیا۔ تخلیقی ناول نگاری میں گل بنگلزئی پہلے ادیب ہیں جنہیں انکے تخلیقی ناول دریہو پر انہیں صدر پاکستان کی طرف سے صدارتی اعزاز اور نقد انعام دیا گیا۔ اسکے بعد ناول نگاری کے صنف کو بڑھاوا دیتے ہوئے وحید زہیر کا ناول شوم، گل بنگلزئی کے ایک اور ناول روش پیش ڈاکٹر نصیر عاقل کا ناول آزادی ناکسر اور گودی مستنا، نوجوان لکھاری غلام دستگیر صابر کے ماہ گل کی کتاب شائع ہوکر سامنے آئے۔

انشائیہ نگاری

1960-70ء کے عشرے میں جناب کامل القادری نے پہلی دفعہ براہوئی زبان میں انشائیہ نگاری کا کامیاب تجربہ کیا۔ کامل القادری کے اس کامیاب تجربے کے بعد انشائیہ نگاری کی طرف دوسرے ادیبوں نے توجہ دی اور خوبصورت انشائیے تحریر کئے۔ کامل القادری نے براہوئی انشائیوں کا آغاز شروخ نامی کتاب شائع کرواکر کیا۔ پھر اسکے بعد سندھ کے ممتاز براہوئی شاعر و ادیب جوہر براہوئی کے گوریچ اور شکر پھل دو انشائیوں کے مجموعہ شائع ہوئے۔ پروفیسر خدائیداد

گل کے انشائیے "اُٹ مَٹ" کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔ بعد میں حاجی عبدالطیف نے انشائیہ نگاری کے فن پر ایک کتاب تحریر کی۔

ڈرامہ نگاری

قیامِ پاکستان کے بعد 64-1960ء کے دوران بلوچستان کے صدر مقام کوئٹہ میں ریڈیو پاکستان کا قیام ہوا تو کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن سے براہوئی کے ریڈیائی ڈرامے کو دوام حاصل ہوا اور بہت سے مقبول ڈرامے نشر ہوئے۔ اگر ڈرامے کو تیکنیک اور اقسام کے زاویئے سے دیکھا جائے مثلاً ریڈیائی ڈرامہ، اسٹیج ڈرامہ اور ٹی وی ڈرامہ۔ ریڈیو ڈرامہ کے حوالے سے ریڈیو پاکستان کوئٹہ سینٹر سے سینکڑوں ڈرامے جو براہوئی زبان میں لکھے گئے تھے، نشر ہوئے۔ اسکے بعد اسٹیج ڈرامے کو رواج دینے میں براہوئی ادبی سوسائٹی پاکستان کوئٹہ نے اہم کردار ادا کیا۔ اس ادبی تنظیم کے پلیٹ فارم سے 1978ء میں ریلوے کے اکاؤنٹ ہال میں براہوئی کا ایک ڈرامہ ''دیر خواجہ دیر نوکر'' اسٹیج ہوا۔ پھر اسکے بعد ادارہ ثقافت میں دوسرا براہوئی ڈرامہ ''خیال کیرے'' اسٹیج ہوا جس کو عوام کی بڑی تعداد نے دیکھا اور سراہا۔ لیکن کتابی شکل میں صرف غلام نبی راہی مرحوم نے ''اِستو ناہدرغ'' نامی ایک کتاب شائع کیا جسمیں کئی براہوئی ڈرامے موجود ہیں۔ اس کتاب کے بعد آج تک براہوئی ڈرامے کے نام پر کوئی دوسری کتاب شائع نہیں ہوئی لیکن آجکل براہوئی کے ممتاز ادیب اور نوجوان دانشور اور ماہنامہ ''توار'' کے مدیر خادم لہڑی ڈرامے پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ براہوئی کے ممتاز ڈرامہ نگاروں میں تاج رئیسانی، ظفر معراج، افضل مراد، عارف ضیاء، خداداد گل وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مقالہ نگاری

پاکستان کے مختلف شہروں سے نکلنے والے مختلف جرائد ورسائل میں براہوئی زبان وادب پر مبنی کئی پُر مغز مضامین اور مقالے مختلف الخیال ادیبوں اور مفکرین کے شائع ہوتے رہے ہیں جنکے عنوانات براہوئی زبان، ادب اور ادب کی تاریخ، ثقافت، ریاست اور حکومت وغیرہ ہیں لیکن مقالہ نگاری کو عالمی جدید خطوط پر استوار کرنے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی نے پہل کی۔ انہوں نے براہوئی اور اردو زبانوں کے تقابلی جائزے پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر پاکستان میں براہوئی زبان کے اعلیٰ ترین دانشوروں کا اعزاز حاصل کیا۔ دوسرے نمبر پر پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر جنہوں نے براہوئی اور بلوچی زبانوں کے لسانی مماثلت پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ انکے بعد بلوچستان میں تیسرے نمبر پر مقالہ نگار شعبہ براہوئی کے سربراہ پروفیسر عبدالحمید

شاہوانی ہیں جنہوں نے "براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء" پر ایم فل کا مقالہ تحریر کیا اور پی ایچ ڈی کیلئے براہوئی غزل، آغاز اور ارتقاء پر مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ براہوئی زبان کے ایک اور دانشور پروفیسر خدائیداد گل براہوئی افسانے کے آغاز اور ارتقاء پر ایم فل کا مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ ممتاز نوجوان ان ادیب و صحافی جناب خادم لہڑی براہوئی ڈرامہ کی تاریخ اور جائزہ پر ایم فل کا مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ اسطرح براہوئی زبان کے ادیبوں میں عالمی معیار کے مقالہ نگاری کے رجحانات بڑھ رہے ہیں۔

تراجم :۔

عالمی ادب نے براہوئی زبان و ادب پر بہت گہرے نقوش اور اثرات مرتب کیے ہیں۔ عالمی ادب کے مختلف اضاف سے جہاں شعری تراجم براہوئی ادب کا حصہ بنے وہاں عالمی نثری ادب سے بھی بہت سے مواد براہوئی زبان میں منتقل ہوئے جنکی تفصیل اس طرح ہے :۔

انگریزی ناول The Old Man and sea کا پروفیسر عزیز مینگل نے براہوئی زبان میں ترجمہ کیا جسکا نام پرینگا و سمندر ہے۔ افضل مراد نے پولینڈ کے روزے وچ، روس کے پشکن، ارجنٹائن کے نروان گلیمن بھارت کے سر دیشور دیال سکسینہ عرب کے سمیع القاسم، پولینڈ کے تانیکا داشن تارو، اسطرح جاپان، چین، فلسطین، افریقہ، امریکہ، فرانس، واغستان، انگولا، ترقی ، امریکہ، جرمنی اور ویت نام کے عظیم شعراء کے کلام کو یکجا کر کے براہوئی زبان میں "ڈغار ناڈکھ" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ انگریزوں اور نازی جرمنوں کے درمیان دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی حکمتِ عملی کے براہوئی میں مضامین کے علاوہ نوجوان ادیب خادم لہڑی نے دنیا کے مختلف دانشوروں کے لکھے گئے افسانوں کا براہوئی میں ترجمہ کر کے "گنگ وام" کے نام سے کتاب شائع کی لیکن ان باتوں کے علاوہ براہوئی زبان کے ممتاز عالمِ دین، ادیب و شاعر مولانا محمد عمر دیچوری نے 1916ء میں قرآن مجید کا براہوئی ترجمہ کیا اور امام غزالی کے کتاب "یا الھیا الولد" کا براہوئی ترجمہ "نخھوا" کے نام سے 1932-35ء میں کیا۔ انگریزوں نے 07-1906ء میں انجیل مقدس کے باب "یوحنا" کا براہوئی ترجمہ کیا۔

بلوچستان یونیورسٹی میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر جو کہ آجکل بلوچستان سٹڈی سینٹر کے ڈائریکٹر ہیں، نے ارسطو کے بوطیقا کا براہوئی ترجمہ کیا۔ گل بنگلزئی نے ٹالسٹائی کے کچھ افسانوں کا براہوئی ترجمہ "غریب نا زند" کے نام سے کیا جو 1991ء میں شائع ہوا۔

سفرنامے

سب سے پہلے محمد عمر دینپوری نے براہوئی زبان میں سفر نامے کو رواج دیا تھا۔ انہوں نے "ریل نامہ" کے نام سے براہوئی زبان میں پہلی بار سفر نامہ لکھنے کا 55-1931ء میں آغاز کیا۔ اسکے علاوہ براہوئی زبان کے اخبار الم کے ایڈیٹر نور محمد پروانہ نے مشرقی پاکستان کے سفر نامہ 62-1960ء براہوئی میں تحریر کیا۔ لیکن یہ تمام تحریریں اخبارات اور رسائل میں بطور مضامین شائع ہوئیں لیکن سفر نامے کو کتاب کے طور پر متعارف کروانے والوں میں قیوم بیدار سرفہرست ہے، جنہوں نے اپنے سندھ کے سفر نامے کو کتابی طور پر "سیلانی" کے نام سے شائع کروایا۔ اسکے علاوہ ڈاکٹر سرور پرکانی نے اپنا سفر نامہ جاپان براہوئی زبان میں "دے تک نامسافر" کے نام سے 1997ء میں شائع کیا۔

خاکہ نویسی

براہوئی کے ممتاز ادیب اور شاعر جناب افضل مراد نے ممتاز دانشوروں کی خاکہ کشی کی ہے اُنکی یہ کتاب "دروشم" کے نام سے 1998ء میں شائع ہوئی۔ اسکے علاوہ جو نثری کتب براہوئی میں شائع ہوئیں انکی تفصیل یہ ہے :۔

نثری کتب :۔

ا۔ ٹیکی :۔ مختلف موضوعات پر مرتب کتاب براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 1976ء میں چھپی۔ تمام نثری مضامین ہیں۔

۲۔ توشہ :۔ براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 1977ء میں چھپی۔ اسمیں مختلف ادباء کے نثری مضامین ہیں۔

۳۔ دہتاک :۔ براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی کی کتاب جو براہوئی ضرب الامثال پر مبنی ہے۔

۴۔ براہوئی گرائمر :۔ براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی طرف سے ظفر مرزا کی کتاب ہے۔

۵۔ گور بیچ :۔ جوہر براہوئی کی انشائیوں کی کتاب ہے جو 1980ء میں چھپی۔

۶۔ چاچا :۔ براہوئی پہیلیوں کی کتاب جوہر براہوئی اکیڈمی کی جانب سے 1981ء میں چھپی۔

۷۔ انجیر نا پھل :۔ ڈاکٹر تاج رئیسانی کی کتاب جو افسانوں پر مشتمل ہے 1981ء میں چھپی۔

۸۔ شاہی خروار :۔ ڈاکٹر رزاق صابر کی کتاب جس میں براہوئی ضرب المثل ہیں جو 1989ء میں براہوئی ادبی سوسائٹی کی

جانب سے چھپی۔

۹۔ تاریخ بلوچستان :۔ پروفیسر حمید شاہوانی کی تصنیف جسے سارا وان اکیڈمی نے 1995ء میں چائع کیا۔

۱۰۔ رواج :۔ پروفیسر حمید شاہوانی کی کتاب جسے سارا وان اکیڈمی نے 1997ء میں شائع کیا۔

۱۱۔ براہوئی انشائیہ نگاری :۔ جسے لطیف ننگزئی نے براہوئی اکیڈمی کے تعاون سے 1998ء میں شائع کیا۔

۱۲۔ براہوئی پن نا جائزہ :۔ لطیف ننگزئی کی تصنیف جو 1998ء میں چھپی۔

۱۳۔ قدیم براہوئی نثری ادب :۔ پروفیسر قیوم مومن کی کتاب جو 1996ء میں چھپی۔

۱۴۔ جدید براہوئی نثری ادب :۔ پروفیسر حمید شاہوانی کی کتاب جسے سارا وان اکیڈمی مستونگ نے 1999ء میں شائع کیا۔

باب سوئم : براہوئی غزل آغاز و ارتقاء

۱۔ براہوئی غزل کے مآخذ

۲۔ صنفِ غزل کی بلوچستان آمد

۳۔ براہوئی غزل کی ابتداء

۴۔ براہوئی غزل پر دینی اثرات

۵۔ براہوئی غزل قیامِ پاکستان کے بعد

۶۔ براہوئی غزل عہدِ جدید میں

براہوئی غزل آغاز و ارتقاء

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ براہوئی غزل کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ یوں تو براہوئی کے پہلے شاعر مولانا ملک داد قلاتی ہیں جو میر نصیر خان نوری کے دربار سے وابستہ تھے۔ انکا شعری مجموعہ تحفۃ العجائب جسے انہوں نے 1173 ہجری بمطابق 1760ء عیسوی میں تحریر کی ہے۔ بعد ازاں اس مسودے کو مولانا حاجی نبو جان نے 1906ء میں چھپو کر منظر عام پر لایا مگر اس وقت تک کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ براہوئی کے پہلے غزل گو شاعر ملا محمد حسن بنگلزئی ہیں۔ انکے آباؤاجداد قلات کے مختلف حکمرانوں کے ادوار میں مختلف اعلے عہدوں پر فائز رہے خود مُلا محمد حسن ، خان خداداد خان کے دور اقتدار میں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس دوران ایک اور شاعر مولانا عبدالحکیم مشوانی جو انیسویں صدی عیسوی کے آواخر میں گزرے ہیں۔ براہوئی کے غزل گو شاعر ہیں انکی غزلوں کا مجموعہ "چارباغ" کے نام سے موجود ہے جسے ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ ابتدائی براہوئی غزل گو شعراء میں ایک اور معتبر نام مولانا عبدالحمید چوتوئی کا ہے۔ جو براہوئی کے باقاعدہ غزل گو شاعر ہیں۔ اس کے بعد براہوئی غزل میں ایک نام مولانا محمد عمر دینپوری کا بھی ہے جو براہوئی کے ابتدائی غزل گو شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔

براہوئی غزل کے ابتدائی شعراء نے براہوئی غزل میں دینی مسائل، سماجی بے راہ روی پند و نصائح کو موضوع بنایا ہے۔ قیامِ پاکستان 14 اگست 1947ء کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں کے درمیان ذرائع آمدورفت کی ترقی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہمسایہ زبانوں کا ادب ایک شہر سے دوسرے شہر کے عوام تک پہنچا 1960ء میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے قیام سے براہوئی شعراء نے روایتی اصناف کے ساتھ ساتھ براہوئی غزل کے طرف بھی توجہ دی اور براہوئی مشاعروں میں شعراء نئی نئی تراکیب کے ساتھ غزلیں کہنے لگے۔ 1975ء سے پاکستان ٹیلی ویژن کوئٹہ سینٹر نے بھی براہوئی غزل کو ارتقائی عمل سے گزارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سینٹر سے بھی براہوئی شعراء کے غزل فنکاروں کے ذریعے نشر ہونے کے علاوہ براہوئی زبان کے شعراء کے مشاعرے وغیرہ منعقد ہوتے رہے۔ ان مشاعروں میں شعراء نے نہ صرف اچھی غزلیں کہنی شروع کیں بلکہ براہوئی غزل میں نئے نئے مضامین بھی متعارف ہوئے۔

اسی طرح پاکستان کے دیگر شہروں میں چھپنے والا ادب بھی اخبارات و رسائل کی صورت میں بلوچستان کے

ادیبوں اور شعراء کے پاس پہنچنے لگا اور خاص طور پر براہوئی شعراء نے ملک کے دیگر شعراء کی طرح غزل میں نئے نئے تجربات کیئے اور نئے نئے مضامین باندھے۔

براہوئی زبان میں غزل جن ذرائع سے متعارف ہوا ان میں پہلا ذریعہ فارسی ادب میں غزل گوئی ہے جس نے براہوئی غزل گو شعراء کو متاثر کیا اور انہوں نے براہوئی زبان میں نہ صرف غزل کو رواج دیا بلکہ اس صنفِ نے ایک باقاعدہ ادبی صنف کی حیثیت اختیار کی جبکہ دوسرا اور سب سے مؤثر ذریعہ اردو ادب ہے جس نے براہوئی شاعری میں غزل گوئی کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ نشریاتی اور اشاعتی اداروں کے علاوہ نجی مجالس مشاعروں اور شادی بیاہ کے موقع پر گیتوں کے ساتھ ساتھ مقامی فنکاروں نے جدید غزل بھی گائے۔ جن کی وجہ سے براہوئی زبان میں غزل نے ایک نئی جہت اختیار کی اور ابتداء سے ارتقاء کی جانب گامزن ہوا۔

براہوئی غزل کے مآخذ

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ براہوئی سے پہلے بلوچستان میں دوسری زبانوں مثلاً فارسی، پشتو اور اردو میں غزل کی صنف موجود تھی۔ برصغیر کے دیگر علاقوں کی طرح بلوچستان میں فارسی غزل چوتھی صدی ہجری سے متعارف ہوئی۔ اس کے بعد پشتو میں شاعری اور غزل گوئی تقریباً بارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ جبکہ اُردو شاعری کا آغاز 1839ء میں انگریزوں کے بلوچستان پر قابض ہونے کے بعد سے ہوتا ہے۔ انگریزوں کے بلوچستان پر قابض ہونے کے بعد یہاں کا سرکاری زبان اردو قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لوگوں کی یہاں آمد کی ایک بڑی وجہ ریلوے، محکمہ تعلیم اور دوسرے سرکاری محکموں میں ملازمتیں تھیں ان سرکاری ملازمین کی اچھی خاصی تعداد ادیبوں اور شعراء کی بھی تھی جو علم وادب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وہ علمی وادبی مجالس منعقد کیا کرتے تھے۔ ان مجالس اور مشاعروں میں اُردو زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے شعراء کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے مقامی زبانوں کے شعراء نے نہ صرف اس کا اثر قبول کیا۔ بلکہ براہوئی غزل کے مآخذ کے طور پر ان ادبی مجالس اور مشاعروں کو بھی ایک ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ براہوئی زبان کے قریبی اور ہمسایہ زبان پشتو میں بھی غزل قدیم سے مروج تھی اور بلوچستان کے وہ علاقے جو پشتون علاقوں سے متصل ہیں وہاں لوگ پشتو غزل سے واقف تھے اور ان میں جن لوگوں کو شاعری کا شوق ہوتا وہ پشتو غزل سے استفادہ کرتے۔ جس کا اثر بھی براہوئی شاعری پر ہوا۔

یہاں عربی، فارسی، پشتو اور اُردو زبانوں میں شاعری کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں جن کے انداز اور طرز اظہار سے براہوئی غزل نے استفادہ کیا۔ ان زبانوں کی شاعری خاص کر غزل کی تاریخ مختصراً درج کی جاتی ہے۔

بلوچستان میں غزل کی آمد

بلوچستان کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر بر صغیر کی نسبت ایران اور افغانستان کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں بلکہ بلوچستان تہذیبی اور ثقافتی طور پر ایران سے قریب تر ہے۔ اگر بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان پر فارسی زبان کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ چونکہ بلوچستان میں جو نسلیں آباد ہیں انکی زبانیں، پشتو، بلوچی، فارسی، براہوئی زبان بحیثیت مادری زبان کے تو رائج ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی مربوط یا لسانی تحریک بلوچستان میں نظر نہیں آتی اس لئے ان زبانوں میں ایران اور افغانستان کی لسانی تشکیل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بلوچستان میں بولی جانے والی بلوچی زبان قدیم ایرانی زبانوں کے خاندان سے تعلق کی بناء پر فارسی زبان سے بہت قریب اور متاثر ہے۔ بلوچستان میں بولی جانے والی پشتو زبان پر صوبہ سرحد اور دوسری طرف افغانستان کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات نمایاں ہیں۔ براہوئی زبان پر علمائے لسانیات مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ ان علمائے لسانیات میں سے ایک گروہ براہوئی زبان کا آریائی تو دوسرا گروہ جنوبی ہندوستان میں زبانوں کے اہم خاندان دراوڑی خاندان سے تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ اسے اور لتائی تو کچھ سامی خاندان سے بتاتے ہیں۔ براہوئی زبان کا تعلق خواہ کسی بھی لسانی خاندان سے ہو یہ بلوچستان اور بر صغیر کی بہت ہی قدیم زبانوں میں سے ایک اہم زبان شمار کی جاتی ہے۔ زبانوں کی بہتات اور اس رنگینی نے بلوچستان کو ایک اہم اور منفرد مقام عطا کیا ہے۔ تاہم بلوچستان میں فارسی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو سرکاری سطح پر پہنچنے کا کوئی خاص موقع کبھی بھی میسر نہ آیا کیونکہ بلوچستان پر ایران کی تاریخی تہذیبی اور ثقافتی اثرات کی وجہ سے فارسی زبان دربار اور سرکار کی دفتری زبان کے طور پر ہمیشہ متعارف ہوئی اور خوب ترقی کی۔

" اردو باقاعدہ طریقہ سے بلوچستان میں اس وقت رائج ہوئی جب 1877ء میں انگریزوں نے بلوچستان پر تسلط حاصل کیا۔ انہوں نے بلوچستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو ریاستی بلوچستان اور دوسرے کو برٹش بلوچستان کا نام دیکر ان میں حکمرانی کی داغ بیل ڈالی۔

انگریزوں کے تسلط کے بعد 1877ء سے بلوچستان میں دفتری کارروائی اردو میں ہونے لگی یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا اور بلوچستان کی دفتری زبان اردو اور انگریزی رہی "(۱) اس لیئے یہاں شعراء نے بلوچی، پشتو براہوئی فارسی کے

ا۔ فاروق، احمد، پروفیسر، ڈاکٹر، "بلوچستان میں اُردو زبان وادب"، پبلشر بولان اکیڈمی، 1998ء، صفحہ 9۔

ساتھ ساتھ اردو کو بھی اپنایا۔

بلوچستان میں غزل کی تاریخ کو بیان کرنے کے لئے ابتداء میں بلوچستان پر مختلف داخلی اور خارجی اثرات کا مختصراً جائزہ لیا گیا کہ بلوچستان میں مروج تہذیب اور ثقافتی اقدار افغانستان اور ایران سے کس حد تک اثرانگیز ہیں اور ان کے درمیان کس قسم کے لسانی اور ادبی روابط پائے جاتے ہیں۔ یہاں بلوچستان میں غزل کی آمد اور فارسی پشتو بلوچی غزلوں کی مختصراً تاریخ کا اجمالی جائزہ بھی لیا جائیگا۔ جو بعد میں براہوئی غزل کی ارتقاء کے موجب بنیں۔ لہذا فارسی پشتو اور بلوچی ادب کے مختصر تعارف کے علاوہ ان زبانوں کے چند ایک نمائندہ شعراء کی غزلوں کا جائزہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ لہذا سب سے پہلے بلوچستان میں فارسی غزل کی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

فارسی غزل

بلوچستان میں فارسی شاعری اور خاص طور پر غزل کا آغاز رابعہ خضداری کے اشعار سے ہوتا ہے۔رابعہ بلوچستان میں فارسی زبان کی پہلی خاتون شاعرہ ہیں جو چوتھی صدی ہجری میں فارسی زبان کے ہردلعزیز شاعر رودکی کے ہم عصر تھیں۔رابعہ کے بارے میں کوئی خاص تحقیقی مواد دستیاب نہیں ہیں اور انکے متعلق تاریخ نے خاموش زبان اپنار کھی ہے۔البتہ کچھ مضامین اور تذکروں میں انکے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ملتے ہیں۔ بلوچستان کے ایک نامور دانشور جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اُن مختلف تذکروں ، کہانیوں اور مضامین کو یکجا کر کے انہیں بحیثیت فارسی شاعرہ اپنی کتاب "بلوچستان میں فارسی شاعری" میں خاص جگہ دی ہے۔

رابعہ خضدار کے حاکم امیر کعب کی بیٹی تھیں۔ امیر کعب ابو مسلم کے زمانے میں اس سرزمین میں وارد ہوئے۔امیر کعب کا ایک بیٹا حارث اور ایک بیٹی رابعہ تھیں جنکا لقب "زین العرب" مشہور ہے۔حارث اور انکی بہن رابعہ خوبصورت اور نیک سیرت تھے۔جب امیر کعب قریب المرگ تھے تو انہوں نے اپنے بیٹے حارث کو بلا کر نصیحت کی اور رابعہ کے بارے میں خاص تلقین کی اور کہا کہ بہت سارے امیر اور امیر زادے مجھ سے رابعہ کا رشتہ چاہتے تھے لیکن انکے رشتے مجھے پسند نہ آئے۔ اگر تم کو ایک اچھا آدمی ملے تو انکی شادی کروادینا۔ورنہ اسے عزت واحترام سے رکھیں۔والد کے بعد حارث تخت نشین ہوئے۔وہ درباری مصروفیت کے باوجود بھی رابعہ کا بے حد خیال واحترام بجالاتے تھے۔امیر کعب حاکم قزدار (خضدار) تھے، خضدار قلات ڈویژن کا ایک اہم قدیم شہر ہے اور آجکل ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہے اور جھالاوان کے صدر مقام کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ جھالاوان کی تاریخ میں خضدار وہ مقام ہے جہاں سے عربوں اور بلوچوں کے خاص گروہ براہوئیوں کی نسل اتصال کا باعث ہوئے۔ جھالاوان کی تاریخ دراصل خضدار ہی کی تاریخ ہے۔

اس مشہور شہر خضدار میں رابعہ پیدا ہوئی۔وہ بلوچستان میں فارسی کی پہلی شاعرہ کے طور پر تاریخ میں مشہور ہیں۔ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ بچپن سے علمی وادبی ذوق رکھتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چاروں طرف ترک غلاموں کا دور دورہ تھا۔دربار چاہے افغانستان کے حکمرانوں کے رہے ہوں یا ایران وبر صغیر کے حکمرانوں کے، ہر دربار میں ترک

لے آیا۔ معلوم ہوا کہ اُس میں رابعہ کی شاعری رکھی ہوئی ہے۔ حارث نے غلام کو کنویں میں ڈال دیا۔ ایک حمام کو گرم کر دیا گیا کسی فصاد کو بلوا کر اس سے اپنی بہن کی رگ کٹوادی اور اُسے بند کرائے بغیر اُسے گرم حمام میں بند کر دیا گیا۔ حمام کے دروازے کو اینٹ، پتھر اور چونے سے بند کرادیا۔ رابعہ نے ایک کاسہ میں اپنے ہاتھ سے خون لیا اور انگلی خون میں ڈبو کر اپنے اشعار دیوار پر لکھے جب ساری دیوار اشعار سے پُر ہوگئی اور خون بھی لکھنے کے لئے نہ رہا تو اُس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ دختر کعب کو حمام سے نکالا گیا نہلا دھلا کر سپرد خاک کر دیا گیا۔

بکتاش کو کسی طرح جب اس المناک واقعہ کا علم ہوا تو بے حد متاثر ہوا۔ اور موقع کی تلاش میں رہا حتیٰ کہ ایک دن کنویں سے نکل کر باہر آیا اور خفیہ طور پر صبح سویرے حارث کو قتل کر دیا بعد میں رابعہ کے قبر پر آیا اپنے سینے میں خنجر پیوست کر دیا۔ دم توڑنے کے بعد اُسے بھی رابعہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اس مختصر تاریخ سے رابعہ کی زندگی کے حالات اور انکی شاعری کا پتہ ملتا ہے۔ رابعہ ہی بلوچستان میں فارسی زبان کی پہلی شاعرہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اُن کے بعد بلوچستان میں فارسی شاعری کے حوالے سے بہت سے شعراء کے اسمائے گرامی آجاتے ہیں ان میں :۔

۱۔ شے در محمد فشاں۔	۲۔ پیر محمد کاکڑ	۳۔ نور محمد گنجابوی	۴۔ ناطق مکرانی
۵۔ محمد حسن براہوئی	۶۔ ملا فاضل۔	۷۔ فیض محمد کلاتی	۸۔ تائب
۹۔ علیم اللہ علیم	۱۰۔ احمد	۱۱۔ مولاداد	۱۲۔ خاکی
۱۳۔ ہتو جان	۱۴۔ رہی	۱۵۔ شیدا	۱۶۔ یوسف عزیز
۱۷۔ ابوبکر مستونگی	۱۸۔ عبدالعلی	۱۹۔ عابد شاہ	۲۰۔ حنفی
۲۱۔ محمد یعقوب	۲۲۔ گل محمد زیب مگسی		۲۳۔ محمد اسماعیل

رابعہ کی چند ایک غزل پیش کی جاتی ہیں :۔

زبس گل کہ درباغ ماوٰی گرفت

چنین رنگ اثر زنگ مانی گرفت

صبا نافہء مشک تبت نداشت

جہان بوئی قتنک ازچہ معنی گرفت

۱۔ کوثر انعام الحق، "بلوچستان میں فارسی شاعری"، پبلشرز بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 1968ء، صفحہ 21,22۔

۲۔ کوثر انعام الحق، "بلوچستان میں فارسی شاعری"، پبلشرز بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 1968ء، صفحہ 26,27,28۔

غلاموں کو فروخت کرنے کے بعد انہی درباروں میں لایا جاتا تھا۔ ترک غلام اپنی خوبصورتی، گھڑ سواری اور بہادری کے لئے بہت مشہور تھے۔

امیر کعب حاکم خضدار کا بکتاش نامی شخص ایک ترک غلام تھا۔ وہ دربار میں مختلف عہدوں سے ترقی کرتے کرتے فوج کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔ رابعہ کے بھائی حارث جو اپنے والد کی جگہ تخت نشین ہو گئے تھے ایک رات حارث نے رقص وسرور کی محفل آراستہ کیا تھا۔ جس میں خواتین، کنیزیں، رقص وسرور کے ساتھ ساتھ محفل کے مہمانوں کو جام پیش کر رہی تھیں اس محفل میں بکتاش غلام بھی موجود تھے۔ رابعہ کی نظر ان پر پڑی اور وہ اُسے دل دے بیٹھی۔

رابعہ کے عشق کے بارے میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی کتاب ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' میں لکھتے ہیں :

''حارث کا ایک غلام تھا۔ جو اس کے خزانے کا پاسبان بھی تھا۔ زیبائی میں بے مثل تھا۔ وہ حارث کے محل میں آتا جاتا رہتا تھا اور اس کے باغ میں زندگی گزارتا۔ باغ کے سامنے ایک اونچا کمرہ تھا جہاں حارث کا تخت پڑا تھا۔ ایک دن رابعہ چھت پر گئی کچھ دیر تک چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اس دوران اُس کی نظر بلتاش غلام پر پڑی جو مے نوشی اور غزل گوئی میں مصروف تھا۔ اُس پر فریفتہ ہو گئی اور شیفتگی کے باعث بیمار پڑ گئی۔ درمان سے افاقہ نہ ہوا۔ اُس کی ایک چارہ جو دایہ تھی اس نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے پہلے رابعہ نے کچھ نہ بتایا آخر بکتاش کو دیکھتے ہی دل کا واقعہ بیان کیا۔ دایہ نے اس راز کو اخفا میں رکھنے کا عہد کیا۔ رابعہ نے ایک خط میں اپنے جذبات کی عکاسی کی اور وہ خط دایہ کے سپرد کی۔ بکتاش بھی خط پڑھ کر دل دے بیٹھا''(۱)

عشق ومحبت کا سلسلہ جاری ہوا۔ رابعہ شعر لکھ کر بکتاش کو بھیج دیتی اور بکتاش اشعار لکھ کر رابعہ کو روانہ کرتے۔ اس عشق کا رابعہ کے بھائی حارث کو شبہ ہوا اس کے دل میں بہن کے خلاف کینہ اُبھرنے لگا۔ ایک دفعہ حارث کو کوئی لڑائی پیش آئی اس جنگ میں بکتاش کا سر زخمی ہوا اور قریب تھا کہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ایک نقاب پوش لڑکی تیزی کے ساتھ سپاہیوں کے صف میں آئی اور دشمن کے دس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے اور بکتاش کو درمیان سے اُٹھا کر لے گئی۔ اس سے سپاہیوں کا حوصلہ بلند ہوا۔ بے جگری سے لڑے اور دشمن کو شکست دی۔ واپسی پر حارث نے اُس نقاب پوش سوار کو طلب کیا لیکن اس کا کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔ یہ نقاب پوش رابعہ ہی تھی ۔

رابعہ جو اشعار لکھتی بکتاش کے پاس بھیج دیتی اور بکتاش اُن کی شاعری کو صندوق میں بند کر لیتا تھا۔ بکتاش کے ایک دوست کو شبہ ہوا کہ شاید اُس نے اس صندوق میں جواہرات چوری کر کے رکھے ہیں اُس نے صندوق چرا کر حارث کے پاس

ا۔ کوثر انعام الحق، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں فارسی شاعری''، پبلشرز بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1968ء، صفحہ 24۔

لے آیا۔ معلوم ہوا کہ اُس میں رابعہ کی شاعری رکھی ہوئی ہے۔ حارث نے غلام کو کنویں میں ڈال دیا۔ ایک حمام کو گرم کر دیا گیا کسی فصاد کو بلوا کر اس سے اپنی بہن کی رگ کٹوادی اور اُسے بند کرائے بغیر اُسے گرم حمام میں بند کر دیا گیا۔ حمام کے دروازے کو اینٹ، پتھر اور چونے سے بند کرادیا۔ رابعہ نے ایک کاسہ میں اپنے ہاتھ سے خون لیا اور انگلی خون میں ڈبو کر اپنے اشعار دیوار پر لکھے جب ساری دیوار اشعار سے پُر ہو گئی اور خون بھی لکھنے کے لئے نہ رہا تو اُس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دختر کعب کو حمام سے نکالا گیا نہلا دھلا کر سپرد خاک کر دیا گیا۔

بکتاش کو کسی طرح جب اس المناک واقعہ کا علم ہوا تو بے حد متاثر ہوا۔ اور موقع کی تلاش میں رہا حتیٰ کہ ایک دن کنویں سے نکل کر باہر آیا اور خفیہ طور پر صبح سویرے حارث کو قتل کر دیا بعد میں رابعہ کے قبر پر آیا اپنے سینے میں خنجر پیوست کر دیا۔ دم توڑنے کے بعد اُسے بھی رابعہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اس مختصر تاریخ سے رابعہ کی زندگی کے حالات اور انکی شاعری کا پتہ ملتا ہے۔ رابعہ ہی بلوچستان میں فارسی زبان کی پہلی شاعرہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اُن کے بعد بلوچستان میں فارسی شاعری کے حوالے سے بہت سے شعراء کے اسمائے گرامی آجاتے ہیں ان میں :۔

ا۔ شے در محمد فشاں۔	۲۔ پیر محمد کاکڑ	۳۔ نور محمد گنجابوی	۴۔ ناطق مکرانی
۵۔ محمد حسن براہوئی	۶۔ ملا فاضل۔	۷۔ فیض محمد کلاتی	۸۔ تائب
۹۔ علیم اللہ علیم	۱۰۔ احمد	۱۱۔ مولاداد	۱۲۔ خاکی
۱۳۔ ہتو جان	۱۴۔ رہی	۱۵۔ شیدا	۱۶۔ یوسف عزیز
۱۷۔ ابوبکر مستونگی	۱۸۔ عبدالعلی	۱۹۔ عابد شاہ	۲۰۔ حنفی
۲۱۔ محمد یعقوب	۲۲۔ گل محمد زیب مگسی		۲۳۔ محمد اسماعیل

رابعہ کی چند ایک غزل پیش کی جاتی ہیں :۔

زبس گل کہ درباغ ماؤی گرفت

چنین رنگ اژ رنگ مانی گرفت

صبا نافۂ مشک تبت نداشت

چنان بوئی مشک ازچہ معنی گرفت

ا۔ کوثر انعام الحق، "بلوچستان میں فارسی شاعری"، پبلشر زبلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 1968ء، صفحہ 21,22۔

۲۔ کوثر انعام الحق، "بلوچستان میں فارسی شاعری"، پبلشر زبلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 1968ء، صفحہ 26,27,28۔

مگر چشم مجنوں بہ ابر اندر ست

کہ گل رنگ رخسار لیلیٰ گرفت

بہ مئی ماند اندر عقیقین قدح

سر شکے کہ در لالہ ماوئی گرفت

قدح گیر و چغدی ود نیا مگیر

کہ بد بخت شعر آنکہ دنیا گرفت

سر نرگسِ تازہ از سیم وزر

نشان سر تاج کسرئی گرفت"(۱)

نگارا بے تو چشمم چشمہ سار است

ہمہ رو ئیم خون دل نگار ست

جواز دو چشم من دو جوئی داد ی

بہ گرمابہ مرا سر شوئی وادی

سر راہ دارد جہانِ عشق اکنون

یکی آتش یکی اشک و یکی

کنون در آتشِ ود ر اشک ور خون

بر فتم زین جہان دل خستہ بیرون

مرا بے تو سر آمد زندگانی

منت رفتم تو جاوید ان بمانی"(۲)

1-قمبرانی نادر پروفیسر ،بلبل خزذار ،براہوئی اکیڈمی کوئٹہ ،1995ء، صفحہ 45۔

1-2-قمبرانی نادر پروفیسر ،بلبل خزذار ،براہوئی اکیڈمی کوئٹہ ،1995ء، صفحہ 42۔

بلوچستان میں رابعہ خضداری کے بعد ایک اور نام جو فارسی کے ممتاز شاعر گزرے وہ عثمان مختار خضداری ہیں جو رابعہ خضداری کے ہم عصر تھے۔ جن کی شاعری کے بارے میں خاص معلومات نہیں ہیں۔

براہوئی غزل پر فارسی غزل کے اثرات سے متاثر پہلا شخص ملا حسن قلاتی ہے جنہوں نے براہوئی زبان میں پہلی دفعہ غزل کو متعارف کرایا اور اس میں عشقیہ مضامین کو فروغ دیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ براہوئی غزل فارسی غزل سے براہ راست متاثر ہے اور ملا محمد حسن ہی پہلا شخص ہے جس نے فارسی صنف غزل کو نہ صرف براہوئی میں متعارف کرایا بلکہ انہوں نے فارسی اور براہوئی کے علاوہ اردو اور بلوچی میں بھی اشعار کہے۔ لہذا ملا محمد حسن کے فارسی غزلیات ہی براہوئی غزل کے ماخذ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ بعد ازاں براہوئی ادب میں چند ایسے دیگر شعراء بھی تھے جنہوں نے بیک وقت براہوئی اور فارسی میں شاعری کی ہے ان میں عبدالمجید چوتوئی، ملا عبدالحکیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فارسی شاعری کا یہ سلسلہ بدستور قائم رہا۔ عہدِ جدید میں بھی بہت سے شعراء اپنے فارسی کلام کے ساتھ منظرِ عام پر آئے جو درج ذیل ہیں :

ولی پنجگوری، حنفی یعقوب، زیب، فیض، اسماعیل، شیدا، امیر، پرہیزگا، مرباری، آغا صادق، عنقا، محشر، خاوری، عاطفی، ماہر، ناشاد، نجفی، خاور ناگی، مصباح، خوش محمد، انور خان، حافظ خان محمد، سلطان شاہ کاکڑ، قدوس اور عصر حاضر کے فارسی شعراء میں مندرجہ ذیل ہمدم، پیرل، عینی، اختیار، انوری دل، انیس، نظامی، عجب پیشوی، الہامی مجروح، جاغوری، موسوی، قدیری، عسکری، سوز، شرافت عباس۔ اختر، لابکی، نوشاد، شغائی، صدف، مجازی، محبوب، ناصر اور شریعتی وغیرہ۔

پشتو غزل

پشتو زبان ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ بلوچستان میں پشتو زبان کا قندھاری لہجہ بولا جاتا ہے۔ پشتو زبان میں کئی ایک چھوٹے بڑے لہجے ہیں جن میں سے دو بڑے لہجے ہیں جن کو قندہاری لہجہ اور یوسفزئی لہجہ کہتے ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ بلوچستان میں پشتونوں کی آمد کب ہوئی۔ ہمارا موضوع صرف اور صرف بلوچستان میں پشتو غزل ہے۔ بلوچستان کی سرزمین جتنی قدیم ہے اسی سرزمین نے بہت سارے زبانوں اور قوموں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اُن میں سے ایک پشتو زبان اور پشتون قوم بھی ہے۔ پشتون بنیادی طور پر بڑے بہادر، پاک باز، وعدہ کے پکے اور اپنی روائیتوں پر قائم رہنے والی قوم ہے۔ بلوچستان کی قدیم تاریخ اپنے اندر پشتو شاعری کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں کے قبائل اوائل میں جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ اُنکا ہر لمحہ بیرونی حملہ آوروں اور اجنبی حکمرانوں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے میں گزرا۔ پشتونوں نے اپنی فنونِ لطیفہ میں اپنی شاعری پر بہت توجہ دی ہے جسکا اظہار وہ اپنی شاعری میں بھی کرتے ہیں۔ پشتو ادب میں ان ہنگامی اور تاثراتی پہلوؤں کے باوجود انکی شاعری پر رجائیت اور قنوطیت کے یکساں رجحان دکھائی دیتے ہیں اور یہ اثرات زیادہ تر پشتو غزل میں دکھائی دیتے ہیں۔

پشتو میں غزل کی روایت خوشحال خان اور اس کے بیٹوں نے قائم کی اور پھر رحمان بابا کی آفاقی طرز تخیل اور مزاج نے غزل کو بہت ترقی دی۔ اس کے بعد عبدالحمید بابا، کاظم خان شیدا، علی خان، عبدالحنان مرزا، پیر محمد کاکڑ نے پشتو غزل کو فارسی غزل کے ہم پلہ بنادیا۔ پشتو شاعری بیسویں صدی کے اوائل تک قدیم روایات کے تحت پلتی پھولتی رہی۔ لیکن دنیا میں دو عظیم جنگوں کے بعد پیدا ہونے والے واقعات اور حالات نے نئی فکر و شعور کے ساتھ شعری ساخت میں تبدیلیاں بھی پیدا کیں اور غزل آہستہ آہستہ عشقیہ موضوعات سے ہٹ کر زمانے کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہوئی۔ پشتو زبان کے ممتاز قلمکار اور دانشور جناب عبدالکریم بریالئے اپنی ایک مضمون "پشتو شاعری میں جدید رجحانات" جو بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا مجلّہ "سر آب" کے شمارہ اگست 1987ء میں چھپا، میں تحریر کرتے ہیں کہ بلوچستان میں پشتو میں نئی شاعری کی پہلی اور منفرد نام اور آواز ملا عبدالسلام عشق زئی کی ہے۔ اُنہوں نے انگریزی استعمار کے خلاف اور پسماندہ معاشرے کے مذموم کرداروں کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا۔ انہوں نے نئے انداز میں سماج کے تاریک پہلوؤں پر تنقید کی اور لوگوں کی سماجی اور اخلاقی اصلاح کے لئے شعر کہے۔ انکی پہلی دیوان سوسنِ چمن جسے انگریز سرکار نے ضبط کر لیا تھا، بعد میں اُس کی دوسری اشاعت طبع ہوئی، انہوں نے

نہایت بے باکی بے ساختگی کے پیرائے میں واقعاتی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اُنکا طرزِ فکر قدیم اور جدید کے درمیان نہ صرف ایک سنگم کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اپنے مخصوص لہجے میں ایک نئے شعری روایت کا آغاز کیا"۔

اس دور میں ان کے ہم عصر علامہ عبدالعلی آخوندزادہ نے روایتی انداز میں چند شعری تجربات کئے اور حمید بابا کے مکتب سے متاثر ہو کر نئے آہنگ کے ساتھ پشتو غزل کا آغاز کیا۔ انکی بے تکلفی اور بے باکی ایک غالب عنصر ہے جسے اُنکی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپے جذبات کے اظہار میں اشاریت سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ وہ اپنے جذبات واحساسات کا واشگاف انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ انکا اندازِ تغزل عارفانہ مزاج کا متحمل ہے۔ مُلا عبدالسلام اور عبدالعلی کی روایتی موضوعات کو نئے لکھاریوں نے اپنایا جسے معنوی اور فنی اعتبار سے روایت کے ہم پلہ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ البتہ اسلوب کی پرکاری اور جذبات کے لئے عصری تقاضوں سے متاثر رہے۔

اس گروہ میں حافظ خان محمد، مولوی یعقوب، عبدالحمید کاکڑ، مولوی عبدالخالق تارن، مولوی حکیم عبدالخالق، سلطان محمد صابر، کمال الدین شیرانی، ضیاء الدین لاہوری، علی محمد بزگر، محمد خان کاکڑ، محمد رسول فریادی، عبدالغفور پردیسی، عبدالباری اسیر جیسے بہت سے شعراء کے نام شامل ہیں جنھوں نے روایت کی رسی کو مضبوطی سے تھاما اور قدیم و جدید کے امتزاج کو پیش کرنے کی تخلیقی سعی کی۔

اس کے بعد ذرائع ابلاغ اور اشاعتی ذریعوں نے پشتو غزل کو ایک نیا رنگ دیا۔ مشاہدے کی قوت اور مطالعے کی وقعت نے فکری نزاکت اور باریک بینی کے ذریعہ غزل کو ایک نئے رنگ سے روشناس کیا۔ اظہار کا روایتی انداز بدل گیا۔ احساس محرومی اور تکنیکی مادی وسعت کے طبعی افکار پر اپنے اثرات چھوڑے نئ صدی کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ فکری اور واقعاتی علامتوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ انسانی پرستش ہونے لگی۔ جغرافیائی نظریات کے تقاضے اور خارجی سوچ کے دھارے پھوٹنے لگے۔ الفاظ نے اپنے قدیم معنے اور مفاہیم بدل دیئے۔ روایتی فراق اور وصال کا اظہار پیچ سے جاتا رہا۔ محبت، گل اور بلبل کے نئ معانی سامنے آئے۔ سورج چاند گرد اور کوچوں کے استعارات اور علامتوں نے سیاسی شکل اختیار کی۔ غم دوران اور محرومی اپنے حقیقی صورت میں ظاہر ہونے لگی۔ جدید غزل ایک مقصدی علامت کے طور پر اُبھرنے لگی۔ غزل کے کینوس میں وسعت آ گئی۔ غزل نے ہر قسم کے موضوعات کے لئے اپنا سینہ سپر کیا۔ یہاں فکر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک زمانے کی آواز ٹھہری جس میں سیاسی نعرہ بازی نے کھلم کھلا کردار ادا کیا۔ اور دوسری طرف فن اور معانی کے وسعت مزید تقاضوں اور خارجی اثرات کے پیش نظر

پھیلنے لگی۔

اس دور میں غزل کا دائرہ بہت وسیع ہو تا گیا۔ غزل محض عورتوں سے باتیں کرنے تک محدود نہیں رہ سکی بلکہ ذات کی داخلی اور خارجی عوامل کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ جدید شاعری انسانی تقاضوں کے اظہار کے لئے وقف ہوئی۔ اس مجموعی تاثر سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ نئی شاعری نے وقت کے تقاضوں کو لبیک کہا نئے مفاہیم کو پیش کرنے کے لئے آزاد خیالی کو رواج دیا اور پشتو شاعری بے ساختگی اور معنویت نئے علامتی تلازموں کے ساتھ مؤثر پیرائے میں سامنے آئی۔

اس گروہ میں پروفیسر رب نواز مائل نے جدید غزل اور آزاد نظم میں وسیع تجربات کیئے۔ سعید گوہر نے مخصوص پیرائے میں اظہار کرتے ہوئے پشتو غزل کو نئے مفاہیم سے روشناس کیا۔ انکی غزل جدید شاعری کی نمائندہ تخلیق ٹھہرتی ہے۔ سید خیر محمد عارف نے بے ساختگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ صاحبزادہ حمید اللہ کی شاعری اور سادگی ایک مثال ہے۔

پروفیسر سیال کاکڑ نے روایتی لہجے کی پزیرائی کی۔ سرور سودائی نے معنوی اور لفظی جدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابوالخیر زلاند نے دیہاتی لہجے کو نئی شاعری سے روشناس کرایا۔ عمر گل عسکر اظہار کے لطافت کے پیش نظر نئی علامتوں کی تلاش میں ہے۔ عبید اللہ درویش غزل کی معنوی اور فنی وسعت اور نزاکت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ عابد شاہ عابد غزل میں بیباکانہ اظہار اور لطافت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ فاروق اسماعیل زئی آزاد نظم اچھے نمونے سے پیش کرتے ہیں۔ مقدس خان معصوم قدیم اور جدید کے امتزاجی پہلو سے متاثر ہیں۔ ان کے علاوہ نوجوان شعراء بھی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کے علاوہ محمد گل شاہ، خوستی محمد، سہیل جعفر، راز محمد راز، محمود ایاز، عبدالرزاق، نظر پانیزئی، ناشاد وغیرہ وہ اصحاب ہیں جو مستقبل میں پشتو غزل کے حوالے سے پہچانے جائیں گے۔ یہاں پشتو کے چند نمایاں اور نمائندہ شعراء کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے :۔

عبدالعلی اخوندزادہ

غزل

۱۔ دا قصہ دہ رسوا پہ عالم کی — نشتہ مہر و وفا پہ صنم کی

۲۔ ستا پہ عشق کی می ہیچ موندہ نہ کڑہ — فکر دا ودی سومہ پہ غم کی

۳۔ پہ ہنادی دی ہادنہ سوم ہیچ کلہ — لا می غم زیاتوی پہ ہر دم کی

۴۔ پہ ھیجران کی دی ناست پریشان یم	شپہ دودرح تیر دم پہ تور تم کی
۵۔ پہ ژڑااوافسوس می ژوندون دی	دزڑہ توان می دسترگو پہ نم کی
۶۔ دیار عشق دعبدالعلی برخہ	لاپخوادوپہ لوح وقلم کی (۱)

ترجمہ :۔

۱۔ دُنیامیں یہ قیصہ مشہور ہے کہ محبوب میں کوئی مہر وفا نہیں ہے۔

۲۔ تیرے عشق میں میرے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔البتہ میں آپ کے غم میں جل گیا۔

۳۔ کبھی بھی آپ کی خوشی سے میں شاد نہیں ہوا۔البتہ ہر لحہ میرا غم زیادہ ہوتا رہا

۴۔ میں آپ کی جدائی میں پریشان بیٹھاہوں رات اور دنِ اندھیروں میں بسر کرتا ہوں

۵۔ آنسوؤں اور آہوں میں زندگی بسر کررہاہوں آنکھوں کے نم سے ہی میرے دل کو تقویت پہنچی ہے

۶۔ عبدالعلی کے حصے میں محبوب کا عشق لوح وقلم ہی میں لکھدیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحمید خان کاکڑ

غزل

۱۔ چی دَ یار دَ لاس خوار دی ھغہ زہ یم	چی پہ عشق کی ناقرار دی ھغہ زہ یم
۲۔ دَ مجنون رنگہ چی تل سر پہ صحرا دی	چی ھمیش پہ غمو بار دی ھغہ زہ یم
۳۔ چی دَ یار دَ پارہ تل لاس پہ دعا دی	لیونی غوندی ھوشیار دی ھغہ زہ یم
۴۔ چی تمام عمر دَ یار دور گدا دی	چی روان پر لور دَ یار دی ھغہ زہ یم
۵۔ چی دَ ٹول جہان غمونہ پہ سرا خلی	کہ حمید دَ چا پہ کار دی ھغہ زہ یم(۲)

ترجمہ :۔

۱۔ جواپنے محبوب کے ہاتھوں خوار ہے وہ میں ہوں۔جو عشق میں ناقرار ہے وہ میں ہوں

۱۔اخوندزادہ عبدالعلی، دکسی دلمنی پشتانہ لیکوال" اول توک، پروفیسر سیال کاکڑ پشتوادبی دنیاکوئٹہ۔اکتوبر 1974ء صفحہ 138

۲۔کاکڑ، عبدالحمید خان، ڈاکٹر،"دَ کسے دَ لمنی پشتانہ لیکوال"،اول ٹوک، پروفیسر سیال کاکڑ پشتوادبی دنیا۔کوئٹہ اکتوبر 1974 صفحہ 98

۲۔ مجنون کی طرح ہمیشہ صحرا میں پھرنے والا اور جو ہمیشہ غموں میں ڈوبا ہوا ہے وہ میں ہوں

۳۔ جو اپنے محبوب کو ہمیشہ دعا دیتا ہے اور جو مجنون کی طرح عاقل ہے وہ میں ہوں

۴۔ جو ہمیشہ اپنے محبوب کے دروازے پر سائل ہے اور جو ہمیشہ اپنے محبوب کی طرف جا رہا ہے

۵۔ سارے جہان کا غمخوار جو ہے اگر حمید کی کسی کو ضرورت ہے تو وہ میں ہی ہوں

سید عابد شاہ عابد

غزل

۱۔ دَ عاشقی پہ کاروبار پوھیږم ... دَ گل پہ مینہ او پہ خار پوھیږم

۲۔ ولی دَ ښکارہ کرمہ دَ زڑہ داغونہ ... چی پہ گفتار او پہ اِظہار پوھیږم

۳۔ پہ خولہ کہ وائے پروا نہ لری ... زۂ دی دَ سترگو پہ اقرار پوھیږم

۴۔ نن کہ خاموشہ یم حہ وجہ بہ وی ... دَ زمانی پہ ہر رفتار پوھیږم

۵۔ بیا بہ داغونہ دَ بیلتون وانہ خلم ... چی دَ حسینو پہ ہر کار پوھیږم

۶۔ عابدہ پریږدہ دَ عقبیٰ خبری ... اِیلہ دَ حسن پہ اِسرار پوھیږم

ترجمہ :۔

۱۔ میں عشق کے کاروبار کو جانتا ہوں ... پھول کی محبت اور کانٹے کو جانتا ہوں

۲۔ کیوں میں اپنے دِل کے داغ دیکھاؤں جبکہ میں گفتار اور اظہار کو جانتا ہوں

۳۔ اگر منہ سے بول بھی دو کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں آپکے آنکھوں سے اقرار کو جانتا ہوں

۴۔ آج اگر میں خاموش ہوں تو اِس کی ایک وجہ تو ہوگی میں زمانے کے ہر رفتار کو جانتا ہوں

۵۔ پھر کبھی بھی میں جدائی کے داغ قبول نہیں کرونگا کیونکہ میں حسینوں کے ہر کام کو جانتا ہوں

۶۔ چھوڑو عابد اخرت کی باتوں کو ابھی تو یہ مشکل میں حسن کے اسرار جان گیا ہوں

۱۔ عابد، شاہ عابد، سید، "دَکسے د لمنی پښتانہ لیکوال" دوہم ٹوک (پروفیسر سیال کاکڑ، بولان بک کارپوریشن کوئٹہ۔ اپریل 1983ء صفحہ 269

نذر محمد نظر پانیزئی

غزل

سارائی پیغلہ

۱۔ دا سُرائی غاڑہ توری زلفی کج مژکان وینم
زما پہ مخ کی تہ یی ستا پہ مخ کی ټول جہان وینم

۲۔ پیغلہ دَ سارائی کہ سپوږمی پر غرور وانہ یی
ژوند دَ کائینات یی ستا پہ ژوند کی ژوند د حان وینم

۳۔ تہ دَ حُسن مُت یی حُسن دا دَ حان مجبور گنی
روغہ لیونی یی لیونتوب کی دی ہم آن وینم

۴۔ حان تہ باچہی یی باچہی ہم پر خپل حان کوی
تہ بل تہ حیرانہ یی زۂ ټول تاتہ حیران دینم

۵۔ حوک خودی پہ غبرگو لیمو کلہ ہم لیدی نسی
سترگی سمندر ستا سمندر کی ہم توپان وینم

۶۔ زۂ نظر و تاتہ سارائی پیغلی سلام کوم
تہ خو یی با تورہ ستا وجود کی با توران وینم(۱)

ترجمہ :۔ دوشیزہ ءِ صحرا

۱۔ یہ صحراحی نماگردن پہ کالی زلفیں اور یہ کج ابرو دیکھ رہاہوں
میرے سامنے آپ ہیں اور آپ کے چہرے میں سارا جہان دیکھ رہاہوں

۲۔ تو کیادوشیزہ ءِ صحرا ہے کہ ایک چاند پہاڑوں کے چوٹیوں پر روان ہے

۱۔ کاکڑ، سیال، پروفیسر، "دَ کسے دَ لمنسی پشتانہ لیکوال" دویم ٹوک، پروفیسر سیال کاکڑ، بولان بک کارپوریشن، کوئٹہ اپریل1983ء، صفحہ 686-685۔

سارے کائنات کی زندگی ہے تو اور تیری زندگی میں، میں اپنی زندگی دیکھ رہا ہوں

۳۔ تو حسن کی دیوی ہے اور حسن خود تیرے سامنے مجبور ہے۔ پوری پگلی ہو

تیرے دیوانہ پن میں بھی ایک آن نظر آتا ہے

۴۔ تو ایک بادشاہت ہے اور حکمرانی بھی اپنے آپ پر تو دوسروں کو

دیکھ کر حیران ہے جبکہ میں تمام لوگوں کو تجھ پہ حیران دیکھ رہا ہوں

۵۔ کوئی تجھے سمجھ سکتا نہیں۔ تیری آنکھیں سمندر ہیں اور

سمندر میں بھی طوفان دیکھ رہا ہوں

۶۔ اے دوشیزہءِ صحرا انظر تجھے سلام کہتا ہے۔ کیونکہ تو ایک

بہادر ہے اور تیرے وجود میں بہادروں کو دیکھ رہا ہوں۔

کچھ ایسے ذواللسان شعراء بھی ہیں جنھوں نے بیک وقت پشتو اور براہوئی میں غزلیں کہی ہیں۔ یوں تو ملک داد قلاتی کو براہوئی شاعری میں اولین صاحب تصنیف شاعر کی حیثیت حاصل ہے اور براہوئی کی علاوہ اُن کا کسی اور زبان میں کلام دستیاب نہیں تاہم اُن کا پشتون نسل سے ہونا اور پشتو زبان وادب سے واقفیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے گمان کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے براہوئی کے علاوہ پشتو میں بھی شاعری کی ہوگی اور اس کے بعد ایک اور معتبر نام ملا عبدالحکیم مشوانی کا ہے جس نے اپنی تصنیف چارباغ میں براہوئی اور پشتو میں ہمہ وقت غزلیں کہی ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنکی وجہ سے براہوئی غزل براہ راست پشتو شاعری اور غزل سے متعارف ہوتی ہے اور اس کا اثر قبول کرتی ہے۔

اُردو غزل

شاعری اور خاص طور پر اُردو غزل کو براہوئی غزل کا ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلوچستان میں اُردو شاعری کی روایت انیسویں صدی میں پڑ چکی تھی۔ مُلا محمد حسن بنگلزئی، گل محمد زیب مگسی جیسے نامور اور قادرالکلام شعراء کی اردو شاعری نے بر صغیر میں اردو شاعری کے فروغ اور ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اردو شاعری میں یہاں کی رعنایت، تہذیب اور سماجی اقدار کی زبردست سرپرستی کی۔

انگریزوں کی آمد یا قبضے کے بعد انگریزوں کی طرف سے بلوچستان میں مختلف النوع قسم کے محنت و مزدوری یا ملازمت کے پیش نظر ہندوستانی لوگوں کا رجوع بلوچستان کی طرف ہوا۔ انگریزوں کی قبضے یا پھر برصغیر پاک و ہند کے بٹوارے، 14 اگست 1947ء کے بعد بھی ہندوستان سے بالعموم اور نوزائیدہ ملک پاکستان سے بالخصوص بسلسلہ ملازمت لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان لوگوں میں جہاں محنت و مزدوری یا ملازمت پیشہ افراد کی پاکستان کی مختلف شہروں سے بلوچستان منتقلی ہوتی رہی تو وہاں ان لوگوں میں ادیب و دانشور، شاعر اور صحافی بھی بلوچستان منتقل ہوئے۔ خاص کر قیامِ پاکستان کے بعد بلوچستان میں اردو شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا جس میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے مقامی شعراء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہی شعراء اور ادباء نے ہندوستان کی ٹوٹ پھوٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جہاں انکی شاعری میں جاذبیت، جمالیاتی احساس، قدیم و جدید کی امتزاج دکھائی دیتی ہے تو انکی شاعری میں لکھنؤ، دہلی، لاہور، کوئٹہ میں انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل، مذہب کا مذہب سے نفرت، عبادت گاہ کو عبادت گاہ سے تعصب کا اظہار بھی نظر آتا ہے۔ شاعری میں جمالیاتی احساس، فکری تقاضوں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ سیاسی نظریات کی پرچار اور انسان کا انسان سے دوستی کی درس نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے استاد پروفیسر خلیل احمد صدیقی اور شضحی یہاں ادبی سلسلے کی آبیاری میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے پروفیسر انور رومان، تراب گوالیاری، سید خلیل احمد، ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ملکر مختلف اظہار نظر سے ادبی اداروں کی بنیاد رکھی۔ اسی دور میں یہاں دو تحریکیں وجود میں آئیں۔ ایک "مرکز ادب" اور دوسرا "ارتقائے ادب" تھے۔(۱)

1- فاروق احمد، ڈاکٹر، "بلوچستان میں اردو زبان و ادب"، بولان اکیڈمی، کوئٹہ، 1998ء، صفحہ 12۔

آغا صادق ایک پختہ کار شاعر تھے۔ اپنے کلام میں اقبالیات کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر شاعری میں قدیم رجحانات کے ساتھ جدید فکری روح پھونکی بزم ارتقائے ادب کی نشستیں پوسٹ ماسٹر کوئٹہ سید غلام محمد شاہ مرحوم کے گھر ہوا کرتے تھے۔ ان ادبی نشستوں میں دوسروں کے علاوہ پروفیسر خلیل صدیقی، اثر جلیلی، شعیب حزیں، ارشد امروہوی، اور اخگر سہارن پوری کے علاوہ ناز اکبر آبادی، سید علی نظامی، قتیل سیالکوٹی، رشید نثار بھی بلوچستان میں اردو شاعری کی آبیاری کر رہے تھے۔

اثر جلیلی ایک منفرد اور خاص لہجے کے شاعر کے طور پر آگے آئے۔ انکی شاعری میں مرثیہ، نظم بھی غزل کے علاوہ مقبول ہوئے۔ انہوں نے غزل کو تجربہ گاہ کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ انہوں نے تراب گوالیاری کی طرح اپنی شاعری میں سودا، حالی اور حسرت کی تخیل کشید کی۔

ارشد امروہوی، اخگر سہارنپوری نے بھی غزل کی قدیم روایات کے برقرار رکھ کر بلوچستان میں اردو شاعری کے کلاسیکی مزاج کی ترویج کی۔ ان دو ادبی تحریکوں سے ہٹ کر اور بھی لوگ شاعری کے میدان کے شاہ سوار تھے۔ ان میں ماہر افغانی جیسے لوگ جو اردو کے نشاطیہ شاعر کے علمبرداروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی شاعری میں رندی، سرمستی، زاہد ورند کی تکرار میں فارسی غزلیت کے مزاج کو دوام دیا اور بہت ہی خوب صورت غزلیں کہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "کُن فیکون" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ماؔہر تین زبانوں انگریزی، اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان تینوں زبانوں میں ان کی شاعری کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ماہر افغانی کا طرزِ اظہار استاروال، شستہ اور غنائیت سے بھرپور تھا کہ غزل کی تغزل پوری طرح اُبھر کر سامنے آ جاتا تھا۔(۱)

ان شعراء کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری اور خاص کر غزل نے خوب ترقی کی۔ عصر حاضر کے اردو شعراء میں عطا شاؔد، شرافت عباس، حاوی اعظم، اوریا مقبول جان، عرفان احمد بیگ، بیرم غوری، محسن شکیل، افضل مراد فاروق فیصل، اعتبار ساجد محسن چنگیزی مشہور شاعر ہیں۔ براہوئی اور اردو کے ایسے ذواللسان شعراء کی ایک کثیر تعداد ہے۔ جنہوں نے مختلف ادوار میں اردو اور براہوئی میں غزلیں کہہ کر براہوئی غزل کو نئے مضامین اور افکار سے مالا مال کیا ہے۔ ایسے ذواللسان شعراء میں پہلا اور معتبر نام ملا محمد حسن کا ہے۔ جنہوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں بلوچستان میں نہ صرف براہوئی زبان میں

۱۔ فاروق احمد، ڈاکٹر، "بلوچستان میں اردو زبان وادب"، بولان اکیڈمی، کوئٹہ، 1998ء، صفحہ 38,39۔

غزل کو متعارف کرایا۔ انہیں اردو شاعری اور خاص طور پر غزل گوئی میں ولی دکنی کا ہم عصر اور ہم خیال کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد جن براہوئی شعراء نے اردو اور براہوئی میں بیک وقت شاعری کی ہے ان میں صوفی شاعر تاج محمد تاجل اور ملا مزار بدوزئی قابل ذکر ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے لیکر اب تک ایسے شعراء میں گل خان نصیر، عبدالرحمٰن کرد، نادر قمبرانی، امیر الملک مینگل۔

اور ان کے علاوہ دورِ جدید کے نوجوان براہوئی شعراء کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو براہوئی اور اردو میں بیک غزل کہہ رہے ہیں ان میں افضل مراد، وحید زہیر، غلام دستگیر صابر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان سب شعراء کی شاعری اور خاص طور پر براہوئی زبان میں غزل گوئی اُردو غزل سے براہ راست متاثر ہے۔

بلوچی غزل

جدید بلوچی شعری ادب کا آغاز غزل گوئی سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بلوچی ادب غزل جیسی صنف سے محروم تھی۔ سب سے پہلے بلوچی میں غزل گوئی کا آغاز کراچی کے رہنے والے بلوچ شاعر ملنگ شاہ بابا نے کیا۔ جس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں لیکن وفات 1344ء ہجری ہے۔ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ بھی معلوم نہیں کہ بلوچی شاعر ملنگ شاہ بابا نے کس عمر سن یا سال میں غزل گوئی شروع کی۔ یہ بھی دست برد زمانہ سے نہ بچ سکے۔ لیکن ایک رائے کے مطابق ملنگ شاہ بابا نے اپنی غزل گوئی کا آغاز 1922ء سے کیا۔ بلوچی کے ساتھ ساتھ ملنگ شاہ اردو میں بھی شاعری کر چکے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی بھی دیوان دستیاب نہیں ہے جو بطورِ ثبوت یا تصدیق کے پیش کیا جاسکے۔ (ا)

کراچی جیسے شہر میں رہتے ہوئے بھی اُن کا مجموعہ کلام نہ چھپ سکا۔ انکی جتنی بھی غزلیں لوگوں تک پہنچی ہیں اُن کے مریدوں کی توسط سے آئی ہیں کیونکہ ان کی عقیدت منداور مرید اُنکے کلام کو زبانی یاد کر کے گایا کرتے تھے۔ چونکہ اکثر گانے والے حضرات اَن پڑھ ہوا کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں کئی ایک غلطی بھی واقع ہوئی ہیں۔ ملنگ چونکہ جواں مرگ تھے وہ اپنی زندگی کے صرف پینتالیس بہاریں دیکھ سکے۔ ذہنی پریشانیوں اور ذہنی الجھنوں نے انہیں فالج کا شکار کر دیا۔ بستر علالت پر جس دیکھ بھال اور توجہ کی ضرورت تھی وہ انہیں میسر نہیں آئی۔ وہ اپنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسی موقع پر انہوں نے اپنی بلوچی کی یہ مشہور غزل کہی۔

”من مراں کبر ءَ منیگ ءَ چوک ءَ چار راہ کن اِت
گریوگ ءِ بدل ءَ منیگ ءَ چاپ ءَ نازینک ءَ جن اِت“۔

ترجمہ :۔ میرے وفات کے بعد میری کسی چوراہے پر بنوادو۔ رونے دھونے کی بجائے شادیانے بجاؤ اور خوشی کے گیت گاؤ۔

ان کی عمر اگر وفا کرتی تو شاید آج ملنگ شاہ کسی بڑے اور ضخیم دیوان اور مجموعہ کلام کے مالک ہوتے۔ ایک بلوچی غزل کا مطلع ملاحظہ کریں۔ جس سے اُنکی ذہنی وسعت اور تاریخ سے وابستگی معلوم ہوتی ہے۔

ا۔ ہاشمی، ظہور شاہ، سید، ”بلوچی زبان و ادب کی تاریخ، پبلشر سید ظہور شاہ ہاشمی اکیڈمی، کراچی، 1986ء، صفحہ 125,126۔

"یک دو روچی ھست اے دنیا اعتبارے چی نیست
آ کج انت سلطان سکندر یادگارے چی نیست "۔

ترجمہ :۔ یہ دنیاایک دودن کے لئے ہے۔اس پر زیادہ اعتمادواعتبار نہ کرو۔
آج کہاں ہے سکندر شان والے آج اُن کا کوئی یادگار تک نہیں ہے۔

اپنی ایک اور مشہور غزل کی ابتداء یوں کرتے ہیں :۔

"اپسوز ہزار سال گِنداں نہ گِنداں دوست ءَ "۔

ترجمہ :۔ افسوس صد ہزار افسوس اور ارمان ہے کہ دوست کو دیکھتے ہوئے بھی دیکھ نہیں پاتا۔
عشق کے درد کا حقیقتاً اور واقعتاً کوئی درمان اور علاج نہیں کہ دوست یا اپنے محبوب کو
دیکھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا"۔

جب تک ملنگ بابا زندہ تھے کسی دوسرے جدید غزل گو شاعر کا نام سننے میں نہیں آیا۔اُنکی وفات کے بعد کئی سالوں تک انتظار کے بعد جدید رنگ و آہنگ میں نعت گو شعراء پیدا ہوئے۔ پھر چند ایک غزل گو شعراء بھی پیدا ہوئے جن میں عبدالحکیم حقگو اور محمد خان جنگی کے نام آتے ہیں۔الغرض یہ کہ ملنگ بابا کے وفات سے قیامِ پاکستان تک کوئی خاص اور قابلِ ذکر بلوچی غزل گو شاعر پیدا نہیں ہوا۔پاکستان بننے کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے پہلی بار بلوچی زبان میں نشریات کا آغاز ہوا تو وہ بلوچ شعراء جو اس سے پہلے اپنی کیفیتوں اور جذبات کا اظہار اردو زبان میں کرتے تھے یا وہ لوگ جو شاعری سے لگاؤ رکھتے تھے انہوں نے اسی طرف توجہ دینی شروع کر دی اور بلوچی زبان میں اشعار کہنے لگے۔

وہ شعراء جو اس سے پہلے اردو زبان میں شاعری کیا کرتے تھے اور 1949ء سے بلوچی میں شاعری کرنے لگے۔ان میں محمد حسین عنقاء، میر گل خان نصیر، آزات جمالدینی قابلِ ذکر ہیں۔بعد میں میر گل خان نصیر ملک الشعراء کہلانے لگے۔ کراچی سندھ سے بلوچی کے نامور شعراء میں محمد قاسم ھوت، قاضی عبدالرحیم صابر، دوست محمد بیکس، اسحاق شمیم جیسے شعراء کے علاوہ دوسرے شعراء بھی پیدا ہوئے۔ جن میں اسماعیل ساجدی، محمد حسین عاجز، محمد حسن تاج، احمد زہیر، احمد جگر بھی میدانِ شاعری میں کود پڑے۔ کہا جاتا ہے اگر ریڈیو پاکستان کراچی بلوچی پروگرام نشر نہ کرتا تو شاید بلوچی زبان اور ادب کے جدید دور کی ابتداء 1960ء سے ہوتی کیونکہ 1960ء کے بعد ریڈیو پاکستان کے قیام کے بعد عوام میں زبان کی اہمیت کا احساس پیدا ہو

چکا تھا۔ اسی عشرے میں بلوچ نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد گاؤں کے اسکولوں سے نکل کر کالجوں میں پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نکل پڑے۔ اُن میں شعور جاگ گیا اور انہی نوجوانوں نے بلوچی زبان ادب کے ساتھ ساتھ بلوچوں کے قومی کلچر کو اجاگر کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس وقت کے نوجوانوں میں غفار ندیم، کریم دشتی، عطاشاد، صدیق آزات، نسیم دشتی جیسے شعراء اور نثر نگار شامل تھے۔

جدید بلوچی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے ہی ہوئی تھی جس پر فارسی کے اثرات واضح اور مستحکم نظر آتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بلوچی شعراء نے اردو شعراء کے دیکھا دیکھی بلوچی میں غزل کہنی شروع کیں۔ بلوچستان پر ایران کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، جغرافیائی، سماجی، تاریخی اثرات صدیوں سے نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانے ہیں۔ بلوچستان کے حکمرانوں کے دور میں سرکاری زبان بھی فارسی تھی۔ جو انگریزوں کے دور تک بلوچستان میں مروج رہی۔ یہ ضروری تھا کہ بلوچی پر فارسی زبان جو قدیم ایرانی زبانوں کے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے اور خاص کر بلوچی زبان کا فارس قدیم سے تعلق کی بناء پر اس زبان کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔ تیسری وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ فارسی اور بلوچی کا بہت پرانا رشتہ ہے اگر بلوچی غزل میں فارسی کے اثرات تسلیم کر بھی لیئے جائیں۔ اگر بلوچی غزل پر اردو کے اثرات کو صحیح اور درست مان بھی لیا جائے تو دونوں صورتوں میں ایک بات سامنے آجاتی ہے کہ اردو غزل فارسی ہی کی مرہون منت ہے۔ ظہور شاہ ہاشمی کہتے ہیں کہ :

> ''اس حقیقت سے انکار کرنا امر واقع سے چشم پوشی ہوگی اردو غزل گوئی صد در صد فارسی کی نقل ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اردو غزل گوئی پاک و ہند سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی ہے۔ ہر ایسے فن کا اپنا جداگانہ مزاج ہونا ضروری ہے لیکن اردو غزل کا مزاج بالکل ایرانی ہے''۔

علاوہ ازیں اس میں فارسی کی تیارہ شدہ بندشیں، محاورے، استعارے اور عام الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ایک اچھی اردو غزل میں ماسوائے ''کا''، ''کے''، ''کی'' اور ''کرنا''، ''جانا'' جیسے افعال ہندی الاصل کوئی اور لفظ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر کسی شاعر نے دیدہ دانستہ کوشش کر کے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے۔

فارسی کے علاوہ عربی کے وہ تمام الفاظ بھی مستعمل ہیں جو فارسی ادب میں رائج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہہ

سکتے ہیں کہ بلوچی جدید شاعری بھی اردو کی طرح فارسی غزل کی تقلید کرنے سے شروع ہوئی۔ ابتداء میں اردو ہی کی طرح غزلوں کا مزاج انکی بندشیں اور خیالات تک فارسی غزل کی تقلید میں اپنے آپ سے دور بھٹکتی رہی۔ 1950ء میں کہیں جاکر چند ایک شعراء نے اس کی دستگیری کے لئے ہاتھ بڑھایا تو آہستہ آہستہ وہ اپنا صحیح روپ بڑھانے لگی اور غزل جیسی چیز جس سے بلوچی ادب کلچر اور مزاج قطعاً بیگانہ تھی۔ اب کوئی اجنبی سی معلوم نہیں ہونے لگی چنانچہ آج ان پچاس سالوں کی مختصر عرصے میں بلوچی زبان میں بہترین غزل گو شعراء پیدا ہوئے کہ جنکی غزلیں کسی بھی تہذیب اور ترقی یافتہ زبان کی غزلوں کے مقابلے میں کم نظر آتیں۔ اس حیرت انگیز ترقی کا سب سے بڑا سبب خود بلوچی زبان ہی کی بلاغت اور فصاحت اور اُسکی ڈکشن کی ضخامت ہے چنانچہ شعراء کسی بھی زبان سے الفاظ کا سہارا لیئے بغیر خالصتاً بلوچی میں مکمل طور پر اظہار کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں بلوچی غزل کے بارے میں بلوچی ادب کے قاری نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ یہ صنف بہت ہی مقبول ہے۔ چنانچہ غزل کے میدان میں نوجوان شعراء نے بڑھ چڑھ کر دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اُن میں بہترین غزل گو شعراء اُبھر کر سامنے آئے۔ ان میں انور صاحب خان، کریم دشتی، میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، ظفر علی ظفر، غنی پرواز، اسماعیل ممتاز اور برکت اللہ شامل ہیں۔

اگر جدید شاعری کا صنفی جائزہ لیا جائے تو یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ شاعری کے مختلف اصناف میں بلوچی غزل نے نمایاں ترقی کی ہے اور اس کے ترقی کے امکانات مزید روشن بھی ہیں۔ 1950ء سے پہلے غزل پر مختلف انداز میں طبع آزمائی ہوتی رہی ہے جو ٹیکنیک کے اعتبار سے پوری طرح غزل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں مگر جب سے بلوچی زبان میں ادبی رسائل نکلنا شروع ہوئے ہیں، تب سے بلوچی غزل صنفی اعتبار اور فنی لحاظ سے مستحکم ہوتی گئی۔ (۱)

بلوچی کا پہلا ادبی ماہنامہ "اومان" 1951ء میں مولانا خیر محمد ندوی کی ادارت میں کراچی سے چھپ کر سامنے آیا تو بلوچی زبان کو لکھنے کے لحاظ سے مضبوط بنیادیں میسر ہوئیں۔ اس کے بعد ماہنامہ "بلوچی" جس کے مدیر عبدالواحد آزاد جمالدینی تھے 1960ء سے کراچی سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ان دونوں رسائل نے بلوچی نثر اور شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دوسری ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ غزل لکھنے کا باقاعدہ سلسلہ انہی رسائل سے چل نکلا۔ ماہنامہ بلوچی نے غزل کو خصوصی اہمیت دی اور "چکاس بند" دے کر شعراء کی توجہ غزل کی جانب متوجہ کرائی۔ ان رسائل سے پہلے کراچی سے ریڈیو

ا۔ ہاشمی، ظہور شاہ، سید، "بلوچی زبان وادب کی تاریخ، پبلشر سید ظہور شاہ ہاشمی، کراچی، 1986ء، صفحہ 129۔

پاکستان نے 1948ء میں جب بلوچی نشریات کا باقاعدہ آغاز کیا تو ریڈیو کے پروگراموں میں مختلف اوقات میں بلوچی شاعری بھی ہوتی رہی۔

بعد میں جب ریڈیو پاکستان کا بلوچی شعبہ کوئٹہ منتقل ہوا تو یہاں بھی مشاعرے کی روایت قائم و دائم رہی۔
ریڈیو کے علاوہ پاکستان ٹیلی وژن کوئٹہ سنٹر سے بھی کبھی کبھار مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے جس میں زیادہ تر شعراء غزل کے ضعف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں ان کے علاوہ بلوچی زبان وادب کی خدمت میں مصروف ادبی ادارے بھی وقتاً فوقتاً مشاعرے کا اہتمام کرتے رہتے ہیں جس سے غزل کے صنف کو بھی کافی تقویت ملی ہے۔ ان ادبی اداروں میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، بلوچستان اکیڈمی تربت، عزت اکیڈمی پنجگور، لوز چیدرغ کوئٹہ، بلوچی لبزانکی دیوان، سید ہاشمی اکیڈمی کراچی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ طباعت و اشاعت کے شروع ہونے کے بعد غزل کا دوسرا بڑا کھیپ تیار ہوا ہے اُن میں قابلِ ذکر شعراء میں جی آر ملا، بشیر بیدار، بائل و شتیاری، غنی پرواز، برکت اللہ بلوچ، اسماعیل ممتاز، سلطان نعیم قیصرانی، صباد شتیاری، مبارک قاضی، ڈاکٹر فضل خالق، اللہ بخش بزدار، غوث بہار، رزاق نادر، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، ممتاز یوسف، گل محمد وفا، منیر مومن وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعراء نے تسلسل کے ساتھ لکھا اور لکھ رہے ہیں۔ زیادہ تر شعراء کے شعری مجموعے بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ غزل پر دنیا میں جو تجربے ہو رہے ہیں ان شعراء نے روایتی انداز سے ہٹ کر کامیابی کے ساتھ ان تجربوں کو بھی اپنے ادب کا حصہ بنایا ہے۔ جس سے بلوچی ادب میں بحث و مباحثہ کیلئے راستے کھلتے گئے۔ اگر ایک کمی رہی تو وہ بلوچی غزل پر تنقید کی کمی تھی جواب بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ اس شعبے میں بھی کچھ نام سامنے آتے ہیں جنکا پیش رو کریم دشتی ہے۔ ان ناموں میں اکبر بارکزئی، صدیق آزاد، غنی پرواز، صباد شتیاری، ڈاکٹر فضل خالق کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جدید بلوچی شاعری تین مکتبِ فکر میں بٹی ہوئی ہے۔ ان مکتب کی نمائندگی سید ظہور شاہ ہاشمی، میر گل خان نصیر اور عطا شاد کرتے ہیں۔ اسی طرح شاعری میں غزل کے صنف میں بھی انہی مکتبِ فکر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ جدید شعراء میں ان شعراء کے اسلوب کی چھاپ شاعری کی تکنیک کے کسی نہ کسی زاویئے میں ضرور نظر آئے گا۔ اسکے علاوہ بلوچ شعراء پر اردو کے شعراء نے بھی ایک حد تک اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ غزل کے میدان میں خاص طور پر فیض احمد فیض، احمد فراز، پروین شاکر، بشیر بدر کے اثرات بھی کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ بلوچی غزل اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود بلوچی شاعری کے اصناف میں نمایاں نظر آتا ہے۔ بلوچ شعراء کی دلچسپیوں کو مد نظر رکھ کر یہ پیش گوئی بھی کی جاسکتی ہے کہ غزل کا مستقبل دوسری شعری

اصناف سے زیادہ روشن ہے۔

بلوچستان میں مروج دیگر زبانوں کی طرح بلوچی اور براہوئی زبان کے ذُوالِلسان شعراء کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ جنھوں نے بیک وقت دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ براہوئی اور بلوچی کے کلاسیکل شعراء ریکی، بشام نے بیک وقت دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے جبکہ براہوئی غزل کے بانی ملا محمد حسن ہنگلزئی نے بھی بلوچی زبان میں شاعری کی ہے۔ اور وہ بلوچی اور براہوئی کی ذوالِلسان شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ تاج محمد تاج، گل خان نصیر، احسن خارانی، یاسین بسمل، خلیفہ گل محمد نوشکوی ایسے نام ہیں جنھوں نے دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے اور اسطرح سے براہوئی غزل دیگر زبانوں کی طرح بلوچی غزل سے بھی نہ صرف متاثر ہے۔ بلکہ اپنے اثرات بھی ان پر مرتب کی ہے۔

براہوئی غزل کی ابتداء

براہوئی غزل کی ابتداء انیسویں صدی کے اوائل سے ہی ہوتی ہے۔اس زمانے میں بلوچستان کے حکمرانوں کے دربار سے وابستہ ایک اہم سیاسی، علمی اور ادبی شخصیت نائب محمد حسن ہنگلزئی ہیں۔ جنہوں نے پہلی بار براہوئی زبان میں غزل کو متعارف کرایا۔ عوامی مقبولیت کے پیشِ نظر "بلبلِ قلات" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ ملا محمد حسن خان محراب خان کے عہد میں اہم حکومتی عہدوں پر فائز رہے اور پھر ملا محمد حسن اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے۔انکی فارسی غزلوں کا مجموعہ "گلدستہ قلات" کے نام سے خانہ فرہنگ ایران کوئٹہ نے شائع کیا ہے۔انہوں نے براہوئی کے علاوہ بلوچی، اردو اور فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ لیکن ان کا براہوئی میں پورا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ تاہم انکا جتنا بھی براہوئی کلام دستیاب ہوا ہے۔ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود فارسی کے شناور تھے یہی وجہ ہے کہ انکے براہوئی کلام پر بھی فارسیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔(۱)

انیسویں صدی کے اِس سیاسی قد آور شخصیت اور شاعر کا براہوئی کلام دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ البتہ گمانِ غالب یہ بھی ہے کہ شاید اب بھی اس کے کچھ اشعار موجود ہوں۔ جو تحقیق طلب ہیں۔ تاہم نائب محمد حسن کے خاندان پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اگر انکے پاس اس عظیم شاعر کا کلام محفوظ ہو تو وہ اس اہم قومی سرمایہ کو خدمت اور فرض سمجھ کر آگے لائیں تاکہ نہ صرف اُن کا کلام محفوظ ہو بلکہ بلوچستان میں ادبی معیار کا پیمانہ ثابت ہو۔ اسطرح ہم ان معلومات کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ براہوئی غزل کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے۔

نائب محمد حسن ہنگلزئی براہوئی کے پہلے غزل گو شاعر ہیں۔ براہوئی کے تمام تذکروں میں اُنکی شاعری کا ذکر موجود ہے۔

تذکرہ نگار جناب عبدالرحمٰن کرد نے اپنے ایک تحقیقی مقالہ مطبوعہ "ادب و ثقافت" وادی بولان میں اور براہوئی کے نامور محقق ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی نے "قدیم براہوئی شعراء" میں اُنکا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنی اردو تصنیف "براہوئی زبان و ادب کی مختصر تاریخ" میں بھی اُن کا ذکر کیا ہے بلکہ چند اشعار بھی بطور مثال پیش کئے ہیں۔

جوہر براہوئی نے اپنی تصنیف "براہوئی تخلیق کار" اور راقم نے اپنی کتاب براہوئی زبان و ادب اور پروفیسر

۱۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر "براہوئی زبان ادب کی مختصر تاریخ" مرکزی اردو بورڈ لاہور 1982ء صفحہ 119۔

خداداگل نے اپنی کتاب "براہوئی ادبی تاریخ" میں بھی نائب محمد حسن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اِن سب تحقیق میں سب سے پہلی غزل پیش کی گئی ہے۔اس طرح بات اب وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ذیل میں تحریر کردہ غزل براہوئی کی سب سے پہلی غزل ہے۔

"او شام نا بروکا اُستے کنا دریس
احوال اے ہندہ نا حور و پری کہ دیس
قاصد کہ نی کاسہ ہِتاتے نی چاسہ
حور و پری ءِ پاسہ اسہ دم کہ نی بریس
ٹکاک ءُ دانہ غاکو تیل و شانہ آکو
ہڑدے نا بہانہ آکو اسہ دم کہ نی بریس
آہو ، مور ، انج اُس دشمن تیان رنج اُس
محمد حسن کہ گنج اُس اسہ دم کہ نی بریس۔"(۱)

اسطرح براہوئی کی ابتدائی غزلوں میں دوسرے نمبر پر ملا عبدالحکیم مشوانی کی غزل آتی ہے۔ جو آج سے 120 سال قبل لکھی گئی ہے۔ مولا عبدالحکیم مشوانی شرود کے رہنے والے تھے۔انہوں نے 120 سال قبل اپنے غزلوں کا مجموعہ چارباغ کے نام سے تحریر کیا ہے۔ جس میں عربی، فارسی، پشتو اور براہوئی زبان میں اشعار درج ہیں۔

لٰہذا دوسرے نمبر پر ملا عبدالحکیم مشوانی کی اس غزل کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

"خدا نی مہربانس ہم توانا
کنے توفیق ایتس نی ثناء نا
اول اُستے کنا تینا ثناء غا
ملس ایکان درود آتیٹے نبی نا

۱۔ براہوئی عبدالرحمٰن ڈاکٹر "براہوئی زبان و ادب کی مختصر تاریخ" مرکزی اردو بورڈ، لاہور 1987 صفحہ 1101
۲۔ براہوئی عبدالرحمٰن "قدیم براہوئی شعراء" ادارہ ادب بلوچستان 1968ء صفحہ 24
۳۔ براہوئی جوہر "براہوئی تخلیق کار" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1999 صفحہ 22
۴۔ شاہوانی عبدالحمید "براہوئی زبان و ادب" ساراوان اکیڈمی مستونگ 1999، صفحہ 69

گڑا اِی ہندہ اِرادہ ئس کریٹ

منہ ہیت تینا اُستان پانا

براہوئی آ دوی اُٹ پانہ ہیتے

کمک نا مہربانی غان خوانہ

ارے کُل لفظ اُٹی دا لفظ سخت تر

مگر دِیر سے مرے مہرس خدانا

غریب عبدالحکیم ءِ یاد کبو نم

کہ پنچ وقتس ہوا کیرے دُعا نا (ا)

اور پھر مولانا عبدالمجید چوتوئی کی غزلیں براہوئی کی ابتدائی کہی گئی غزلوں میں تیسرے نمبر پر آتی ہیں۔اُنکی یہ غزل براہوئی کے ابتدائی غزلوں میں سے ایک ہے۔

نی خیال کہ دیکہ ہر دم بےہوش بے سما

دوست پاش کہ خلتے تینا زیبا خُماریا

بےمٹ بےمثالس نی دانہ دُر نا

شافی نی پاش کہ خلتے تینا خماری آ

اُستے کنا پلائس نی خواجہ زیب نا

محبوب کہ خلتے ظاہر کجل خماری آ

ہمار ارے خیالی دارُو دوا کہ نے آ

پاش کر حکیم خلتے نرگس خُماری آ

ہچ طاقت اف کنے کہ تولو سلو نت آ

ترس نشان خلتے آہو خُماری آ

ا۔ عبدالحکیم، مولانا "چارباغ" مرتب ڈاکٹر عبدالرزاق صابر، 2002، صفحہ 179

سم اُست ٹی کہ لگا نا عشق نا رسول
مہلم تہ دادے پاش کر خلتے خُماری آ

بر لاڈ محبت اُٹ نی بالاد تو دِل کشا
مجلس کہ سیل کے مے نا خلتے خُماری آ

پرواہ ، ہچ نا اف اے خواجہ زیب نا
کیس سوختہ غا خیال ٹی خلتے اُٹ خُماری آ

نا قد اُست پلوکا قربان نا قد نا
پاش پردہ غان کہ خلتے تینا خماری آ

دیوانہ ے مجید نا مس دیمہ سیدا
رحمت جہان نا پاش کہ خلتے خماری آ (۱)

یوں تو درج بالا تینوں شعراء براہوئی زبان کے ابتدائی غزل گو شعراء مانے جاتے ہیں۔ جن میں سے ملا محمد حسن کے غزلیات پر فارسی کا رنگ غالب ہے۔ جبکہ ملا عبدالحکیم مشوانی چار زبانوں کے شاعر ہیں۔اُن کی براہوئی غزلیات میں دینی مضامین کو اولیت حاصل ہے۔ تاہم انکے چند غزلیات خالصتاً عشقیہ موضوعات پر کہے گئے ہیں۔ابتدائی براہوئی غزل گو شعراء میں عبدالمجید چوتوئی نے ایسی غزلیں تخلیق کی ہیں جن میں عشقِ حقیقی کو مجازی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز انہوں نے براہوئی زبان میں پہلی بار غزل کو براہوئی رنگ میں پیش کیا ہے۔

اس کے بعد براہوئی کے ابتدائی غزل گو شعراء میں ایک اور معتبر نام مولانا محمد عمر دینپوری کا ہے، مولانا محمد عمر براہوئی ادب میں صرف ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عالم دین، مفسر، نثر نگار مترجم اور زبان دان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انکی براہوئی شاعری میں جابجا غزلیات ملتے ہیں۔ جن میں انہوں نے بھی دینی مضامین کو اپنی غزلیات کا عنوان بنایا ہے۔ ایک اور نام خلیفہ گل محمد نوشکوی کا بھی ہے۔ جنہوں نے براہوئی میں عشقیہ غزلیں کہی ہیں۔

دیگر براہوئی غزل گو شعراء میں پیر محمد نمیرغی ، عبدالحق لاکھوریانی، پیر محمد زبیرانی، تراب لاڑکانوی وغیرہ

ا۔ چوتوئی، عبدالمجید "جوش حبیب" 1957ء صفحہ 8,9۔

براہوئی کے نام بھی غزل گو شعراء میں شمار کیئے جاتے ہیں۔یوں توان شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن کا تفصیلی ذکر باب ہفتم میں کیا گیا ہے۔

براہوئی کے ابتدائی غزل گو شعراء کی اکثریت دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء کی ہے۔اس لیے ان شعراء کے ہاں غزل پر بھی دینی اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

براہوئی غزل پر دینی اثرات

براہوئی غزل کا جو بھی دور ہو اُس پر دینی اثرات کی وجوہات جاننے کے لیئے ضروری ہے کہ بلوچستان میں موجود مذاہب کا مطالعہ یا تاریخ بیان کیا جائے۔ اسکے علاوہ اہم بات یہ کہ مسلمان ہونے کے ناطے براہوئی شعراء مثلاً تاج محمد تاجل، صوفی عطا محمد، عبدالحق لاکھوریانی وغیرہ کے کلام میں صوفی ازم یعنی عارفانہ کلام ہنالی ہے۔ براہوئی ادب میں نثر ہو یا شاعری اُن پر دینی اثر ایک قدرتی امر ہے۔ جس طرح اس سے قبل بیان ہوا ہے کہ براہوئی کے اکثر ابتدائی غزل گو شعراء دینی مدارس سے فارغ التحصیل تھے اور وہ براہوئی زبان میں غزل تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اسطرح دینی مدارس نے براہوئی غزل کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایسے مدارس میں ایک اہم نام مکتبہ دُرخانی ڈھاڈر بلوچستان کا بھی ہے۔ جس نے مولانا محمد فاضل درخانی کی سرپرستی میں نہ صرف بلوچستان میں دین کی اشاعت اور خاص طور پر بلوچی اور براہوئی ادب کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ انہوں نے براہوئی شاعری اور خصوصاً براہوئی غزل کو بامِ عروج پر پہنچایا تاہم ایسے شعراء کے براہوئی کلام پر اسلامی رنگ غالب نظر آتی ہے۔

براہوئی زبان میں ابتدائی غزل گو شعراء سے لیکر دور جدید کے شعراء تک سب کے ہاں غزل میں عشقیہ مضامین کے علاوہ پند ونصائح کے اور دینی مضامین پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔

براہوئی زبان کا پہلا شعری مجموعہ مولانا ملک داو قلاتی تحفۃ العجائب ہے۔ اس قلمی نسخہ کو مولانا نبو جان قلندرانی نے 1905ء میں چھپوا کر منظر عام لایا اس مجموعہ کلام میں کل 275 اشعار ہیں جن میں حمد باری تعالیٰ میں اول صفت ہے، پھر وحدانیت اور کائنات کو عجیب طریقے سے تخلیق کرنے کا بیان۔ نعت اور منقبت جنت اور دوزخ کے بعد حصول علم اور دین کا بیان ہے۔ پھر پانچ ابواب میں نماز، نماز با جماعت، صفتِ ایمانی، ایمان مفصل، ایمان مجمل کا بیان، تیرھویں باب میں فقہ حنفی کے مسائل کا بیان، وضو، غسل، نماز وغیرہ کے مسائل کا بیان اور آخری ابواب میں رمضان، تراویح، فطرانہ، زکوۃ، فضیلت اور حج کی اہمیت اذکار کا ذکر۔ اسطرح کتاب کے چالیس ابواب ہیں۔ تاہم یہ مجموعہ مثنوی طرز پر لکھا گیا ہے اس میں غزلیات درج نہیں ہیں اور یہ تمام اسلامی اعمال خالصتاً اسلامی رنگ میں مولانا ملک داو قلاتی کی شاعری کی کتاب تحفۃ العجائب میں شعر کے انداز میں بیان

کیئے گئے ہیں۔

ہمارا موضوع چونکہ صرف براہوئی غزل پر دینی اثرات کا جائزہ ہے۔ لیکن پھر بھی قاری کے مطالعے کے لئے یہ کہنا بے محل نہیں کہ تمام براہوئی ادب پر چاہے وہ نثری ادب ہو یا شعری ادب ان میں دینی اثرات موجود ہیں۔ اسی طرح براہوئی غزل پر بھی دینی اثرات نمایاں طور پر ہیں۔ مثال کے طور پر شعراء کرام کے کلام میں یہاں چند ایک اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

ملا عبدالحکیم کی شاعری دینی اثر اس طرح سے ملتا ہے۔

"خدا نی مر بانس ہم توانا
کنے توفیق ایتس نی ثناء تا
اول اُستے کنا ثناء غائے
ملیس ایکان دُر۔ دَر انا ئی بینا

(مولانا عبدالحکیم "چارباغ" 1870/90)

مولانا عبدالمجید چوتوئی کے ہاں غزل پر دینی رنگ اس طرح سے ملتا ہے۔

"بیجے یا شاہ رُسل اُست کنا ٹی اے
ہُر خدائے کیفیان تینے کہ جُدا
خیال ارے شاہ ءِ کل انا طرفا
میدٓے نشان ءِ ۃ نے آ میڑے خدا

(عبدالمجید چوتوئی "جوش حبیب" 1375ء)

شیخ القرآن مولانا محمد یعقوب شروری براہوئی کے ایک نامور عالم دین اور شاعر ہیں ان کی شاعری اور خاص طور پر غزل پر دینی رنگ اس طرح سے غالب ہے۔

صفتے دوست نا قرآن نا آیت آتیان ہرف
حدیث آن پوہ کہ انجیل و توارت آن ہرف

ا۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر "براہوئی زبان ادب کی مختصر تاریخ" مرکزی اردو بورڈ، لاہور 1982ء صفحہ 89,90,91۔

امر ہس یار نا مجلس امر اونا کچاری اس

کچاری نا شریک آتا ملاقاتی تیآن ہرف

نی اصار و مہر قبا روایاتیان ہرف

(محمد یعقوب شرودری "شکرپارہ" 1977ء)

مولانا محمد اسماعیل مینگل بھی ایک نمایاں شاعر ہیں ان کے ہاں یہ رنگ اس طرح سے ملتا ہے۔

شفاء نا خواجہ کے خیالے ایسہ دا گنہگار آ

ھشنگک اُست کنا بے حد خلیوہ کوک وزمبار

شاء نا خواجہ باز مُر اُس کنے طاقت ہتنگاف

نمائٹ دا وطن ٹی ای رسیف فریاد کوکارا

(مولانا محمد اسماعیل مینگل "گفتار عاشق" 1958ء)

اور مولانا عبدالحق زہری اس طرح بیان کرتے ہیں۔

نئے آ دا غریباتا نظر عرلی عنایت نا

قبرا محشر اندر شافع اریس صاحب شفاعت نا

گناہ تٹی اریٹ ای غرق انٹ مشغول مولا تو

تخلن خوف پین خطر مُستی محشر قیامت نا

(مولانا میاں عبدالحق زہری "سخنِ حق" 1951ء)

اسی طرح عہدِ جدید میں بھی یہ اثرات شاعری اور غزل میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مولانا نور احمد محمد شہی کی ایک غزل اس رنگ کا اظہار اسطرح ہوتا ہے :۔

رب نا قربان دین او ارے باز مہربان

او ہدایت کے نتا راہی کرے دھنو قران

رہبر و ھادی ننا ہر دو جہان ناس قران

قائم ءِ اونا طفیلٹ ہم زمین ہم آسمان

(مولانا نور احمد محمد شہی، کلام نور 1978ء)

بابا عبدالحق کے ایک غزل کے چند اشعار

بیسہ دیدان مصطفےٰ تاینگی ئے خنک خننو

خنک کنا بے نا توار ان پین توارس بننو

باخرین جوڑک ہم خرین جوران زیات

دوست تا پن کیک ھنین وھنو ھنینی ننو

دوست تا کنڈا دو دیئٹ کارہ دا منڈ نگانک

مفت کہ ای خواری کرینٹ کنو گامس ھننو

(بابا عبدالحق "سر ناچاری" 1992)

پروفیسر عبدالواحد مینگل کے غزل پر بھی دینی اثر کی ایک جھلک یوں نظر آتی ہے۔

عید ارے انعام مومن روچہ کہ رمضان نا

تحفہ سے بے حد گچینو بندہ کہ رحمٰن نا

است تو ءِ روچہ تورے دے دنن نا یاد ٹی

دازمس مالک ننانی خالقس انسان نا

بندہ و مولانا تعلق روچہ آن بیدہ مریک

دا عبادت کہ مریک لس طاقت آن ایمان نا

(پروفیسر عبدالواحد مینگل، "رست نا توار" 1999ء)

اسلم پروانہ کی ایک غزل میں مذہبی اشعار

خدا واحد خواجہ کس اونا شریک اللک

ارے خواجہ بلند بالا عقل شانے اونا تپک
کرے پیدا او انسانے و ہم زیہا تہ میزانے
رحم کے او تورحمانے ولے شرک رحم کپک
کہ ے"مکن" نا اوا لفظ اٹ تمامی کائناتے جوڑ
ارے بے عیب بے پرواہ ہند اخس چانہ نن ہیشنک
عجب جنت عجب دوزخ عجب عاراف نا میدان
رحم نا خواجہ ءِ رحمٰن غرلٹ مومن ءِ ہلپک

(اسلم پروانہ "جذباتِ اسلم" 1995ء)

براہوئی کے دور جدید کے ایک نمائندہ شاعر حسن غمخوار کا ایک غزل

رحم ءِ خدایا طلبگار سے اٹ
کنا انت ہستی ءِ لا چار سے اٹ
خطا تہ کنا درگزرانی کروکا
ای عاجز نزور و گنہگار سے اٹ
کنے اٹ مفک ہچ کرف نی گڑاس
زمانے ٹی تموک بیکار سے اُٹ
کنے تینا کہ ای مریوہ شردتر
شکل ہدغی نا ءِ سہدار سے اُٹ
محمدؐ نا روضہ ءِ خنور مب کپو
کمک ناصرے ای تو جار سے اٹ

(حسن غمخوار "توبے نا بٹا" 1996ء)

براہوئی غزل پر دینی اثرات کے حوالے سے براہوئی میں حمدیہ اور نعتیہ غزلیں بھی کہی گئیں ہیں۔ لوگ جہاں انگریزی استبداد سے اپنی ثقافتی سیاسی اور معاشرتی اقدار کو بچانے کی جہد کر رہے تھے۔ وہاں انہوں نے اپنی مذہبی اقدار کو بھی پہچانے

کے لیئے جہاد کیا۔ یہی وہ وجوہات ہیں۔ جس سے خطے میں آباد لوگوں کی ادب بھی محفوظ نہ رہی۔ شعراء نے لوگوں کو اپنے معصوم اشعار سے انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد کے لئے اُبھارا۔ یہ سلسلہ قیامِ پاکستان تک جاری رہا۔ لیکن حیثیت مسلمان براہوئی شعراء کے دل قیام پاکستان کے بعد بھی دین اسلام کی نُور سے منور رہے۔ للذا آج کے جدید دور میں جہاں براہوئی غزل نے جدید دور کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اگر دنیا میں سیاسی تبدیلیوں، سرد جنگ کی کیفیات۔ جدید ٹیکنالوجی اور ایٹمی دور کو موضوع غزل بنایا ہے۔ وہاں آج بھی اسلام اور دین سے متعلق اخلاقی گراوٹ، سماجی قدروں کی پامالی کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے کیلئے بھی براہوئی غزل نے اپنی سفر کو جاری رکھا ہے۔

براہوئی غزل قیامِ پاکستان کے بعد

قیامِ پاکستان سے پہلے خطے میں موجود سیاسی، تاریخی، اور معاشرتی اثرات وحالات نے براہوئی ادیب اور شاعر کے مزاج کو متاثر کیئے ہوئے تھا۔ یعنی پاکستان بننے سے پہلے انگریزوں کے دور حکومت میں انگریزوں کی سیاسی فوجی اور سیاسی حکمت عملی بلوچستان کے عوام پر پوری ایک صدی مسلط رہی۔ اس عہد میں انگریزوں نے جہاں سیاسی اور فوجی نقطہ نظر سے بلوچستان کی نظریاتی سرحدوں کو تبدیل کیا۔ وہاں اس تبدیلی نے خطے میں دوسرے تبدیلیوں کے لیے راہ ہموار کی۔ مثلاً اگر ایک طرف اس عہد میں عیسائی مبلغ کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اور عام مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ تو دوسری طرف قوم کو قوم سے لڑانے اور زبان کو زبان سے لڑنے اور جھگڑنے تک پہنچادیا تھا۔ اسی عہد میں انگریزوں نے بلوچستان کے عوام پر اُن کے اپنے ہی قبیلوں کے سرداروں اور معتبرین کو ماہانہ وظیفہ خور بنا کر انہیں اپنے اپنے قبیلوں پر علم و آگہی کے دروازے بند کروانے کا کام سونپ دیا تھا۔ اور پھر ان تمام عوامل سے بڑھکر یہ کہ یہاں کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی۔ کہ وہ انگریزوں کے غلام ہیں اور فرنگی انکے آقا۔ برصغیر میں جب آزادی کی تحریکیں چلنی شروع ہوئیں۔ تو اس کا اثر بلوچستان کے لوگوں پر بھی پڑا جو پہلے سے ہی انگریزوں کے خلاف محاذ بنا رکھا تھا۔

یہ وہ سیاسی حالات تھے۔ جس کا اثر براہوئی شعراء پر پڑا۔ اور یہ اثرات انکی غزلوں میں واضح ہیں چونکہ یہ حالات نئے نئے رونما ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ اثرات کافی عرصے تک براہوئی شعراء پر اثر انداز رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی انکے کلام میں خصوصی ہم آہنگی حب الوطنی کے جذبات کے ساتھ ساتھ براہوئی غزل میں عشقیہ اور دوسرے مضامین بھی موضوع بنتے رہے۔ اس طرح ہم براہوئی شعراء کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور اُنیسویں صدی سے لیکر 1947ء تک، دوسرا دور 1947ء سے 1980ء تک اور تیسرا دور 1980ء سے تاحال یعنی سن 2002ء تک جبتک کہ یہ مقالہ مکمل ہوتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد 1958ء تک براہوئی شعراء کا کلام حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے۔ 1958ء میں جب ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔ چونکہ براہوئی مزاجاً مزاحمت پسند واقع ہوئے ہیں اسلئے انہوں نے بھی مزاحمت کی روش کو ترک نہ کی۔ انہوں نے مارشل لاء کے خلاف عوامی جدوجہد میں اپنی آواز بھی شامل کی ایسے شعراء میں میر گل خان نصیر، نادر قمبرانی، عبدالرحمٰن کرد پیش پیش تھے انہوں نے غیر جمہوری قوتوں کے خلاف آواز بلند کی اور اس جبر اور ظلم

کی داستان کو اپنی کلام کا موضوع بنایا۔ ان کا یہ انکار اور حاکم وقت کو للکار نا براہوئی غزل کی شان بن گئی۔ اس دور میں میر گل خان نصیر ، نادر قمبرانی، عبدالرحمٰن کرد، امیر الملک مینگل، اسحاق سوز، نور محمد پروانہ، پیر محمد زبیرانی، پیر محمد نیمرغی، غلام حیدر حسرت، عبدالقادر راشیر، رزاق صابر، عبدالباقی درخانی، گل بنگلزئی، میر محمد الفت اور دوسرے بہت شعراء شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے کلام میں مزاحمت کے علاوہ عشقیہ اور دوسرے مضامین بھی کہے ہیں۔ ایک لحاظ سے اس دور کی شاعری کو براہوئی غزل کا نقطۂ عروج کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کے چند ایک نامور شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

نادر قمبرانی کی ایک غزل جس میں وہ کہتا ہے کہ زندہ قوموں کو غلامی پسند نہیں ہوتی۔ وہ اپنی آزادی کے اونٹ کا مہار خود اپنی ہاتھوں میں لیتی ہے۔ ایسے ملک کے عوام خود اپنے آقا ہوتے ہیں۔

"زندہ غا قومے غلامی خوش بفک
تینے آن بزا او کے مرتپک
مہری ئے تینا او تینٹ ہکلیک
چین تادوئی مہار پتہ تفک
ملک نا تینا او تینٹ خواجہ ئے
غیر نا حکمے او داڑے سگیپک
مرد نا ٹپے خنورے ڈوبرا
پد تفک جنگان پڑان او نہ بیک
سنگتی سیوت مے پرواک سپک
دشمنے مستی برے ہمت مفک
یک پہ یک کیرہ خلیرہ او مے
چج مریرے کس مے آ دریپک
راز نا ہیتے نی با آن کشیپہ
بینہ پا ریستہ کس اودے ڈکیپک" (۱)

ا۔ قمبرانی، نادر "شغزہ گروک" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1993ء صفحہ 117۔

1958 میں جب بلوچستان کی ریاستی حیثیت کو ختم کر کے اسے ون یونٹ کے تحت مغربی پاکستان کی وحدت میں شامل کیا گیا تو حکومت کے اس فیصلے کے خلاف بلوچستان میں ایک طویل جنگ کا آغاز ہوا۔اس جنگ کے نتیجے میں نواب نوروز خان زرکزئی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔15 جولائی 1960 کو انہیں پھانسی دی گئی اس واقعہ کا عبدالرحمان کرد نے اپنی ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے کہ اے تاریک رات شاید ہم کو تمہارا سحر دیکھنا نصیب نہ ہو۔ان بے قرار دلوں کو اس رات شاید لبدی آرام ملے دشمن کے ساتھ بھوک اور پیاس کے ساتھ لڑنے والے کون تھے۔جنہوں نے اس زمین کے ایک ایک زرے پر اپنا خون بہایا اور وقت کا ایک ایک پل جس کے خون سے رنگین ہے جب باغ میں بہار آئی تو میوؤں سے لائے ہوئے باغ کو کس نے لوٹا۔ کس گھر کے چراغوں کا طوفانوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوا۔اس رات کو ہم اپنے وطن پر قربان ہو رہے ہیں۔ہم نے ظلم سہا ہے اور غموں سے بوجھل دل بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

نا سوب ءِ خنپردن نن اے شام گُک تہارا
ہگار سینگک آرام استاتے بے قرارا

بنن و ملاسی اٹ پا دشمن تو جنگ ہ لے دے؟
خیسن ءِ ترتوپا نی پھٹاتے رنگ کر لے دے؟

وختا برم نا دِنا لُٹگا باغ نی پا
طوفان تومس مقابل دنا چراغ نی پا

قربان دا وطن کن دا شام ٹی مردن نن
ظلماتے نن سہا نن نا غمتے ہم دردن نن (ا)

چونکہ ہمارا موضوع براہوئی نظم نہیں بلکہ براہوئی غزل ہے میرا عبدالرحمان کرد کی نظمیں ہوں یا غزلیات سب میں مقصدیت یعنی فلسفہ وطن دوستی اور قوم پرستی نمایاں نظر آتا ہے وہ اپنے عہد کے مسائل کو بھرپور انداز میں اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

"صنم نا ایتبو ڈس و نشانس
قرار استے ہلک چوز مانس

ا۔ کرد، عبدالرحمان "شف گردک" براہوئی اکیڈمی پاکستان 1996ء صفحہ 72۔

اونا والا تمائی بے خیالی

ننے آ ہڑ کہ خھوکے جہانس

برے اونا گمان ئس اُست خواہک

کہ پیدا مسونے شک و گمانس

گدرینگا خاخران جولان نی ئس

کہ ظالم ئس پی ء سخت جان ئس

محبت نا کسر منزل نا مُری

سلیتو جان ئی تاب و توانس

گلہ نی نا خنوکان انت کیسہ

کہ نا قدر کروے قدر دانس (۱)

لیکن اسحاق سوز کو بلوچستان کس طرح نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی روشن ستارہ ہے۔ تو وہ بلوچستان ہی ہے جس کے چٹیل میدان، پہاڑ سرسبز ہیں۔ اس کے صحرا بھی شمشاد گل لالہ، نرگس کے خوشبو سے مہک رہے ہیں۔ بلوچستان کے لوگ باکردار اور غیرت والے ہیں وہ کیسے کسی اور کی غلامی کو قبول کر سکتے ہیں اس دھرتی کے پہاڑ قدرت کے ہزار نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ انکی ایک غزل میں بلوچستان کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

" دنیا نا ارے روشن الستار بلوچستان

سرسبز ارے پکا گلزار بلوچستان

خوش آب و ہوا ہم موسم عجب اونا

مشہور ارے دا خوش کردار بلوچستان

قدرت نا ذخیرہ تان ہر مِش ارے خیسُن

مَش تیٹی ارے اونا بازار بلوچستان

ا۔ کرد عبدالرحمان ''شف گروک'' براہوئی اکیڈمی پاکستان 1996ء صفحہ 37۔

اِنصاف ارے واڑے ہم قدر ارے واڑے

پُر امن ارے پکا بیدار بلوچستان

آزاد ارے طوقان ہر وقت غلامی نا

مشہورے لقب اونا خود دار بلوچستان

قلات گِدر، کانک، خاران عجب سیبی

مستونگ عجب ، کوئٹہ ، خضدار بلوچستان (۱)

اِس دور کے ایک اور شاعر رزاق صابر اپنی عہد اور اپنے راہنما سے شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمارا کوئی رہبر نہیں۔ گلا کسی سے نہیں گلہ مجھے صرف میرے مقدر سے ہے۔ جس کو بھی میں نے مسیحا جانا۔ وہ میرا قاتل نکلا۔ روشنی پانے کی آرزو میں میں نے ہزاروں دکھ سہے ہیں شاید آسمان والوں نے میری قسمت میں یہ دن لکھ دیئے ہیں۔

"بے اسر مست جہانٹ کس متو رہبر کنا

تینتو تینٹ اوغیوہ دا عادتِ اکثر کنا

کیرہ کس آن گلہ ای در مقدر جند نا

تسنے دھوکہ کنے اف کسے ءَ باور کنا

ای ہزار ارمان تو دروازہ غا اونا ہناٹ

ناگوس تِس حالتے وقس خنا دلبر کنا

تینے تینٹ دھوکہ تسنٹ ای کریٹ اوڑا یقین

قسمت اٹ لکھو کے اندا در در آٹو کر کنا

آسمان کہ رحم نی دا حالت ءَ دیوانہ نا

محشر آن مست زندگی ئی بسنے محشر کنا

ا۔ سوز اسحاق "جذبات سوز" براہوئی ادبی دنیا نیچ داصل بلوچستان 1972ء صفحہ 52۔

خوار زار در پہ در دو آن مست عشقتا

ستوٹ لگا ارا کا است ئی خنجر کنا

زندگی بے ڈول ءِ صابر مزہ اف میخانہ ئی

ہیدس اوڑان مسونے ویران دا ہندر کنا (ا)

قیامِ پاکستان کے بعد کے شعراء جہاں انکی غزلوں میں اُس دور کے سیاسی معاشرتی سماجی تاریخی لمحات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہاں اس عہد میں ایک ایسا شاعر بھی سانس لے رہا ہے جس کو خطے اور ملک میں چلنے والی سیاسی تحریکوں اور قید وبند کے غموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنے حال میں مست اپنے محبوب کے زلفوں کے سائے میں پناہ لئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ روم جل رہا تھا نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ اپنے محبوب کے الفت میں گم سم میر محمد الفت کہتا ہے کہ۔

اینو دلربا کنا مہمان مس

کنے آ خدا نا دا احسان مس

اریٹ خوش داخس کہ حد آن زیاد

کنا روح ئنا او سامان مس

خنار دلربائے کنے غمک اِلار

کنا اُست نا پورہ ارمان مس

ہسک انجمن ئی کر کہ روشنائی

کنا وین مسک ہم ایمان مس

امر خوش مفر اینو پاہو کنے

اُلفت نا درد آتا درمان مس (۲)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید براہوئی غزل کا آغاز قیامِ پاکستان کے بعد سے ہوتا ہے۔ اور جن نمائندہ شعراء نے جدید براہوئی غزل کی آبیاری کی ہے۔ اُن میں سے چند ایک کی شاعری سے مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔ تاہم

ا۔ صابر رزاق ''چراغ صابر'' براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1981ء صفحہ 28۔

۲۔ اُلفت میر محمد ''تمرواری'' براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1985ء صفحہ 34۔

ایسے جدید شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنھوں نے جدید براہوئی ادب میں براہوئی غزل کو موضوع سخن بنایا اور اس میں نئے مضامین اور نئے تراکیب کا استعمال کیا۔ اس دور میں جدید براہوئی غزل میں خیالات اور افکار کے ساتھ ساتھ فنی ضروریات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

تاہم اس دور کے براہوئی غزل میں ایک بات شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ سوائے چند نامور شعراء کے اکثر شعراء کے ہاں غزل کے تمام تر لوازمات ملحوظ خاطر رکھنے کی بجائے غزل میں مضامین اور احساسات کو فوقیت دی گئی ہے۔ اس لیے دورِ جدید کے نوجوان شعراء کے ایک حلقہ براہوئی ادب کے دورِ ثانی کی شاعری پر ناقدانہ انداز میں رائے زنی کرتا نظر آتا ہے ۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ براہوئی غزل کا یہ دور غزل کے جدید ترین دور کے لیئے ایک منظم اور محکم بنیاد فراہم کرتا ہے ۔

براہوئی غزل دورِ جدید میں

براہوئی غزل کا تیسرا اور جدید دور 1980ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ 1977ء میں ایک بار پھر ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا جو 1987ء تک جاری رہا ملک میں طویل فوجی حکومتوں نے عوام کو احتجاج پر مجبور کیا ملک میں بحالی جمہوریت کے لیئے سیاسی تنظیموں کی طرف سے تحریکیں چلیں اور قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ نوجوانوں نے فوجی آمریت کے خلاف آواز بلند کی اور اس مخالفت میں انہیں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ جہاں سیاسی تنظیمیں بحالی جمہوریت کے لئے کوششوں میں مصروف تھیں وہاں انکے دوش بدوش اُدبا اور شعراء بھی نظر آتے ہیں۔ یہ اس دور کے شعراء ہی تھے۔ جو ان سیاسی تنظیموں کے جلسوں اور جلوسوں میں قومی گیت گا گا کر لوگوں کے دلوں کو گرمایا کرتے تھے۔ بلوچستان کے ایسے شعراء میں براہوئی زبان کے شعراء بھی ہم قدم، ہم آواز اور انکے ساتھ ہم سفر تھے۔ جنہوں نے اپنے کلام اور غزلوں کے ذریعے سیاسی تحریکوں کو جلا بخشی۔

اس کے بعد جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے براہوئی غزل کو بھی جدید رنگ سے سنوارا، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ہمسایہ ممالک کے ٹی وی چینلز سے جہاں دوسرے اقوام کی ادب کو متاثر کیا وہاں یہ اثرات براہوئی ادب پر بھی پڑے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ براہوئی غزل نے بھی دنیا میں روز افزوں آنے والی ان تبدیلیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ فلسطین کی آزادی، دنیا میں بھوک وافلاس اور امن یا جنگ کی باتیں، ایٹم اور ایٹمی تباہی کی باتیں مختصراً یہ کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے موضوعات کو براہوئی کے جدید غزل نے اپنا موضوع کہ بنایا۔ اس دور میں فلمی صنعت نے بھی کسی حد تک براہوئی غزل پر اپنے اثرات مرتب کیئے جس کی وجہ سے براہوئی شعراء کے کلام میں جدیدیت اور رعنائیت آگئی۔ ان تمام موضوعات کا براہوئی غزل میں جائزہ لیا جاتا ہے۔

جس طرح عالمی ادب میں جاپان پر ہونے والی ایٹمی تباہ کاری کو اہم موضوع کے طور پر لیا گیا ہے۔ اسطرح جب 28 مئی 1998 کو پاکستان نے اور اس سے پہلے بھارت نے جسطرح ایٹمی دھماکے کیے ان پر عالمی ادیبوں کے شانہ بشانہ براہوئی شاعر بھی خاموش نہیں رہے۔ اس صورتحال کی براہوئی کے ایک نوجوان شاعر حمید عزیز آبادی نے یوں نقشہ کشی کی ہے:۔

"قدرت ودی کرینے انسان کن ڈغارے
طوفان بش کرینے انسان دا ڈغارا
اے درد تازہ مسک چاغی و پوکران اٹ
وخت آن ٹپ اسک جاپان دا ڈغارا
بارود بم و ایٹم ہستین بازے لیکن
آدم نا ٹپ کن اف درمان دا ڈغارا
جانان کان دا کان د مگیر مسنٹ ای
آرود دنز مول ءِ تالان دا ڈغارا
خن تیان پروکا کر پاک نی خوشیکس
خسہنگ ءِ کنو چلتن شاشان دا ڈغارا (۱)

یعنی قدرت نے انسانوں کے لیئے اتنے پیار محبت اور امن آشتی کے ساتھ رہنے کے لیئے اس زمین کو بنایا۔ لیکن یہ انسان ہی ہے جس نے اس زمین پر طوفان کھڑے کیئے۔ آج پھر انسان نے چاغی اور پوکران (بھارتی شہر) میں اس درد کو تازہ کردیا۔ جبکہ اس سے پہلے جس درد اور خوفناک تباہی سے جاپان زخمی تھا۔بارود بم اور ایٹمی اسلحہ کی تو ہر طرف دوڑ لگی ہوئی ہے لیکن "آدم" کے زخموں کا کوئی بھی مداوا نہیں ہے اور اے میرے محبوب چل اس دھرتی سے کہیں اور چلے جائیں یہاں گھٹن میں میرا دم گھٹا جارہا ہے۔ کیونکہ یہاں ہر طرف لاشوں کی بدبو چھائی ہوئی ہے۔ میرے سوجھی ہوئی آنکھوں سے کوئی تو آنسو پونچھے میرے ساتھ چلتن اور شاشان بھی رو رہے ہیں۔

ایٹمی اسلحہ ختم کرنے اور عالمی امن کو تباہی سے بچانے کے لیئے اقوامِ عالم نے اپنی مجالس میں ایٹمی اسلحہ کی دوڑ کو ختم کرنے اور عالمی امن بحال کرنے کے لیئے ایسے ملکوں پر زور دیا کہ وہ اپنی ایٹمی اسلحہ کے ذخیرے کو ختم کریں۔اس موضوع کو بھی براہوئی کے نوجوان شاعر حمید عزیز آبادی نے اپنی ایک اور غزل کا عنوان بنایا ہے :۔

"ہو کہ ایٹمی دنز اٹ امن نا گپ تمانے
پہاتے ٹی وِتر چڑ ءِ کپوت اس ٹپ تمانے

۱۔ عزیز آبادی حمید "غیر مطبوعہ مجموعہ شپاد"

خدا پاہک ڈغارا نی اُسل کہ فساداتے
ولے افسوس ہر کنڈا دِتر نا لپ تمانے
ہراڑے خاخرس لگے ہمو جاگہ ہشنگ تو
ٹکا ایٹم نا مس اوڑے ہمو مَش کپ تمانے
ہرا کنڈا نظر شادہ تبائی بس تبائی ءِ
ہراکان آفت اس اینو ڈغارا غپ تمانے
کنا وا زندہ غا لاش ءِ برک نی گرہ سکائی
حمیدے پٹہو اینو وطن ٹی چپ تمانے (۱)

ایٹمی دھماکوں کے بعد اُس کی خوفناک دھواں اور اڑتی ہوئی خاک کے درمیان جب امن کا فاختہ زخمی ہے۔ ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو امن کی بات کرتے ہیں خدا کا فرمان ہے کہ اے انسان اس زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔ لیکن افسوس کہ اس زمین پر ہر طرف مجھے خون ہی خون نظر آیا۔ زمین وہاں جلتی ہے جہاں اسے آگ لگی ہوئی ہو لیکن جہاں ایٹم کو دھماکے سے اڑایا گیا وہ پہاڑ بھی تو ٹکڑے ہو گیا ہے میں جہاں بھی نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں مجھے تباہی ہی تباہی نظر آتی ہے معلوم نہیں کیسے اس زمین کی امن کو آفت آن پڑی ہے۔

انور براہوئی اپنی ایک غزل میں زمانے کی جدیدیت کے دوڑ میں اپنے آپ کو اپنے قوم اور اُس کے ادب کو بھی جدت کی طرف سفر کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور یہ تمنا کرتا ہے کہ براہوئی ادب بھی دنیا کے دیگر قوموں کی ادب کی طرح ترقی کرے۔ اس مقصد کے لیئے وہ ہر قسم کے مشکلات قید و بند کی صعوبتوں کو بھی سہنے کے لیئے تیار رہتے ہیں اور ان مشکلات کو برداشت کرنے کی بھی بات کرتے ہیں۔

”ہر ارنگٹ مصیبت بریک ، برے پریشانی منظور ارے
دہن اُس اریٹ گہ براہوئی ادب نا روانی منظور ارے

۱۔ عزیز، آبادی، حمید ”غیر مطبوعہ شعری مجموعہ شپاد“

کرسہ کروٹ براھوئی شعر وادب ناخدمت کنا منشا کنا مرضی
داکسرٹ ہر مشکل ارے قبول۔ ہر تاوانی منظور ارے
لوظاک ارے بھل نا مثیت۔ ہستم نا مثیت وادب ارے
کنے آن بار ہر ورنائے چمن نا علہوانی منظور ارے
پاہو نا چٹ انتئے شاغنگہ نا لخت قید و بند انتئے مرین
ننے تو تینا زند نا تینا دود تا گلستانی منظور ارے
تینہ لوظاک سلیسر ہرانگ مست تدوکا ہرانگ ءِ گرائمر
گم مروکا خزانہ نا بقایاجات نا دربانی منظور ارے
منظور ارے تو بس ہندا خس کہ سیال تون سیال مرین
دا وانا حکومت ءِ خوانہ نہ تخت سلیمانی منظور ارے
دھن ءِ ارمان ئس ارے کہ اُست کنا خل نا مرے، جغر نا خشت نا
دنیا نا غم تھورپ کنے اللہ نا مہربانی منظور ارے
دھن ءِ توفیق ئس ملے۔ عیب آن انور کنے کہ انسان ئس مریو
ہر غلطی۔ ہر خطاغان ارے توبہ بے عیب زندگانی منظور ارے (۱)

یعنی مجھے دارا یا تخت سلیمان منظور نہیں ہے۔ مجھے اگر پیار ہے تو بس صرف براہوئی زبان ادب اور شعر وشاعری سے۔ اگر میرا دِل پتھر کا ہو اور جگر اینٹ کا ہو تب بھی مجھے احساس ہو گا کہ میرا زبان وادب ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔

لیکن زمانے کی اس تیز رفتار ترقی، ٹیکنالوجی اور زمین پر بچھے ہوئے کارخانوں کی گڑگڑاہٹ، مادیت پسندی اور معاشی ترقی اور مصنوعیت نے بھی براہوئی غزل کی معنویت اور رُوح کو مسخ ہونے نہیں دیا۔ یعنی غزل کے جو معنی و مطلب دنیا کی مادی ترقی سے پہلے تھی سو اب بھی وہی ہے۔ اس دور میں بھی براہوئی غزل میں محبوب کے حسن وجمال قد و قامت، زنجیری زلفوں سمندر جیسی آنکھوں سرو جیسی قد و قامت کی بات ہوتی ہے۔ یہاں براہوئی کے چند ایک غزلوں کو بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ عزیز، آبادی، حمید "غیر مطبوعہ شعری مجموعہ شپاد"

اسحاق سوز کہتا ہے کہ اگر کوئی میرے یار کے لبوں کے بارے میں پوچھے۔ تو وہ یہ سوال شہد اور گلابوں سے کرے اگر کوئی مصیبت رنج و غم شادی خوشی عشرت کے بارے میں سوال کرے تو وہ یہ سوال غریبوں سے کرے اور نوابوں سے پوچھے میری نیکی اور بدی کے بارے سوال کوئی نہ کرے اگر کوئی میرے بارے میں سوال کرے تو وہ اس سوال کا جواب گناہوں سے پوچھے وہ یہ سوال ثوابوں سے کرے۔

"ثنائے یار نا جوڑ تا شرلبا تیان ہن ہرف
شکر شہد آن ہن ہرف گلابا تیان ہن ہرف
ہم نن یار جانی بس ہم نن نا کہ بس لطفے
سوالا تیان ہن ہرف جولبا تیان ہن ہرف
مصیبت رنج زحمت نا خوشی شادی و عشرت نا
غریب آتیان ہن ہرف نولبا تیان ہن ہرف
خبر ائے سوز کیو انتس ھشلگا اُست نا تینا
چراغا تیان ہن ہرف کبلا تیان ہن ہرف (۱)

طاہرہ احساس اپنے محبوب کو حُسن اور حسینوں کا سردار اور دنیا سے بڑھکر خوش اخلاق اور خوش گفتار کہتی ہے۔

" حسین ءِ او حُسن نا سردار ارے
اخہ ور کہ پاؤ خوش گفتار ارے "

قیوم بیدار اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اے میرے محبوب میرا دل تیرے لیئے بے قرار ہے تیری ایک جھلک دیکھنے کے لیئے میں بے قرار ہوں۔

" کنا جان بر نے توارے دا اُست
نا دیدار کن بے قرارے دا اُست"

عزیز مینگل اپنے محبوب کی حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا محبوب سارے جہاں سے

ا۔ سوز، اسحاق "جذبات سوز" براہوئی ادبی دنیا نیچ و اصل بلوچستان، 1972، صفحہ 20۔

حسین ہے لعل ولا قوت اُس کے چہرے اور جمال کے سامنے ہیچ ہیں۔

" ننا لعل سرخیل ءِ لعل آتیان
عزیز خورپنہ لعل نا دانہ نن"

انور براہوئی اپنے محبوب کو تنہائیوں میں یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے محبوب تم کہاں ہو میں تمہیں کوچوں کوچوں دیار دیار ڈھونڈ رہا ہوں۔

" ہر رنگ ہنانس کنا اُست نا خوشی نی
گلی گلی کوچہ کوچہ نے پٹوہ بھاز ءِ"

خود ساختہ بنائے ہوئے اصولوں مار دھاڑ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل خلوص اور جذبہ کے بجائے حرص و لالچ میں ہے اس دنیا میں جگہ بنائی ہے اسے عزیز راہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔وہ پھر بھی آج کے انسان کو یہ پیغام دیتا ہے کہ پیار کرو چھوڑ دو دنیا کے لالچ۔دنیا کو اُلفت اور محبت کا پیغام دو۔ اُٹھو دنیا کے انسانوں کو یہ نوید سنادو کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو انسانوں کے دکھوں کا مرہم اور ان کی بقاء کو اپنی عبادت جانتے ہیں۔انکی ایک غزل پیش ہے۔

" الوداع آرام و راحت الوداع
الوداع اے گنج نعمت الوداع

حرص و لالچ ہر جا تالان مس
الوداع اے مہر و اُلفت الوداع

سیل و پترمہ ہنپ پک موسم خزاں
ماندہ مس پھلاتا رنگت الوداع

ہلک لالچ ایلمی نا جاگہ اے
الوداع اے مہر و سہوت الوداع

ہوغسہ انت کن راہی غریب
صبر نا اِلانے دولت الوداع " (۱)

ا۔راہی، عزیز "دیوان راہی" پبلشرز خود 1995، صفحہ 129۔

جدید دور میں براہوئی غزل نے جہاں سماج میں تبدیلیوں کا اثر قبول کیا۔ اس نے نئی جہتوں کو اور معاشرے کی سماجی اقدار کی تبدیلیوں مثلاً برے رسوم ورواج سے جس نے انسانی اقدار کا مذاق اُڑایا ہو۔ دوری اور کنارہ کشی اختیار کرنے وہاں براہوئی غزل نے زمانے کے بدلے ہوئے ہر قسم کی تبدیلیوں اور جدید عالمی تقاضوں کو اپنی کینوس میں جگہ دی ہے۔ غزل گو شاعر انور براہوئی اپنی ایک غزل میں زمانے کی جدیدیت کی ایک سفر میں اپنے لوگوں کو علم وہنر اور سائنسی علوم حاصل کرنے کا درس دیتا ہے اور انکو یہ کہتا ہے کہ وہ سائنسی اور دیگر علوم سے آشنا ہوں اور دنیا میں نام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنی شناخت کو تسلیم کرانے کی سعی کریں۔

"عنیک کنے کس اس مگر معننگ کے ضد کرینوٹ
انت کس کہ خنانٹ ای خفنگ کے ضد کرینوٹ

ہراکہ مش کئی کھڈو کس ءِانت تننگ کرور
اُست ناٹپ آتے انت خنور آہ ءِانت بننگ کرور

کوکاک انت تننگ کیرہ بیدس قبرنا مش تیان
ہماریک چین دورہ بے وڑنا جرنا مش تیان

ملاک ہراکم اسرہ کہ مظیر تا افسانہ مس
بے پاش بازاسکہ مگر دیرنا اضافہ مس

توہم پرست آتا نیام ٹی تمانے کنا زندگی
تینا حالت آمریک کنے وختو خلس شرمندگی

خدا اتس نئے علم وحکمت، سائنس نا دنیائے
فائدہ انتے ہر خلپہ انت سے ٹی کہ شفائے

خدا اغان خولوہ اِی انور محمدؐ نا صدخہ ٹی
گڑاس نہ گڑاس ملک ضرور توسنوٹ حوصلہ ٹی (۱)

ا۔ براہوئی، انور "دِتر ٹی ہور" پبلشر خود 1985، صفحہ 27۔

یہی نہیں کہ براہوئی غزل میں صرف اس سماج میں تبدیلیوں اور معاشرتی مسائل کو زیر بحث اور موضوع سخن بنایا گیا ہے یا پھر خطے میں رونما ہونے والے واقعات کو اپنے اندر سمونے کی سعی کی ہے بلکہ براہوئی غزل خطے سے نکل کر براعظم افریقہ میں چلنے والی آزادی کے تحریکوں کو بھی اپنے کینوس میں جگہ دی ہے جنوبی افریقہ میں چلنے والی قومی سیاسی اور آزادی کی تحریک کی حمایت کا اظہار کرتے ہوئے حمید عزیز آبادی نے وہاں کے قومی راہنما اور آزادی کے علمبردار اور رہبر ہمہ جہت شخصیت نیلسن منڈیلا کی قربانیوں کو موضوع سخن بنایا ہے۔

اس غزل میں وہ کہتا ہے کہ :۔

"کنا سنگت کنا لیڈر کنا زیباغا منڈیلا
کنا نی سوچ نا رہبر کنا زیباغا منڈیلا

امر فردس ئے پاوء اِی کنا کاروان اُس نی
سفیر اُس نی کنا اکثر کنا زیباغا منڈیلا

نما اے جہد کوشش آ زمانہ ناز کیک
مفیسہ نی اُسل دم در کنا زیبا غا منڈیلا

اے افریقہ جزیرہ نی اصول آتا متو سودا
ارے نا حوصلہ بستر کنا زیباغا منڈیلا

نی ظالم تو حقیقت نا کہ کیس بیت ءِ
حقیقت حق نا اسپر کنا زیبا غا منڈیلا

کنا دے ئس ہمین اِنگا کنا تحریک نا سنگت
اِی نے سنگت امر پاپر کنا زیباغا منڈیلا

حمید اِی ہوادے السل خنتینٹ دا ہم
کنا محبوب انگا دلبر۔ کنا زیباغا منڈیلا (۱)

ترجمہ :۔ میرے دوست میرے پیارے رہبر اور میرے حسین تر رہنما منڈیلا تم جہاں بھی ہو میری سوچ کا محور ہو۔

۱۔ عزیز، آبادی، حمید، غیر مطبوعہ شعری مجموعہ "شپاد"

میں تمہیں صرف ایک فرد کیسے کہوں۔ تم توامن کے سفیر اور آزادی چاہنے والے قوموں کے رہبر ہو۔ تمہاری جہد اور خدمات پر سارے زمانے کو ناز ہے۔ اتنے انتھک محنت کے باوجود تھکن کا نام تک نہیں لیتے تم نے جس طرح ظالم کے سامنے کلمہ حق ادا کیا اور اس حقیقت کی صداقت نے تمہیں زنداں کے کالے کوٹھڑیوں میں پہنچایا۔ تمہاری ان کاوشوں اور جہد سے ہمارے لیئے آج مثال اور اصول بنے ہیں۔۔ میں تمہارے ہی نام سے اپنے نئے دن کا آغاز کرتا ہوں۔

درج بالا شعراء اور اُن کے خیالات کے علاوہ براہوئی زبان میں نوجوان شعراء کی کثیر تعداد روز بروز نت نئے خیالات اور افکار سے براہوئی جدید غزل کے دامن کو مالا مال کر رہے ہیں۔ حال ہی میں براہوئی اکیڈمی پاکستان کے جانب سے شائع ہونے والے نوجوان شعراء کی شاعری پر مبنی کتابیں جن میں گلدستہ قلات گلدستہ مستونگ گلدستہ نوشکی، گلدستہ خضدار، گلدستہ سوراب، گلدستہ کچھی ونصیر آباد میں نو آموز شعراء نے نہایت دل آویز اور خوبصورت طریقے سے براہوئی غزل میں نئے تجربات کیئے ہیں جن سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ موجودہ عہد کو براہوئی زبان میں غزل کے عروج کا عہد کہا جاسکتا ہے۔ جس میں خیالات وافکار کے ساتھ ساتھ غزل کے فنی لوازمات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

ایسے میں براہوئی کے نوخیز شعراء سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ایک قلیل عرصے میں براہوئی غزل کو اس مقام تک پہنچادیں گے جہاں اس خطے کی دیگر زبانوں میں مروج غزل پہنچی ہوئی ہے۔

باب چہارم : براہوئی غزل کے فنی محاسن

۱۔ غزل کیا ہے؟

۲۔ براہوئی غزل اور بحر و وزن

۳۔ براہوئی غزل میں تشبیع اور استعارہ کا استعمال

۴۔ براہوئی غزل میں تخلص کی روایت

۵۔ ترک النقاط براہوئی غزلیں

براہوئی غزل کے فنی محاسن

علما اور نقادوں نے غزل کے لیئے جو فنی معیار مقرر کیا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے غزل کے فن کو مزید نکھارنے اور اس میں خوبصورتی لانے کے لیئے دوسرے بہت سے تجربات بھی کیئے ہیں۔ براہوئی غزل چونکہ براہ راست فارسی اور پھر اردو غزل سے متاثر ہے اس لیئے وہ تمام تجربات جو فارسی اور اردو میں کیئے گئے براہوئی غزل میں بھی ان کی باز گشت کسی نہ کسی حوالے سے ضرور سنائی اور دکھائی دے گی۔ اس باب میں غزل کے معیار اور فن کے ساتھ ساتھ ان شعری تجربات کو بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

غزل کیا ہے

شاعری میں غزل ایک مستقل اور اہم صنفِ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ غزل کی تیکنیک یہ ہے کہ اس صنفِ شاعری میں عام طور پر پانچ، سات یا نو شعر ہوتے ہیں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ جسے مطلع کہتے ہیں۔ غزل میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہو سکتے ہیں۔ باقی اشعار کا مصرع ثانی قافیہ دار ہوتا ہے۔ آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں۔ جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

عام طور پر عشقیہ مضامین ہی غزل کا اصل روح ہوتا ہے۔ مے اور بے نوشی بھی اس کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے شعراء نے غزل میں تصوف اور اخلاقی مضامین کو بھی وضوع سخن بنایا ہے اور بہت سے شعراء نے قومی، وطنی، سیاسی اور سماجی حالات کو بھی غزل میں ذریعہ اظہار بنایا ہے۔

غزل کے لفظی معنے عورتوں سے باتیں کرنا اور ان سے عشق بازی کرنا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ غزل زخمی ہرن کی چیخ آہ و بکا کو بھی کہتے ہیں۔ ایران کے ایک ممتاز شاعر شمس قیس دازی غزل کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ

نیسب جو قصیدہ کے آغاز میں ہوتا ہے جسے تعزل بھی کہتے ہیں روایتی عشقیہ باتوں کا ذکر ہوتا ہے اور غزل میں ذکر عشق اور وصف حسن محبوب ہوتا ہے۔ نیز وہ ذاتی عشقیہ حالات وولوات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ غزل کا صدقہ چونکہ راحت و شادمان دِل ہے۔ اس لیئے اس کا وزن خوش آئینہ اس کے الفاظ سادہ اور معانی روشن ہونے چاہئیں۔ (۱)

شمس قیس دازی کا غزل کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ جب کتا ہرن کو شکار کرتا ہے اور ہرن بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں ظیف سی آواز نکالتا ہے۔ اور اس ظیف اور پر درد آواز سے کتا ایسا متاثر ہوتا ہے کہ ہرن کو چھوڑ دیتا ہے ۔ اسے "غزل الکلب" کہتے ہیں۔ (۲)

قدیم عرب میں لوگ شاعری یا شاعری کے کیا معنی اور مطلب لیتے تھے؟ ہوا یہ کرتا تھا کہ جو شخص عام آدمیوں سے بڑھکر کوئی دلکش ومؤثر تقریر کرتا تھا لوگ اسی کو شاعری کہتے تھے۔ جاہلیت کے دور میں زیادہ تر اسی قسم کی شاعری ہوا کرتی تھی جس میں برجستہ اور دلآویز فقرے اور مثالیں پائی جاتی تھیں۔ جو عربوں کے عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی

ا۔ ۲ صدیقی ظہر احمد "فارسی غزل اور اس کا ارتقاء"، مجلس تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور 1993، صفحہ 2-1۔

تھیں۔" یہی سبب تھا کہ جب قریش نے قرآن مجید کی نرالی اور عجیب عبارت کو سنا انہوں نے اسے کلامِ الٰہی نہ مانا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہنے لگے"(۱)

قبل از اسلام عربوں میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی آدمی شعر گوئی کرتا یا شعر گوئی میں کمال حاصل کرتا تو اُس کے کلام کا اُس وقت تک کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ وہ مکہ (عظام) میں آکر قریش کی مجلس میں اسے پیش نہ کرتا۔ اگر اہلِ مجلس اسے اچھا سمجھتے تو داد دیتے اور خوب دل کھول کر داد دیتے ورنہ اس کلام کو لغو اور بے کار سمجھ کر زائل کر دیا جاتا اور شاعر اپنا سامنہ لیکر رہ جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ دستور رواج پایا کہ جو زیادہ قابل تعریف شاعر ہوتا اُس کے کلام کو جو قصیدے کی شکل میں ہوتا تھا خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ لوگ خود آکر اس کلام کو دیکھیں اور شاعر کی عمدگیِ کلام کی داد دیں۔ لٹکائے جانے کی وجہ سے اس قصیدہ کو (معلقہ) کہا جاتا تھا۔(۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن کے بعد ان قصائد کو در کعبہ سے اُتار دیا گیا کیونکہ قرآن پاک کی فصاحت کے مقابلہ میں ان قصائد کی کوئی قیمت اور وقعت نہ تھی۔ تقریباً سات سو سال پیشتر جب غزل کا الگ وجود قائم نہیں ہوا تھا شعرائے عرب و عجم اپنے فنی شاہکار قصیدوں کی صورت میں پیش کرتے تھے۔ اُسوقت بھی کلام کی ابتداء عشقیہ اشعار ہی سے ہوتی تھی اگرچہ ان عشقیہ اشعار کو غزل نہیں کہتے تھے بلکہ "نسیب" یا "تشبیب" کہتے تھے"(۳)

اہلِ عرب التزاماً اپنے قصیدوں کے اولین چند اشعار میں محبوب سے مخاطب ہو کر اُس کے حُسن و شباب کا ذکر کرتے تھے جسے نسیب یا تشبیب کہا جاتا تھا۔ اہلِ ایران بھی انہیں کی تقلید میں قصیدوں کے شروع میں تشبیب لانے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ حُسن و شباب کے ذکر کے ساتھ ساتھ واردات و احساسات قلب کا ذکر بھی اس میں ذکر ہونے لگا۔ اس طرح عشقیہ اشعار کی زبان میں لطافت آتی گئی تو تشبیب نے "غزل" کا نام پایا۔(۴) اور پھر قصیدے سے الگ لکھی جانے لگی اور اس طرح غزل کا مفہوم متعین ہو گیا۔

۱۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، خواجہ، "مقدمہ شعروشاعری"، سنِ اشاعت ندارد (بار اول)، پبلشرز کشمیر کتاب گھر، اردو بازار، لاہور، صفحہ 35۔

۲۔ مخدوم غلام جیلانی، پروفیسر، "ادب عربی"، پبلشرز علمی کتاب گھر، لاہور، صفحہ 43۔

۳۔ "المعارف اردو اسلامیہ: غزل"، جلد 14، لاہور، صفحہ 491۔

۴۔ "المعارف اردو اسلامیہ: غزل"، جلد 14، لاہور۔ صفحہ 491۔

جس زمانے میں شاعری کا آغاز ہوا۔ عرب کی شاعری مدحیہ قصائد تک محدود تھی۔ عرب میں قصائد کا یہ انداز تھا کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے۔ جن کو تشبیب کہتے ہیں۔ پھر کسی تقریب میں ممدوح کا ذکر کرتے تھے۔ اس کو اصطلاح میں تخلص یا گریز کہتے ہیں۔ پھر مدح ہوتی تھی اور دُعا پر خاتمہ ہوتا تھا۔ قصیدے کے حُسن کا معیار تین چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ (۱) مطلع : یعنی قصیدہ کا پہلا شعر کس شان کا ہے۔ (۲) تخلص : یعنی ممدوح کا ذکر کس طرح بظاہر بلا قصد آ گیا ہے کہ گویا بات میں بات پیدا ہو گئی ہے۔ (۳) مقطع : یعنی خاتمہ کس عمدگی سے کیا ہے۔

اِن تین باتوں کو قصیدے کا معیار قرار دیا گیا۔ قصیدہ گوئی کے تین ادوار ہیں جنکی خصوصیت علانیہ ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔(۱)

اس طرح غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ اور یک ردیف ہوتے ہیں۔ غزل کے شروع کے دونوں مصرے ہم قافیہ ہوتے ہیں جسے "مطلع" کہتے ہیں۔ اگر دوسرا شعر بھی ایسا ہی ہو کہ دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو اسے "مطلع ثانی" کہتے ہیں۔ آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص آئے اُسے مقطع کہتے ہیں۔

غزل ایشیا کی پیداوار ہے اس لئے یہ قدرتی طور پر ایشیائی ذہن و فکر سے قریب تر ہے۔ بحر، قافیہ، ردیف اور فضائے حسن و عشق مختلف اشعار کے جواہر ریزوں کو ایک رشتے میں منسلک کر دیتے ہیں۔

غزل کے اشعار اگرچہ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں لیکن ہم اسے لازمہ غزل نہیں کہہ سکتے (۲) کیونکہ بعض اوقات کوئی خاص جذبہ ایک چنگاری کی طرح حیاتِ مختصر لیکر نمودار ہوتا ہے۔ اس قسم کا جذبہ ایک ہی شعر میں ادا ہو جاتا ہے لیکن بعض دفعہ ایک ہی جذبہ موج کی مانند بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کافی عرصے تک اپنے آپ کو قائم رکھتا ہے۔ یوں عربی زبان کی غزل ایک ارتقائی سفر کرتی نظر آتی ہے۔

ا۔ حالی، الطاف حسین ، "شعر العجم"، (جلد پنجم) ، پبلشرز حاجی فرمان علی اینڈ سنز، لاہور، صفحہ نمبر 1۔

۲۔ "المعارف اردو اسلامیہ : غزل" ، جلد 14، لاہور، صفحہ 491۔

براہوئی غزل اور بحر و وزن

زمین پر بسنے والے کسی بھی قوم کے ادب سرمائے کو صفات اور اصناف کی رو سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ادب کے اِن اصناف میں ایک نثری ادب اور دوسرے کو (نظم) یا شعری ادب کہا جاتا ہے۔ ادب جب بھی اپنے مخصوص حصوں میں تقسیم ہو۔ ایک نام پا کر ہی اپنے دوسرے اکائیوں سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن نثر کے لیئے کچھ ضابطہ اخلاق اور طور طریقے رواج پا چکے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی سیاح اپنے شہر یا ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے اور دورانِ سفر وہ اپنے روزمرہ کے حالات و واقعات کو ایک مخصوص طریقے سے تحریر کرے تو وہ ادب کا ایک صنف بن جاتا ہے اور اس کا مخصوص نام "سفر نامہ" کہلائے گا۔ یا اگر کوئی محقق ایک مخصوص انداز کو اپنا کر کسی موضوع کو زیر بحث لا کر تحریر کرے تو اس کا وہ تحریر صنف کے لحاظ سے "مقالہ" کہلاتا ہے۔ یہی مثالیں نثر کے دوسرے اصناف پر بھی لاگو ہوتی ہیں۔

یعنی بنا اشعار کے جو بھی تحریر ہو اُسے نثری ادب کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ادبی سرمائے کے دوسرے حصے کو شعری ادب کہا جاتا ہے۔ ادب کا یہ حصہ تمام تر اشعار میں موجود ہوتا ہے۔ یعنی ایک مخصوص قوم کی بہادری کے داستان کو "زرمیہ" انداز میں بیان کرنا۔ کوئی ماں اپنے تو موتود کو پیار کرتے ہوئے تصور میں اسے بہت بڑا آدمی دیکھنا چاہتی ہے۔ اس دوران وہ بے ساختہ کچھ اشعار کہہ کر اپنے بچے کی بڑھائی اور ماں کے ممتا کا اظہار کرتی ہے۔ ماں کے منہ سے ادا کئے گئے یہ کلمات شعری ادب میں 'نوری' کا نام پا کر اپنے دوسرے اکائیوں سے الگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شعری ادب کے دوسرے حصے بھی بلحاظ صنف الگ الگ نام مثلاً مثنوی، رباعی، غزل، نظم وغیرہ میں تبدیل ہو کر ادب میں ایک مخصوص نام کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لیکن شعری ادب کے یہ تمام اصناف ایک مخصوص انداز اپنا کر کہے یا ادا کئے جاتے ہیں۔ اس مخصوص طور طریقے کو شعری ادب میں بحر و وزن کہا جاتا ہے۔ بحر و وزن کے ذریعے ایک مخصوص محاور بنا کر ہی شعر کہا جا سکتا ہے۔ گویا یہ مخصوص طریقہ ایک قسم کا خاص پیمانہ ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے ناپ کر ایک محاور ایا بول کو شعر کے کالب میں ڈالا جا سکتا ہے۔ یعنی بحر و وزن اشعار کے ناپ تول کے لوزان کو کہا جاتا ہے۔ شعری ادب کے ناپ و تول کے ان رموز ان پیمائش کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) وزن : "شعر کے لئے وزن کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وزن کیا شے ہے ؟

دراصل وزن کے معنی تو "اندازہ" اور "پیمانہ" کے ہیں مگر اصطلاح میں اس سے مراد ہے دو کلموں کے حرکات و سکنات کا برابر ہونا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی شعر یاد (کلام) کو علم عروض کے مقررہ بحروں میں سے کسی بحر کے میزان پر تولنا وزن کہلاتا ہے۔(۱)

بحر : بحر کے لغوی معنی ہیں سمندر یا دریا۔ مگر اصطلاح میں بحر چند ایسے کلماتِ موزوں کا نام ہے جن پر اشعار کا وزن ھیک کیا جاتا ہے۔ بحر تین ٹکڑوں سے بنتی ہے اُن کو ارکان کہتے ہیں اور جز کو رکنی کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بحر ہے۔

خصوسنی، خصونی، خصونی، خصونی

اس کے چار ارکان ہیں اس بحر میں کہے گئے اشعار کا ہر مصرع مذکورہ بالا وزن کے مطابق ہوگا۔(۲)

یعنی اشعار کو ناپنے اور پرکھنے کے اس پیمانے کو علم عروض کہا جاتا ہے۔ علم عروض کے پیمانوں پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ وہ اصول ہیں جن پر عربی فارسی اور اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

بالکل اسی طرح براہوئی شاعری میں بھی علم عروض وضع کئے گئے ہیں۔ جو خالصتاً براہوئی شاعری کے مزاج کے مطابق ہیں۔ براہوئی سماج میں تخلیق ہونے والی شاعری چاہئے وہ لوگ گیت ہوں۔ مثنوی، یا غزل براہوئی کے خالصتاً بحر و وزن میں کہی گئی ہیں۔ براہوئی کے بہت سے شعراء ابھی تک اولی الذکر بحر و اوزان میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ جو عربی، فارسی اور اردو شاعری کے اصول ہیں۔

براہوئی شاعری کے اپنے بحر و وزن کے جو اصول یعنی اوزان و پیمائش شعراء نے وضع کئے ہیں۔ انکی تفصیل رزاق صابر کی کتاب "ادب نا بشخاک" میں یوں دی گئی ہے۔

۱۔ لاڈے۔لڈے۔لاڈے۔لڈے

لاڈے۔لڈے۔لاڈے۔لڈے

۲۔ لیلڑے، لاڈے، لیلڑے، لاڈے

لیلڑے، لاڈے، لیلڑے، لاڈے

۳۔ لیلڑے لا، لیلڈے لا، لیلڈے لا، لیلڈے لا

لیلڑے لا، لیلڈے لا، لیلڑے لا، لیلڈے لا

۱۔۲ ہاشمی رفیع الدین "اصنافِ ادب" سنگِ میل پبلشرز لاہور، 1991، صفحہ 17۔

۴۔ لیلڑوے لا، لیلڑوے لا، لیلڑوے لا، لیلڑوے لا

لیلڑوے لا، لیلڑوے لا، لیلڑوے لا، لیلڑوے لا

۵۔ لاڈے، لڈے، لاڈے، لڈے، لاڈے لڈے، لاڈے لڈے

لاڈے لڈے، لاڈے، لڈے، لاڈے لڈے، لاڈے لڈے

۶۔ لڈے لاڈے، لڈے لاڈے، لڈے لاڈے، لڈے لاڈے

لڈے لاڈے، لڈے لاڈے، لڈے لاڈے، لڈے لاڈے

۷۔ لڈے لا، لڈے لا، لڈے لا، لڈے لا

لڈے لا، لڈے لا، لڈے لا، لڈے لا

۸۔ لڈے لا، لڈے لا، لڈے لا، لڈے

لڈے لا، لڈے لا، لڈے لا، لڈے

۹۔ بر نازنا، بر نازنا، بر نازنا، بر نازنا

بر نازنا، بر نازنا، بر نازنا، بر نازنا (۱)

براہوئی شعراء کی اکثریت انہی طور میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جو بحر دوزن عربی، فارسی اور اردو شاعری کے بنیاد ہیں۔ ان بحروں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ خصوسنی خصوسنی خصوسنی خصوسنی

فنی لحاظ سے اس بحر کو بحر متعارب مثمن مسالم کہا جاتا ہے اور اس کے چار رکن ہیں۔

۲۔ مفاعلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین

اس بحر کو بحر ھزج مثمن سالم کہا جاتا ہے

۳۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

یہ بحر بحر رمل مثمن سالم کہلاتا ہے

1- سرپرہ، صابر، عبدالرزاق "ادب باشگاک" براہوئی ادبی سوسائٹی۔

۴۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

اس بحر کو بحر رجز کہا جاتا ہے۔

یہ وہ بحور ہیں جن کی مدد سے عربی فارسی اردو زبان میں شاعری کے اوزان پیمائش کو ناپا جاتا ہے۔ براہوئی شعراء نے بھی انکی اپنایا ہے۔ لیکن ان بحروں میں ابن خلیل کے اضافہ کر کے انکی تعداد بڑھادی ہے۔ جو اضافی بحریں کہلاتی ہیں۔

براہوئی زبان کے کچھ شعراء بھی انہی بحر و وزن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جہاں مثال کے لیئے چند ایک نمائندہ شعراء کے کلام کو ان بحروں کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

براہوئی زبان کے ممتاز شاعر محمد اسحاق سوز کے غزل کا ایک شعر جو عربی فارسی کے بحر متقارب میں کہا گیا ہے۔

کنف نوجوان ناتینائی پیالہ ئے

ہستم نادا موسم ئی برگچینا

اگر غزل کے اس شعر کو براہوئی شاعری کے بحر دوزن میں تولا جائے تو یہ

''لڈے لا۔ لڈے لا۔ لڈے لا۔ لڈے لا۔ بحر میں کہا گیا ہے۔ رزاق صابر کا ایک غزل جو بحر ھزج میں کہا گیا ہے۔ اس کا نمونہ

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

''زمانہ مونے ہڑ سوئے کنے داگمان الو

کنا شومنگا قسمت ہم کنے آمر باالو

یہ شعر براہوئی کے بحر

لڈے لاڈے لڈے لاڈے لڈے لاڈے لڈے لاڈے بحر میں کہا گیا ہے۔

براہوئی زبان کے ایک اور ممتاز شاعر امیر الملک مینگل کا بحر رمل میں کئے گئے ایک غزل کی مثال ہے۔

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

''نن جتائی نا تہارے ڈن کہ زلپاک پارنا

استے الپسٹ ای ہنیناوعدہ ءِ ولدارنا

یہ شعر براہوئی کے بحر رمل مثمن سالم میں اس طرح ہے

لیلڈے لا،لیلڈے لا،لیلڈے لا،لیلڈے لا

عبدالقادر اشیر کا ایک غزل جو بحر رجز میں ہے

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

"بادے سحاری نی ہنک ائے پھل ءِ بشخندہ کرک

بشخندہ کراو مختو گندے تے ھل نی ہم برک"

ان کا یہ غزل براہوئی شاعری کے بحر وجز میں اس طرح ہے۔

برنازنا برنازنا برنازنا برنازنا

براہوئی غزل میں تشبیع اور استعارے

براہوئی غزل میں بھی تشبعات اور استعاروں کا استعمال ہوتا ہے۔ لفظ تشبیع مشابہت سے اخذ کیا گیا ہے۔ یعنی کسی شے، آدمی وغیرہ کو اسکے مشابہ یا اُس لیں مشابہت رکھنے والی چیز یا آدمی کے ساتھ ہم پلہ یا ہمہ رنگی کو تشبیع کہتے ہیں۔ زندگی کے مختلف موارج اور شعبوں میں تشبیع کا اکثر اوقات استعمال ہوتا رہتا ہے۔ لیکن شاعری میں تشبیع کا استعمال بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ شاعری میں تشبیع کا وجود شاعری میں مان پیدا کر دیتا ہے۔

مثلاً ایک شاعر کو اپنا محبوب لیلیٰ یا سسی، شیرین یا جیولٹ لگتا ہے۔ یہ ہمہ رنگی ہی شاعری اور خاص کہ غزل کے سادہ بیانہ کو خوبصورت بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ جدید آہنگ میں کہے گئے سادے الفاظ کا استعمال بھی غزل میں دیشنی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اگر ایک شاعر خوبصورت الفاظ کے ساتھ خوبصورت جذبہ کو اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے۔ تر وہ شعر شاہکار بن جاتا ہے اور وہ شاعری یا غزل زیادہ پر کشش، تصنع اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح فارسی اور اردو کے غزلوں میں صنائع بدریع اور تشبیع و استعارے کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعری کے یہ فنی محاسن براہوئی شاعری اور خصوصاً غزل میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جسطرح تشبیع کے معنی کسی شے انسان عمارت مناظر فطرت سے ہمہ رنگی کو کہتے ہیں۔ اسی طرح استعارہ بھی اشاروں کنایوں میں تشبیع کی دوسری قسم ہے۔ استعاروں کے استعمال نے بھی براہوئی غزل کو دلپشن اور پر تاثیر بنا دیا ہے۔

اس کے علاوہ براہوئی شاعری اور بالخصوص غزل میں صنائع بدرائع کا بھی استعمال ہوا ہے۔ پروفیسر ظہر صدیقی شاعری میں اور خاص کر غزل میں ضائع وبدرائع کے استعمال کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ۔

”آرائشِ زبان و بیان ضائع وبدرائع لفظی و معنوی سے وابستہ ہے اور ایک اچھی غزل کے لیئے ضائع وبدرائع لفظی و معنوی کا استعمال بھی اہمیت کا حامل ہے اگر ضائع بدائع کے استعمال سے صرف تفریح طبع مطلوب ہو تو وہ مستحن نہیں عام طور پر اس سے تکلف اور تصنع پیدا ہوتا ہے اور اگر ان کے استعمال سے مقصود یہ ہو کہ بات پوری طرح واضح، روشن اور قاری اور سامع کے ذہن پر منقش ہو جائے یعنی ابلاغ کامل کا درجہ پائے اور تصف سخن بھی حاصل ہو تو غزل میں صنعت گری مستحسن ہی نہیں بحہ کلام دلپذیر اور پُر تاثیر ہو جاتا ہے۔ (ا)

ا۔ صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر ”فارسی غزل کا آغاز اور اس کا ارتقاء“ پبلشر تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور 1993، صفحہ 41-

فنی ٹیکنیک سے براہوئی غزل میں بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ جن کے استعمال سے براہوئی غزل تیکنیکی اعتبار سے دوسری زبانوں کے غزلوں کے معیار کے مطابق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ براہوئی غزل نے جب سے اپنی سفر کا آغاز کیا ہے۔اُسی میں فن کے اعتبار سے کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ براہوئی غزل میں تشبیہات کا استعمال فارسی اور اردو غزل سے آئی ہے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ براہوئی غزل فارسی غزل سے براہ راست متاثر ہے اور اُس میں فارسی جیسی خصوصیات ہیں۔

ذیل میں براہوئی کے چند غزل گو شعراء کے کلام میں سے کچھ تشبیہات کے استعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔

براہوئی غزل میں تشبیع کا استعمال براہوئی کے سب سے پہلے غزل گو شاعر ملا محمد حسن نے کی ہے۔اُن کی پہلی غزل جس میں تشبیع کا استعمال یوں ہوا ہے۔

"آہو، مور، انجُ اُس دشمن تیان رنجُ اُس

محمد حسن کسِ گنجُ اُس اسہ دم کہ ئی بریس

قدیم براہوئی شعراء صفحہ 24

اس غزل میں شاعر نے اپنی محبوب کو ہرن، مور اور تلور سے تشبیع دیکر اُس سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔

مولانا عبدالجید چوتوئی اپنی ایک غزل میں رسول اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اپنی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے رب کے محبوب آپ کے غلام مجید کے آنکھوں سے آنسو موسلہ دار بارش کی طرح بہہ رہے ہیں۔ ایک بار تو مجھے اپنی رُخ زیبا کا دیدار تو کرادو مولانا عبدالجید چوتوئی اپنی آنسوؤں کو موسلہ دار بارش سے تشبیع دیئے ہوئے کہتا ہے۔

"مجید نا مے خڑینک خنتیان شلک

مثال اٹ شنزہ نا بیحہ گلدرخ

عبدالجید چوتوئی جوش حبیب صفحہ 51۔

غلام محمد عمر دینپوری اپنے محبوب سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے اُس کو کوچے کے مٹی کو سرمہ کہہ کر اپنی محبت کا اس سے اظہار کرتا ہے۔

"عاشق ای محبوب اریٹ نازیبا انگا مونا

مشک نا درنا تُرمہ او توما ختنا کنا

قدیم براہوئی شعراء صفحہ 84

مولانا نور احمد محمد شہی کا اپنے محبوب سے عشق جب انتہا کو پہنچا ہے تو وہ عشق کے سمندر میں غوطے لگا کر اپنے آپ کو پروانوں کی طرح قربان کرتا ہے اور بلبل کی طرح اپنے محبوب پر فدا ہوتا ہے۔

وہ اپنی ایک غزل میں اپنے آپ کو بلبل سے تشبیع دیکر یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح بلبل پھولوں کا عاشق ہے۔اس طرح میں اپنے محبوب پر شیداؤں اس کا اظہارہ وہ یوں کرتا ہے۔

"ار یٹ بلبل صفت شیدا ئے قسمت کنے زیدا

جگر ٹپی دہیک دِتر خدا حافظِ نگہبان نا

کلامِ نور صفحہ 17

میر عبدالرحمان کُرد کو گئے دِنوں کی یاد نے اتنا ستایا ہے کہ وہ ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر بیتے دنوں میں اپنے محبوب کو یاد کرتا ہے اور پھر اس محبت میں ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے ایک اشارے پر فدا ہو جاتا ہے اور اپنا سب کچھ محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے داؤ پر لگا دیتا ہے۔

اپنی ایک غزل میں وہ بیتے دنوں کی یاد کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا نظر آتا ہے کہ میں اپنے محبوب کی صرف ایک اشارے کا منتظر رہتا ہوں وہ اپنی اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

"ہمدر ینگو ختاتے ہو شاہتے دے

کہ مجنون نا دوٹی مہار اللہ اللہ

شف گردک صفحہ 71

اسی طرح اپنی ایک اور غزل میں میر عبدالرحمان کرد اپنے آپ کو مجنون سے تشبیع دیکر یہ کہتا ہے کہ میں مجنون ہوں اور اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیئے صحراؤں میں بھٹک رہا ہوں۔

"ای عشق غرق اٹ مجنون اُٹ

اسہ دیرانی اس خواہوہ

شف گروک صفحہ 149

نادر قمبرانی کو اپنے محبوب کی طرف سے سرد مہری اور خلوص میں کمی کا شکوہ ہے۔ اپنی ایک غزل میں وہ اپنی محبوب کو لیلیٰ سے تشبیع دیکر یہ شکوہ کرتا ہے کہ میرے محبوب میں جذبہ محبت سرد پڑتا نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

''مس پودین انتے عشق ناجوزہ

اینو لیلیٰ ئی دلبری چ اف

شنزہ وگروک صفحہ 72

امیر الملک مینگل اپنے محبوب کے لبوں کو خوبصورتی کے پیمانے میں پرکھتا ہے اور وہ اپنے محبوب کے ہونٹوں کو گلِ لالہ سے تشبیع دیتا ہے وہ کہتا ہے۔

''اوپر نازاک جوڑک نازیبا

دُن خیسنا پھل ءِ گواڑخی ءِ

جورناپل صفحہ 69

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ براہوئی غزل فارسی سے متاثر ہے۔ فارسی غزل میں تشبیع اور استعاروں کا استعمال صدیوں پرانی ہے۔ اس لیئے براہوئی غزل پر ان اثرات کا پڑنا قدرتی امر ہے اس لیئے کہ براہوئی زبان بھی اسی خطے کی ایک قدیم زبان ہے براہوائی غزلوں میں تشبہات کا آغاز ملا محمد حسن نے کیا جسے نہ صرف درمیانی دور کے براہوئی غزل گو شعراء نے اپنایا بلکہ جدید دور کے براہوئی غزل گو شعراء نے اپنا کر اپنی غزلوں کو خوبصورت دلنشین اور سحر انگیز بنادیا ہے۔

براہوئی غزل میں تخلص کی روایت

براہوئی غزل میں تخلص کی روایت ابتداء ہی سے موجود ہے۔اس کے معنے رہائی پانے کے ہیں قصیدے میں ممدوح کا نام لانا یا وہ نام جسے شاعر اپنے لیئے مقرر کر کے یعنی شاعر اپنے لیئے جو شعری یا قلمی نام اپنے اشعار میں استعمال کرے اسے تخلص کہتے ہیں۔

ایرانی کے فارسی شعراء قصیدے کے حصے پر تخلص جسے گریز بھی کہتے ہیں اپنے ممدوح کا نام یا پھر وہ خود اپنا نام لاتے تھے براہوئی غزل میں تخلص کے استعمال کی روایت دراصل فارسی سے آتی ہے۔ شروع شروع میں فارسی شعراء میں یہ رواج کم تھا۔ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں غزل میں جب تخلص کا استعمال عام ہوا۔تو رومی سعدی، عراقی نے بھی تخلص کا استعمال کیا۔لیکن فارسی غزل میں سب سے پہلے رودکی نے اپنا تخلص استعمال کیا۔(۱)

اس طرح اگر براہوئی غزل کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو براہوئی غزل میں سب سے پہلے تخلص کا استعمال کرنے والے شاعر ملا محمد حسن ہیں جو براہوئی کے پہلے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے براہوئی غزل میں پہلی بار اپنے نام کا استعمال کیا ہے۔ان کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

''آہو، موروانجُس دشمن تیان رنجُس
محمد حسن کن گنجُس اسہ دم کہ نی بریس''

یعنی اے میرے محبوب تم بہت ہی حسین ہو۔ تمہارے چلنے کا انداز ہرنی کی طرح ہے تیرے ناز وادا مورنی جیسی ہیں اور تم تلور کی طرح چست اور چالاک ہو۔اسی لیئے میرے محبوب تم محمد حسن کے لیئے خزانہ ہو۔ آجا کر میں تیرے ہجر میں جل رہا ہوں۔

براہوئی زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر ملا ملک داد قلاتی جو گو کہ براہوئی کے پہلے غزل شاعر تو نہیں البتہ انہوں نے بھی اپنی شاعری میں اپنے نام کا استعمال کیا ہے جو صرف مذہبی اور اخلاقی شاعری کیا کرتے تھے۔

''ملک داد عالما تا خاک پائے

ا۔ صدیقی ظہیر احمد پروفیسر ''فارسی غزل اور اُس کا ارتقاء'' مجلس تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور 199 صفحہ 4۔

خدا غان خواہک ایمان ناعطائے"

پھر یہ سلسلہ آگے جاری رہا۔ انیسویں صدی کے نوشکی کے رزمیہ گو شاعر بشام نے اپنے اشعار میں اپنا نام استعمال کیا ہے۔ بشام مینگل اور بادینی قبیلے کے قومی شاعر تھے۔ انکے والد شاہ کریم بھی شاعر تھے۔ بشام کی البدیہ شاعری کیا کرتے تھے۔ جو اکثر و بیشتر رزمیہ موضوعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان کا اباب تھا جس کا نام انہوں نے بلبل رکھا تھا۔

"بلبل سر و نزر بابے

بشام ناست کیابے

بلبل نامی دباب جائے بغیر بشام اشعار نہیں کہہ سکتا تھا۔

ریکی بھی رزمیہ گو شاعر تھے۔ جو نوشکی کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے اشعار میں اپنا نام اس طرح استمعال کرتا ہے۔

"اڑے ریکی قرار کہ

اسہ شعر ئس تیار کہ

لغور مڑدے مہار کہ

پدریسہ قطار کہ "

براہوئی شاعری اور خاص کہ غزلوں میں تخلص کی روایت کو جاری رکھتے ہوئے بعد کے براہوئی شعراء نے اور خاص کر براہوئی غزل گو شعراء نے اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کے مقطع میں اپنا نام یا تخلص کا استعمال کیا ہے۔ ذیل میں چند ایسے شعراء کے غزلوں کے مقطع بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

مولانا عبدالمجید چوتوئی اپنا نام اپنے غزل کے مقطع میں یوں استعمال کرتا ہے۔

"دادریاڈئی اف کس ءِ تار ناقوت

عبدالمجید نانی مریس رہتہ پردہ پوش"

تاج محمد تاجل اپنے ایک غزل میں اپنے تخلص کا اس طرح استعمال کرتا ہے۔

"تاجل پاہک اُندن پانی

تینا قدرے تینٹ چانی

مولانا محمد عمر دینپوری نے اپنی ایک غزل میں اپنا نام اس طرح استعمال کیا ہے۔

"توار کر ساقی کوثرے تنگلگ نی کوثر نے پیالہ

دے آقیامت نا محمد عمر ھندن مرے جوانے"

مولانا عبدالعزیز قلندرانی اپنی ایک غزل میں اپنے نام کا اس طرح استعمال کرتا ہے۔

"ہمووقت فراموش کپس رب

نی دا عبدالعزیز خاک نادیرے"

پیر محمد نیمرغی اپنی ایک غزل میں اپنے تخلص کو یوں سامنے لاتے ہیں۔

عقل ءِ پلاس ہوش ءِ دریس اُستان دپک نے نیمرغی

اولادمال آن دوست اویس نی ناصرفت آن ٹلیپر"

مولانا محمد یعقوب شررودی اپنی غزل میں اپنے تخلص کا استعمال یوں کرتا ہے۔

"توارے داساشرودی ہورے

مشکل ءِ باز اف کنے یادا ے پتہ"

محمد اسحاق سوز ایک غزل میں تخلص کا استعمال اس طرح کرتا ہے۔

"شراب آن عشق نا ای سوز ہر دم

ہمیشہ شعر پادہ بے خودی ٹی"

میر محمد الفت ایک غزل میں اپنا نام اس طرح لاتا ہے۔

"زیبا کنا ہرنی پدا انتس کریٹ ای تو خطا

الفت ارے نے آفد امغہ تون اوڑان جتا"

محمد عارف ضیاء کا ایک غزل میں تخلص کا استعمال

"انت کلوا ینۃ مے اینو ضیاء

تینا زیانم تینٹ احسان کبو"

انور براہوئی کی ایک غزل

"است ناخل ارے ضروری شعر و شاعری کے انور

دمعہ غریبی خواہک غریب ناترجمان مننگ کے"

طاہرہ احساس

"بار دہم کس کتواحساس قصہ غاتیا

اُسر حقیقت واللہ افسانہ الوس"

اقبال ناظر

"ختم کین ناظر واقصہ ئے داسہ

نن اقبال تیناز وائے رنگین"

شمس ندیم

ہر ک شمس داسوچنگ ناہیت ئس ءِ

اخہ بے قدر قول واقرار ارے

عزیز مینگل

کپے چنگ نی است ءِ عزیز

کس اس مردءِ نیکن ثنائی

عبدالقیوم بیدار

بیدار آن اکہ استت اوناست صفائے

مچا جہان آن زیادہ است آتہ نی کنین اُس

امیر الملک مینگل

امیر باز ہنگن تبلیغ ودرس ءِ

یقین کیس کل آن شعر آک کیہو

افضل مراد

کناہم کمک نیتو شامل مراد

داشعر آتنی نا تخات انت انت

ظاہر شمیم

ہمودے ظاہر اِی تینا سمجھاٹ او غاری اوڑ تون اوار او غاٹ

تینا ہر ہیبت آن او مونے ہڑ ساتینا او دُن بے ضمیر مسک

حنیف مزاج

مس سنگتی ناتینا دشمن زماج دنیا

اس دشمن آتا نیامٹ است آن قریب ہر ادے ؟

عاصم فرید

شیف کرنی کاٹم ءِ عاصم فرید

نالغ اٹ شاغنگک دادرد آتا ہار

منظور بلوچ

کس اس بشخانے خل شارٹ اونن آد نیک بشخانن

اودے سر سوبی نا منظور دعا تین امر ایتن

عزیز راہی

خدا کپل بدل راہی اگہ تینے بدل کپن

ارا امیر ٹی نن قسمت آسر باز تموکن

یسین بسمل

نا عشق ٹی خدا غا بسمل داگنوک ءِ

تولوک مونیہ مون نے دیدار کین نن

اسلم پروانہ

داخرین آہیت اسلم پار مرباٹی ہر یک

داخدائی قہر سے یاچاوہ شیانے خناٹ

غمخوار حسن

رنگ محفل نادن انتئے دے پدے آن چین مس

اف حسن غمخوار حیران داخس او حیران ار یر

رزاق صابر

صفاپارے تینا پار یٹ بر ک کنتو محبت کر

بغیر س داڑان اسے صابر کنے چو ہیان الو

پروفیسر عبدالواحد مینگل

زمانہ اسماک مفس نیا مٹی

محبت نا مینگل کسر تازہ اے

یہ مقطع اُن چند غزلوں کے تھے جن میں براہوئی کے غزل گو شعراء نے اپنا نام یا اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔

اس طرح براہوئی غزل گوئی میں تخلص کی روایت موجود ہے۔

ترک النقاط براہوئی غزلیں

براہوئی میں ایسے چند ایک گنے چنے غزل گو شعراء میں جنھوں نے بے نقطہ غزلیں کہی ہوں۔ براہوئی ادب میں سب سے پہلے بے نقطہ غزلوں کو اسحاق نے سوز کے متعارف کرایا۔ انکی ایک بے نقطہ غزل یہاں بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

دردو ملا دروا ہم مسک دوا
درد مس دار وامر ہر ہم دما

اللہ اللہ اس کہ امر اودمس
وہ امر دلدار لوارس رودما

مس امر دلدار داسہ لا طمع
لا طمع اول ھلو حوردا

ہر ہوس مس گم کہ حاکم حالے ہر
رحم کر ولدار مہر س کوا

مس حرام آرام وعدہءِ وصل کر
مہر کہ ولدار حاکم کر عطا

حاکمس ہم مالکس ولدار ہم
عدل کر ہم رحم دا محمد(ا)

یعنی مجھے درد ملا اور پھر وہی درد میرا درمان بھی بنا۔ اسے واقعی تو خدا ہے کہ تو نے اسے حسن اور دلربائی دی ہے۔ میرا محبوب کیسے مجھ سے بے رُخی کرتی ہے۔ پہلے تو کبھی بھی میری دلبربا ایسی نہ تھی۔ میرا ہوش اڑ گیا ہے میرا اب کوئی خواہش نہیں رہا۔ مجھ پر اے نازنین اب رحم کر۔ میری راتوں کی نیند گم ہوگئی ہے اب اس ہجر شب کو ختم بھی کر۔ تم میرے حاکم ہو اور دلدار بھی عدل کہ اور رحم بھی اپنے محمد پر ۔

ا۔ سوز اسحاق ”جذباتِ سوز“ براہوئی ادبی دنیا بیخ واصل 1972 صفحہ 12۔

اسی طرح مولانا عبدالخالق لاہی کا بھی غیر مطبوعہ ترک النقاط شعری مجموعہ موجود ہے جس سے ان کی ایک غزل بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔

"الہی ورک دو سہوٹ اٹ مٹ
کہ وارلہ سہ ای رڑوٹ اٹ مٹ
ہراٹ اودے الاّ ادمر مس ورد
دوی ءِ کہ داساڈلوٹ اٹ مٹ
سامس کہ سر مس ورد گوداراٹ
کہ کوئنہ ٹی اودے ہروٹ اٹ مٹ
گلی ءِ ملاٹ اوڑ کہ الواصل
امراوڑ کہ سالس سلوٹ اٹ مٹ
ارے مر کہ ولدار کا ٹم ورے
کروٹ رُم امر اودہلوٹ اٹ مٹ
ہِٹک ہر لڑاام ارے گڈک اس
کوٹوکری اٹ اودمڑوٹ اٹ مٹ
سلام اس کہ ولدار راہی کرے
سلام آمر سکو کروٹ اٹ مٹ
سوائس کہ ولدار او مولوی
مروٹ دا امرای ٹہوٹ اٹ مٹ (۱)

بے نقطہ غزل کہنے میں نوجوان شاعر حمید عزیز آبادی نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انکی ایک غزل بے نقطہ پیش ہے۔

۱۔ بابا کی عبدالخالق "غیر مطبوعہ ترک النقاط شعری مجموعہ"

مہر و کرم کر

درد ے ملم کر

حالے ئہر ک دا

حالا رحم کر

ہر دے گرم اُس

مہرے درم کر

مومل سور ے

دکھ آئے کم کر

صحرائی گم اٹ

ملا سے دسم کر (۱)

یعنی محبت او کرم کیا کرو۔ ہر درد کے لیئے مرہم ہو۔ آمیرا حال دیکھ اور میرے حال پر رحم کر۔ کیوں روز غمگین رہتے ہو۔ تم پیار اور محبت کو اپنا دین اور دھرم بنالو۔ اسے جانِ جاناں آ دمیرے دکھوں کی کم کرو۔ میں صحراؤں میں گم ہوں۔

"تم آؤ اور صحرا کی اس پیاس کو بجھادو"

ترک النقاد شاعری کے علاوہ اس کے فنی محاسن میں محنت النقاط اور فوق النقاط اشعار کے بھی شامل ہیں، اس تیکنک کو فارسی اور اردو کے شعراء نے استعمال کیا ہے۔ خطے میں ایسے تجربات کے اثرات اور تقلید میں براہوئی شعراء نے بھی اس فن کو اپنی غزلوں اور شاعری میں آزمایا ہے۔ شاعری کے فنی محاسن میں یہ تجربہ گو کہ ایک مشکل کام ہے۔ لیکن براہوئی شعراء نے اس مشکل فن میں شاعری کر کے براہوئی غزلوں کو دوسرے ہمسایہ زبانوں کی ادب کی طرح معیاری بنادیا ہے۔ براہوئی شعراء میں محمد اسحاق سوز کا نام سر فہرست ہے۔ جس نے سب سے پہلے ترک النقاط فوق النقاط اور تمت النقاط شاعری کی ہے۔

۱۔ عزیز آبادی حمید غیر مطبوعہ شعری مجموعہ "شپاد"۔

باب پنجم :براہوئی غزل اور مضامین عشق

۱۔ عشق کیا ہے ؟

۲۔ حقیقی عشق اور مجازی عشق

۳۔براہوئی غزل اور مداحِ محبوب

۴۔براہوئی غزل اور رِندانہ مضامین

۵۔براہوئی غزل اور عارفانہ مضامین

عشق کیا ہے

عشق کیا ہے۔اس کے ماخذ کیا ہیں۔یہ ایسے سوالات ہیں جن کا مفکرین علماو دانشور ماہرین نفسیات اور فلسفیوں نے الگ الگ تشریحات کی ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ عشق عشقیہ سے ماخوذ ہے۔جس کو عشق پچاں یا آکاس بیل کہتے ہیں۔اس پودے یا بیل کا یہ خاصہ ہے کہ جس درخت پر لپٹتی ہے۔اسے خشک کر دیتی ہے۔یہی خاصیت عشق کی بھی ہے۔جس کو عشق کا روگ لگ جائے اُسے خشک اور زرد کر دیتا ہے۔(۱)

عشق کے سلسلے میں انسان کی تہذیبی تاریخ میں شروع سے دو رجحان رہا ہے ایک رجحان وہ ہے، جس کی موثر نمائندگی یونان کے افسانویت پسندوں نے کی ہے۔ جنہوں نے محبت وعشق کی تخلیق کا کام اتنا اہم خیال کیا اس کے لیئے ایک مخصوص دیوتا کی خدمات انہیں حاصل کرنا پڑیں۔اس کام کیلئے کیوپڈ کو چنا گیا جس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے تیر محبت کا نشانہ بناتا رہتا ہے یوں دیوتاؤں کا عطیہ ہونے کی بناء پر عشق یا محبت کی جو غیر معمولی اہمیت پیدا ہوتی ہے۔وہ ظاہر ہے۔(۲)

عشق کے اس فلسفہ اور تشریح کے بعد ایک اور مکتبہ فکر سامنے آجاتا ہے۔جو محبت اور عشق کی تعریف اور تشریح ایک نئے انداز سے کرتا ہے۔وہ مکتبہ فکر جس کی نمائندگی ابو علی سینا کرتے ہیں۔وہ محبت اور عشق کی کیفیات پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں عشق کہ ایک قسم کی جنون کا نام ہے۔

اسی طرح فرائڈ عشق کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق جنسی جذبہ سے پیدا ہوتا ہے۔اس کے بعد کارل مارکس نے کہا کہ عشق سرمایہ دارانہ عیش پسندی کا نتیجہ ہے۔یہ تمام نظریات اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں تاہم عشق کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت ہی انسان کا خمیر اور بنیاد ہے۔اس لیئے جہاں انسانوں کی بسی بستیاں ہوگی۔وہاں عشق و محبت کے عظیم داستان بھی ہیں۔دنیا میں کوئی بھی ایسی قوم نہیں گزری جنکے ہاں شاعری نا پید ہو۔جب ایسا نہیں ہے تو کوئی بھی قوم عشقیہ شاعری سے نابلد بھی نہیں رہ سکتی۔(۳)

۱۔صدیقی ظہیر احمد پروفیسر ''فارسی غزل اور اس کا ارتقاء'' مجلس تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور 1993، صفحہ 88

۲۔ تقی محمد سید ''روح اور فلسفہ'' اردو مرکز گنپت اور لاہور 1962ء صفحہ 22۔

۳۔نعمانی، شبلی، مولانا ''شعر العجم'' حصہ پنجم، سن اشاعت ندارد۔ صفحہ 22۔

ان کے علاوہ دوسرے بہت سے مفکرین ہیں۔ جنہوں نے عشق کی مطالب بیان کئے ہیں ان مفکرین میں سے چند ایک کی رائے یہاں پر درج کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اپنی کتاب فارسی غزل اور اُس کا ارتقاء میں لکھتے ہیں۔

''سقراط نے کہا کہ عشق یا دیوانگی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ملکوتی دوسری جسمانی ملکوتی دیوانگی کی چار قسمیں ہیں 1- کاہنانہ 2-عارفانہ 3-شاعرانہ 4- عاشقانہ

افلاطون نے کہا کہ انسانی روح اس سے پہلے کہ اس دنیا میں آئی عالم اور واح میں تھی وہاں اُس نے حسن مطلق یا غیر مطلق کو دیکھا تھا۔ اُسی سے آشنائی تھی پس جب روح اس عالم مادی میں حسنِ ظاہری یا حُسن مجازی کو دیکھتی ہے۔ اس حسن مطلق کو جسے اُس نے عالم ارواح میں دیکھا تھا۔ یاد کرتی ہے اور غم جدائی اور فراق کو محسوس کرتی ہے اس سے جذبہ عشق جاگ جاتا ہے اور وہ فریفتہ جمال جسمانی ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی عشق سے جو مجازی ہے اور عشق حقیقی بقول افلاطون حق اور حقیقیت کی جستجو کا جنون ہے اسے افلاطونی محبت بھی کہتے ہیں۔

اخوانِ الصفا نے عشق کی تعریف یوں کی ہے ''عشق نام ہے معشوق کے ساتھ متحد ہونے کے تحت شوق کا''

اشراقی علما کی نظر میں انسانی روح کا اشراق روح کل یا ذات واحد سے ہوا ہے۔ اس لیئے روح اپنے مصدر حقیقی کی طرف پرواز کر جانے کے لیئے بے قرار رہتی ہے۔ اس بے قراری کو فلاطینوس نے عشق کا نام دیا ہے۔(۱)

دنیا کے دیگر معاشروں کی طرح براہوئی معاشرے میں بھی یہ جذبات بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں۔ کوہستانی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ براہوئی قبائل جہاں فطرت سے قریب تر ہوتے ہیں اور اگر ایک طرف انکے دل پہاڑ کی طرح سخت ہوتے ہیں اور ہر قسم کے خطرات اور حالات کا بھرپور انداز سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہاں انکے دلوں میں بھی محبت اور پیار کے جذبات اسی طرح موجزن ہوتے ہیں جیسے کسی اور معاشرے میں۔

براہوئی شعراء نے بھی مضامین عشق کو مختلف اصناف میں نہایت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ قصیدے میں عشقیہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ مثنوی میں عشق مجازی کے مضامین ہیں براہوئی ادب میں ''مثوی ماہ گل'' کو خاص اور ممتاز مقام حاصل ہے اس مثنوی کی تمام داستان عشق پر مبنی ہے۔ براہوئی رباعیوں میں بھی عشق کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اسی طرح اگر براہوئی ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس زبان میں ابتدائی تخلیق ہونے والی شاعری

ا۔ صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر، ''فارسی غزل اور اُس کا ارتقاء''، پبلشر مجلسِ تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور، 1993ء صفحہ 89۔

میں مضامین عشق پائے جاتے ہیں خاص طور پر براہوئی لوک اصنافِ شاعری میں اس کا بھر پور اظہار ہو تا ہے۔براہوئی کے اکثر لوک گیتوں میں شاعر اپنے محبوب کے حسن و جمال اور اس سے والہانہ محبت کا بر ملا اظہار کر تا ہے۔

براہوئی زبان کے معلوم ادبی تاریخ میں پہلا عشقیہ داستان "مثنوی ماہ گل" ہے جو ماہ گل اور شیر جان کے پیار د محبت پر مبنی ایک عشقیہ داستان ہے۔

دیگر معاشروں اور ادب کی طرح اس معاشرے میں بھی عشقیہ واقعات تو جنم لیتے ہیں۔لیکن ایسے واقعات پر براہوئی معاشرے میں اظہار خیال اور موضوع سخن بنا معیوب خیال کیا جا تا ہے۔انکے ماحول میں ایسی گفتگو پر پابندی ہو تی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسے واقعات اور خاص کر عشقیہ واقعات عموماً منظرِ عام پر نہیں آتے۔

براہوئی کے زبان کے مشہور صوفی شاعر تاج محمد تاجل کی عارفانہ اور عشقیہ مضامین پر مبنی شاعری براہوئی ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہے۔اس نے عشق کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

"تم چاہو عشق مزارے
او سدا مست و خمارے
ہوش و عقل ناحاجت اف
معشوق تون اداوارے
نم چاہو عشق مزارے
عشق ارے سر تاج ءِ
ہوش ءِ عقل ءِ ادناراج ءِ
عشق نجیل بے چاج ءِ
تکبر ناپد خوارے
نم چاہو عشق مزارے
عشق عجب اورنگ ءِ
ملا قاضی تون جنگ ءِ

پروانہ ءِ او پتنگ ءِ

باغ اُن گل بہارے

نم چاربو عشق مزارے

کس سید منیر آن چپ ءِ

اونا مونٹ تا فونا کپ ءِ

ہڑدو جہان الل ہپ ءِ

چاہو کہ جوفہ ناپارے

نم چاہو عشق مزارے

ہر جہ ءَ عشق رسیفک

قاضی و ملاتے ریفک

او پنت و نصیحت ایتک

دادو نزدریا غامارے

نم چاہو عشق مزارے

تاجل نا دالانت حال ءِ

رب منے اونا سوال ءِ

ڈوھ گناہ بد حال ءِ

ظاہر ئی طبیب ہزارے

نم چاہو عشق مزارے(۱)

براہوئی کے مشہور غزل گو شاعری عبد المجید چوتوئی کے ہاں غزلوں میں عشق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔جو براہوئی شاعری میں عشقِ حقیقی کی ایک بہترین مثال ہے۔

۱۔ صابر، عبد الرزاق، "کلامِ تاجل"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1988ء، صفحہ 34۔

ئُم است ئی کہ لگانا عشق نا رسول

ملیم تہ داوے پاش کر خفتے خماریا

یعنی میرے دل میں عشق کا جو تیر پیوست ہو گیا ہے اسے میرے رسول اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے خمار آنکھوں کی دیدار تو کرا دو،

عبد المجید چوتوئی کی ایک اور غزل میں عشقیہ مضامین اسطرح سے بیان کئے گئے ہیں۔

"پنا مبارک آ ارے عاشق کے وِرد چا

مشاق نا جمال کن سزان ہر دما"

یعنی وہ رسول کے نام کا عاشق ہے وہ اس نام کا ورد کرتا رہتا ہے۔ رسول اسے اپنا جمال دیکھا تو دو۔ اس دیدار کے لیئے جو بھی سزا ہے۔ اسے قبول ہے۔

براہوئی کے ایک اور مشہور شاعر محمد اسحاق سوز اپنی ایک غزل میں کہتا ہے کہ دیوانگی میں بھی عاشق ہوشیار ہوتے ہیں بظاہر جو بھی عشق میں مست اور دیوانہ نظر آئے۔

"عاشقاتا اف گنوکی ہوشیاری آن کم

عشق ئی ظاہر اگہ کس مست دیوانہ ارے"

اپنے ایک اور غزل میں محمد اسحاق سوز کہتا ہے کہ عشق میں وفا کرنا لازمی ہے۔ مجھے یہ بتایا جائے کہ حسن کا کوئی مذہب بھی ہے یا نہیں۔

" عشق ئی لازم ارے کننگ وفائی دلبر پا

حُسن نا مذہب ئی دا لازم ارے یا اف کہ پا"

یہ وہ چند تشریحات ہیں جو عشق کے موضوع کے حوالے سے براہوئی زبان کے شعراء نے کئے ہیں براہوئی ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو براہوئی ادب کے ہر دور میں شعراء نے جہاں اور موضوعات پر شاعری کی ہے وہاں اُن کے ہاں عشقیہ مضامین لازماً پائے جاتے ہیں اس لیئے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ براہوئی شاعر خواہ جس مکتبہ فکر سے بھی تعلق رکھتا ہو اسکی شاعری میں عشقیہ مضامین پائے جاتے ہیں۔

عشق حقیقی اور عشق مجازی

غزل وہ صنفِ شاعری ہے جس کا زیادہ تر رنگ عاشقانہ اور صوفیانہ ہوتا ہے۔ عشق کی تشریح اہل علم و دانش نے اسطرح کی ہے۔ کائنات قدرتی مناظر اور خالق کائنات اور اس کے تخلیق سے محبت حقیقی عشق ہے۔ جبکہ اسی خالق کائنات نے جس حسن زیبائش و آرائش سے انسان کو نور دیا ہے۔ خالق کائنات کی طرف سے انسان کو عطا کردہ حسن و جمال کی ترہت کو عشقِ مجازی یا حسن مجازی کا نام دیا ہے۔ جو شاعر کو اپنی محبوب میں نظر آتے ہیں۔ جن شعراء کے کلام میں کائنات اور خالقِ کائنات کے بارے میں فکر جستجو اور اس بارے میں شاعر اپنی محبت کا اظہار کرے وہ عشقِ حقیقی ہی ہے اس فلسفہ فکر کو عام طور پر تصوف کہا جاتا ہے۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کہتے ہیں کہ :۔

"تصوف میں شاہد و مشہود ناظر و منظور طالب و مطلوب کی اصل ایک ہے اس لیئے صوفیاء نے عشق کی تعریف یوں کی ہے :۔

"جمیل حقیقی کا جمعاً اور تفصیلاً اپنے کمال کی جانب میلان"

غزل میں مضامین عشق کے سلسلے میں عشق زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ عشق ہی زندگی ہے۔ عشق سے انسان کا تعلق روزِ اول سے ہے۔ بلکہ ساری کائنات کی تخلیق اس حدیث قدسی کی روشنی میں کہ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں سو میں نے خلق کو پیدا کیا" عشق ہے یوں گویا فطرت انسانی میں جذبہ عشق موجود ہے عشق وجہ شرفِ انسانی بھی ہے۔ خلافت اور امانت الٰہی جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ صوفیا کی نظر میں اس سے مراد بھی عشق ہے عشق مذہب و ملت کی تفریق مٹا دیتا ہے اور انسان کو وحدت کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ مذہب عشق وحدت انسانی اور انسان دوستی ہے۔ عشق کرنا گناہ نہیں بلکہ سب سے بڑا گناہ دل آزادی ہے۔ (۱)

عاشق صادق، عشق کے سودے میں ترک مال، ترکِ دنیا، ترکِ دین، ترکِ نسب، ترکِ عقل، ترکِ نام و ننگ بلکہ جان بیعانے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے عشق درد و غم کا نام ہے یہ ایک ایسا ورد ہے۔ جو خود ہی دوا بھی ہے عاشق عشق کے

1- صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر "فارسی غزل آغاز اور اس کا ارتقاء" مجلس تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور 1993، صفحہ 89۔

دردو غم کو خاموشی سے سہتا ہے۔ لیکن کسی سے رازِ غم نہیں کہتا رازِ دل چھپنا بھی عشق کی روایت ہے۔

براہوئی زبان میں شعراء نے عشقیہ مضامین کو مختلف اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے۔ براہوئی قصیدے میں تغزل کے رنگ میں عشقیہ مضامین ہیں مثنویاں تو عشق ہی کی داستان پر مشتمل ہوتی ہے۔ جیسے براہوئی زبان میں "مثنوی ماہ گل" کی داستان ہے۔ اس مثنوی میں ماہ گل کی عشق اوراس کے عشق کی انجام کا داستان ہے۔

حقیقی عشق کو مضوع بنا کر مجید چو توئی کہتا ہے۔

"مر عشق ٹی خدا نا ذر . انگا مصطفےٰ نا

مر دستیان دنیا نا غمخوار مریک شکر لب"

یعنی خدا اوراس کے رسول کے عشق کرو

اس کے بعد ایک اور غزل میں مجید چو توئی کہتے ہیں۔

نے عشق دنیا ناپازا کفہ وچنانا

قیامت ءِ فراموش کریس دنے خدا کپ

تم کو عشق ہے۔ زندگی سے تم عشق کرتے ہو بیوی بچوں سے ایسے عشق نے خدا بچائے جس میں انسان قیامت اور روز محشر کو بھول جائے۔

صوفی شاعر تاج محمد تاجل اس طرح عشق کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ اب مجھے عشق صنم نصیب کر میں فقیر اور منتظر یار ہوں۔

نئے عشقِ صنم نارپ ستار نصیب کر

نن فقیر ارین زہیر نئے پار نصیب کر

ایک اور غزل میں تاجل کہتے ہیں کہ مجھے ازلِ سے عشق کا روگ لگ گیا ہے۔ اس کے لئے بھی شکر ہے کہ میرا رب تو ہے تیرا رسول صلی اللہ وسلم کیا عجیب پھول ہیں۔

"نئے عشق ءِ سدا مولا نا شکر کہ رب نی اُس

محمد یار رسول اللہ صنم نا گل عجب نی اُس"

مولانا محمد یعقوب شرودی کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ تم اس عاشق کو پسند کرتے ہو جو شور مچا مچا کر تیرا نام لے۔

"نے ہم ہے عاشق پسندے ہنگنٹ

ناپنٹ کہ غلغس شانگ ہمو"

اپنے ایک اور شعر میں مولانا شرودی کہتے ہیں کہ عشق کی شراب کے نشے میں محو ہو کر اس قدر مست ہو جاؤ کہ تمہیں قبر کے مٹی سے خوشبو آنے لگے۔

"کن شرابے عشق نا ہنداخہ باز

قبر پا مشی تیان برے گندنی کہ کاس"

یہ چند اشعار جنکا ذکر اوپر کیا گیا ہے کا تعلق عشقِ حقیقی سے ہے۔ یوں تو بہت سارے شعراء نے اپنے مثنویوں اور رباعیوں میں مضامین عشق بیان کی ہے۔ لیکن براہوئی غزل میں شعراء نے جو مضامین پیش کیے ہیں انکی اپنی رنگ ہے۔ تصوف نے اس رنگ میں اور زیادہ نکھار پیدا کی ہے۔ جو ہمیں عبدالمجید مجید چوتوئی، تاجل اور نیمرغی کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کے بعد صوفی عطا محمد مولانا اسماعیل عبدالخالق لابکی نے غزل میں عشق کی جہتوں کیفیتوں اور سوز و گداز پیدا کر کے تصوف سے اُشنا کیا۔ اس کے لئے براہوئی شعراء نے عشق مجازی کے مضامین کو بھی اپنی غزلوں میں موضوعِ سخن بنایا ہے۔ جس میں شاعر مضامینِ عشق کے علاوہ فراق کی بات کرتا ہے۔ محبوب کی بے رُخی بے وفائی اور اُس کے ظلم و ستم ذکر کرتا ہے۔ عشق کی یہ کیفیت عشق کے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ براہوئی غزل گو شعراء میں نادر قمبرانی، اسحاق سوز، عبدالرحمان کرد، اسلم پروانہ، حسن غمخوار رزاق صابر، عزیز مینگل، قیوم بیدار اور دوسرے بہت سے شعراء نے اپنی غزلوں میں عشق کے مضامین کو موضوع بنا کر مجازی عشق کی جہت اور کیفیتیں اور اس عشق سے وابستہ قدرت کے رنگوں کو اپنی محبوب میں دیکھتے ہیں۔ ان شعراء میں سے چند ایک کے غزلوں میں سے مجازی عشقیہ مضامین کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

غالب براہوئی اسحاق سوز کہتے ہیں کہ تو نے مجھے اپنی عشق میں بیمار کر دیا ہے۔ اے میرے محبوب کم از کم ایک دن تو اپنے مریض کے تیمارداری کے لیئے آؤ۔

"تینا کنے داعشق ئی بیمارنی کریٹس

داعشق نا مریض اُن نے ہر فنگ حسے"

اپنی ایک اور غزل میں اسحاق سوز کہتا ہے کہ اپنے نظر میں شوخی کی رنگ اور تیز کر دو۔ کہ اس سر مئی اور عشق کے شام میں شاہد خمار آجائے۔

کر نظر ٹی رنگ ءِ سوخی نازیات

عشق ناشالے خمار س دوبر ے

ایک اور شعر میں سوز کہتا ہے۔ کہ عشق میں ناموس نام کا کوئی چیز نہیں یہ تو قسمتوں سے ملتا ہے۔

عشق ٹی ناموس ناپن سوزاف

بخت ناجوانے میار س دوبر ے

رزاق صابر اپنی مجازی عشق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میں منصور سے برتر نہیں ہوں تو میری شخصیت اس سے کم تر بھی نہیں ہے میں تو عشق کا وہ دیوانہ ہوں کہ جاہلوں کے شہر میں جاکر عشق کا اذان دیتا ہوں۔

منصور آن ای زیات افت کم اوڑان افت ِ ای

عشق نا آذان تسُٹ جاہل آتا شار ٹی

ایک اور غزل میں رزاق صابر کہتا ہے کہ بیمار عشق کی کوئی دارو دوا نہ کیا جائے کیونکہ آج عشق خود بستر مرگ پر ہے۔

''بیمارے عشق ءِ دارو دوا ہپہ طبیب اینو

دنیا سلیس اوڑان مرک ءِ قریب اینو'':

اس غزل میں رزاق صابر یہ بھی کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ میں عشق کا مریض ہوں۔ اس مریض کے مرض کا کوئی علاج تو کرے اس مریض کے دل میں کس نے عشق کا خنجر اُتار دیا ہے۔

''اِی مریض اُٹ عشق نا کر نی دوا مرضِ کنا

اُست ٹی لگانے ٹپس عشق نا شمشیر نا''

قیوم بیدار مجازی عشق میں یوں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اے میرے محبوب بیدار کے ساتھ محبت اور پیار سے پیش اور کیوں اس کے دل میں خنجر اتارنے پر تلے ہوئے ہو۔

نچہ نی بیدارے آزاد کر صنم مہر و وفا

عشق نا کتار تون استے تڑسہ لنتہ کہ"

ایک اور غزل میں قیوم بیدار عشق کی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ تیرے عشق میں دن گزرے ماہ گزرے، سال اور پھر یہ سال صدیوں پر بیت گئے۔اے میرے محبوب میں نے تمہارے غم سہے ہیں۔صرف عشق کے اظہار کیلئے

"دے اسہ تو تو اسہ سال، سال ہنا صد سال مس

دلر باغمتے سہانٹ عشق نا اظہار ءِ کن

اُنکا اور غزل جس میں بیدار کہتا ہے۔

اِی مشگاٹ پوغ مسوٹ دا اصول عشق نا

عشق نا اِی دا سَخ ءَ ہلکونٹ پروانہ غان"

یعنی میں تیرے عشق کے غم میں راکھ بن گیا ہوں، عشق کے یہی اصول ہیں کیونکہ میں نے یہ اصول پروانہ کا شمع کے عشق میں قربان ہونے سے سیکھا ہے۔

براہوئی غزل گو شاعر عزیز مینگل کی عشقِ مجازی کی کیفیتیں اور رنگ منفرد ہیں۔وہ جب عشق کرتے ہیں تو دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔اسطرح کی عشق کی یہ کیفیت صرف اور صرف عزیز مینگل کے حصے میں آئی ہے۔اپنے ایک غزل میں وہ کہتے ہیں کہ

مہر نا رنگ اٹ رنگی ہزارک ءُ

عشق نا انتئے رنگ ءِ گوہان ءِ۔

یعنی اس نے محبت میں ہزار رنگ اور بدلے ہیں لیکن جس چیز کی کمی ہے وہ صرف عشق کا رنگ ہے۔

براہوئی زبان کے معروف شاعر عزیز راہی جنکی تمام تر شاعری عشقیہ مضامین پر مبنی ہے۔ایک شعر میں کہتے ہیں کہ عزیز تیرے لئے محبوب کی قید سے رہائی ممکن نہیں اس نے تو تجھے اپنے زلفوں کے ایک ایک تار سے باندھ کر رکھ دیا ہے۔

"خلاصی عشق نا قیدارے راہی کے نا ممکن

کرے بندی غریبے اتفتا ہر تار تو تینا"

ایک اور نوجوان شاعر عاصم فرید اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ شاعری اور عشق کا آپس میں چھولی دامن کا ساتھ ہے اگر کوئی شاعر عاشق نہ ہو اس کے اشعار بے بنیاد ہیں۔

در حقیقت شاعری ہم عشق ناسیال ئس ارے

شاعر س مف عاشق ئس شعر آک تے بے بنیاد اریر

اسلم پروانہ براہوئی زبان میں منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ انکی تمام تر شاعری انسانی کیفیات خاص طور پر عشقیہ جذبات کا اظہار ہے۔ براہوئی زبان کا یہ جوان نمرگ شاعر ایک جگہ کہتا ہے۔

عشق نا آوازے اینو ہر تہو طوفان ٹی

عشق نادو آن زُلار بلبل آک بوستان ٹی

عشق انسانے درے فرش آن بوز عرشان بوژ

عشق ٹی کافر متک چا دا خلے ایمان ٹی

آج ہواؤں، فضاؤں اور طوفانوں میں صرف عشق کی آواز آرہی ہیں۔ عشق ہی کی وجہ سے بلبل باغ اور پھولوں کے درمیان رہ کر بھی رو رہا ہے۔ عشق نے انسان کو فرش سے عرش تک پہنچادیا ہے۔ عشق میں کافر ہونا بھی ایمان کا جز ہے۔

براہوئی غزل میں دیگر مضامین کی طرح اکثر شعراء نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ براہوئی زبان کے کلاسیکل شعراء خاص طور پر دینی علما اور صوفی شعراء نے غزل میں عشقِ حقیقی کو جس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس سے انکی فنی پختگی اور عشقیہ مضامین پر گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ خاص طور پر مولانا عبدالمجید چوتوئی اور صوفی شاعر تاج محمد تاجل نے عشق حقیقی کو ایسے مجازی رنگ میں بیان کیا ہے کہ ان کے اشعار میں محبوب کا تصور ذو معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

براہوئی ادب کے دور جدید سے لیکر دور حاضر کے نوجوان شعراء تک سب نے عشقیہ مضامین پر خوبصورت اشعار کہے ہیں اور خاص طور پر نوجوان شعراء نے ایسے ایسے نئے خیالات اور افکار کو متعارف کرایا ہے جن کی وجہ سے براہوئی ادب کا دامن عشق حقیقی اور عشق مجازی پر مبنی اشعار سے مالا مال ہوا ہے۔

براہوئی غزل اور مداحِ محبوب

قصیدے نے رنگ بدل کر غزل نام پایا ہے۔ قصیدے میں بادشاہوں کی صفت وثناء اور مداح ہوتی تھی۔

اہل ایران نے عربی شعراء کی تقلید میں اپنے قصدیوں کو تشبیب سے زیبائش بخشا فارسی غزل میں عشق و عاشقی و مستی کے مضامین قصائد کے علاوہ رباعیوں قطعوں اور مسدسوں میں بھی شامل ہوئے اس لیئے غزل کی ابتداء سے پہلے یہ خصوصی موضوع دوسرے اصناف سخن میں پرورش پارہے تھے۔ قدیم شعراء کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عموماً دیارِ محبوب کی مدح سرائی کرتے ہیں دیار جاناں کے اشتیاق میں کوسوں قافلوں میں سفر کرتے چلے جاتے ہیں انکے کلام میں راتوں کی تاریکی تاروں کی چمک، بیابانوں کی وسعت کا اکثر سماں نظر آتا ہے انکے خیالات میں منطق استدلال نہیں پایا جاتا ایک خیال دوسرے سے مربوط نہیں ہوتا۔

عرب میں عشق کا یہ حال ہے کہ محبوب تک رسائی کی کوشش میں سرتن سے جدا ہو سکتا تھا۔ اس لیئے عربی معشوق عفت و عصمت کا خیال رکھتی ہے مطلب یہ ہوا کہ عرب پردہ نشیں عورتوں سے عشق کیا کرتے تھے اور اگر جب عشق کا لوگوں کو پتہ چل جاتا یا تو قبیلے والے شادی کردیتے یا پھر انکار کردیتے اور اس وقت محبوبہ پر زیادہ سختیاں قیدوبند ہو جاتی تھی۔

محبوب کے مکاں پر عموماً پیرہ بٹھادیا جاتا تھا۔ اس حالت میں بھی عاشق راتوں کو نظر بچا کر اور ہتھیار باندھ کر محبوب سے ملنے جایا کرتے تھے۔ کبھی مخالفین جاگ جاتے تھے اور تلواریں چل جاتی تھیں چونکہ عربی نسیب یا تشبیب کا اثر فارسی غزل نے قبول کیا ہے۔ لور اس طرح فارسی غزل کے اثرات براہوئی غزل پر پڑے ہیں۔ اس لیئے جو فارسی غزل کے اسلوب میں بالکل وہی اسلوب براہوئی غزل کے ہونگے۔

مجموعی طور پر براہوئی غزل اپنے ہم جہت پہلوؤں اور موضوعات کے حوالے سے غزل کی تاریخ میں اپنی ایک اعلےٰ حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیئے دلکشی اور عشقیہ مضامین اور محبوب کی مدح سرائی یا تعریف کے ساتھ ساتھ براہوئی غزل کی سماجی اور معاشرتی موضوعات کے اعتبار سے اپنا مقام ہے۔

براہوئی غزل میں عام طور پر تقریباً ہر شاعر نے حسنِ محبوب کی تعریف کی ہے۔ کچھ شعراء نے محبوب کی سراپا کو پیش کیا ہے اور کچھ نے چشم، زلف، رخسار لب کی مداح اس طرح کی ہے۔ کہ جیسے انکے اشعار خوبصورت موتیوں کے ہار

ہوں۔

ذیل میں براہوئی غزل گو شعراء کے چند ایک کا کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں وہ اپنی محبوب کی مدح سرائی میں صفت زلف محبوب، تعریف قدو قامت رُخ محبوب، محبوب کی ناک، لب، خال، چشم ناز وادا کی تعریف کرتا ہے۔

مولانا عبدالمجید چوتوئی نے اپنے محبوب کے خدوخال اور اس کے حسن وجمال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"نے آن غیر دوست کنے اف شاہ گلرخ

عذلت باز پریشان بیحہ شاد رُخ

خن خلتو کسے ناڈھن حُسن خوشنا

ہر کس خنا کرے ارمان ہزار وخ"

یعنی اے میرے محبوب زیبا رُخ چلے آؤ میں تمہارے نہ آنے کی وجہ سے پریشان ہوں تمہارے خوبصورت حسن کے دیدار کے لیئے میں بے چین ہوں تم اتنے خوبصورت ہو کہ آج تک کسی آنکھ کو تمہارے جیسے حسن کا دیدار نصیب نہیں ہوا ۔شاعر مولانا نور احمد اپنے محبوب کی ناک نقشہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں :۔

" ناکاتار بامس خنجر مثل او تو بے سچل

کروکے عجب اُست نا اد قلم او دلبر صنم"

یعنی خنجر جیسی ناک اور رُخ بے مثال خالق کی بے مثال تخلیق ہے۔

براہوئی کے ایک اور بزرگ شاعر بابا عبدالحق اپنے محبوب کی قدو قامت اور اس کے زلفوں کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"شیفک و شیپانک قد و بالاد زیب نا

ڈھعہ دوشہ تومہ زلفاتے کرینس برھنک"

یعنی میرے محبوب کی قدو قامت لمبی اور باریک چڑی کی مانند ہے اُس کے زلف آپس میں اس طرح پیچ وبل کھائے ہیں جیسے کوئی سانپ بل کھائے۔

براہوئی کے ایک اور بزگ شاعر نادر قمبرانی کہتا ہے کہ میرے محبوب کے قدو قامت زلف اور اس کے

زلفوں کی گھٹائیں دنیا میں بے مثال ہیں اس کے لب گلابی، آنکھ خماری ہیں۔

"نا جوڑک گلابی آ نا خنک خماری آ

دروشم نا کتابی آ نے آن بارو پین اف

عبدالرحمان کرد کو اپنی محبوب یوں نظر آتا ہے کہ :۔

اتنی مہا سندر اور خوبصورت طویل قامت میرا محبوب ہے۔ اُس کا بدن پھولوں سے بھی زیادہ نرم ہے۔

"زیب ناک او نا قد و بالادے

جان تہ نازک ءِ کہ پھلان زیات"

اسحاق سوز اپنی محبوب کی صورت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا حُسن و خوبصورتی چاند کی روشنی کے مانند ہے اور تمہارے ہونٹ جب مسکراتے ہیں۔ تو ان میں پھولوں جیسی بے خودی چھا جاتی ہے۔

نا حسن زیبدارا طوبے نا روشنی سے

جوڑتے ٹی خنیکا پھلاتا بے خودی سے

رزاق صابر اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے کہ جب میرا محبوب ساتھ کھڑا ہو۔ تو میں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی سرو کا درخت پاس ہی ہے جب وہ چلتا ہے۔ تو اس کا رفتار چکور جیسا ہے جب کوئی نمازی یہ منظر دیکھتا ہو تو وہ نماز بھول جاتا ہے۔

"ارے بالاد تہ اسپیدار ایلو رفتار تہ ککو نا

نمازے زاہد اُست آن دیر کہ راہی ءَ تہ مرے زیبا

عزیز مینگل اپنے محبوب کے مدح میں کہتے ہیں کہ میرے محبوب گلابی رنگ اور رخساروں کو دیکھ کر پھولوں اور چمن کے بھی پسینہ چھوتے ہیں۔

"گلابی آ رنگ آن تے رنگی گلاب ءِ

چمن کشا خیدس خنا کہ شباب ءِ

قیوم بیدار اپنے محبوب کی نازک بدنی کو یوں بیان کرتے ہیں کہ اے میرے جانان اور حسینوں کے سرتاج

تمہارا جسم گل لالہ سے بھی نرم و گداز ہے :۔

"نی گودی ارلیں دلبربا زیبلاتا
ارے گواڑخ آن زیات نازک بدن تا"

امیر الملک مینگل اپنے محبوب کے سراپا کی یوں تصور کشی کرتے ہیں :۔

"خدا زیبس دُنو تِس تہ
خقن تا دُنکہ آ ہو تے
یا دُن تراشوکا یاقوتے
دُنو جوڑ تِس تہ زیباؤ
انار و ہیدے مسور کن
اونا نازرک پلنا تا کن
دُنو خن تِس تہ زیباؤ
خمارٹ کٹّے کے حیران
ہرہ! ہرکس مرے بے جان
اریر زلفاک دُن اونا
جتائی تا مرے نن دے
ہمون مون و ہمون مُرغن
ولے دوستے امیر او
کہ زیاتے غریب اٹ کلن
کہ غیرت زیاتے ہر پکن (۱)

یعنی میرے محبوب کو خدا وہ حسن دیا ہے۔ جس کی آنکھیں ہرن کی آنکھوں کی طرح اس کے لب بغیر مسواک

ا۔ مینگل، امیر الملک، "جورنا پھُل"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 82۔

کے سرخ انار کی طرح اور اس طرح نازک کہ جیسے پھول کے پتے اسے قدرت نے وہ آنکھیں عطا کی ہیں۔ جنکے خمار سے لوگ حیران ہو جائیں۔ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے دم نکل جائے اس کے زلف جیسے جدائی کے لمبی راتیں اور لگے ایسا جیسے یاقوت کا تراشہ مجسمہ۔

عزیز راہی کو اپنے محبوب کی تصویر یوں دکھائی دیتی ہے۔

"اے حسن ازل رب جوڑ کرے زیباتا مے سر تاج
نا کماثما ہر زیبائے عجب دا حسنِ ازل نا تاج

نے شاہ جہانس دن کہ خنا جوڑا او نم کہ تاج محل
شاعر نا نظر تما کہ نے آ جوڑ او غزل نا تاج

چندی تے درے ہوشان صنم نا شوخ جوانی نا طوفان
چندی تے درے حالان تینا اسے شوخ صنم نا تاج

زیباتان درپس گوئے صنم ملانے شہِ خوبان نا لقب
ہندن کہ گلاب پھلاتا زیباتا نی اُس سر تاج

جاپان مرے یا امریکہ، یورپ مرے یا افریقہ
دا دنیا مرے یا باغ بہشت نے آٹ حسن نا تاج

راہی اے کرنس قید صنم زلفتا نی تینا زنجیرٹ
اُستے تہ پھلا، ہوشے نہ پھُلا ساہے تہ پھُلا نا تاج (۱)

راہی کہتا ہے کہ اے میرے محبوب تمہیں رب نے حسینوں کا سر تاج بنادیا ہے۔ تمہارے سر پر جو حسن کا تاج رکھ دیا ہے۔ شاہ جہاں نے جس طرح تمہیں دیکھا تمہارے لئے اسی طرح کا تاج محل بنوایا اور جب تم پر کسی شاعر کی نظر پڑی اس نے تم کو غزل بنادیا۔ تمہارے شوخ ناز و اداؤں نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔

جاپان ہو یا امریکہ، یورپ ہو یا افریقہ اس دنیا کے تمام حسینوں سے اور بہشت کے حوروں سے تم حسین اور

ا۔ راہی، عزیز، "دیوانِ راہی"، پبلشر خود، 1995ء، صفحہ 86۔

خوبصورت ہو۔اے محبوب راہی تیرے زلفوں کا اسیر بن کر رہ گیا ہے۔ جس کا تو نے ہوش اُڑایا دل چھین لیا ہے اور روح نکال دیا ہے۔

طاہرہ احساس اپنے محبوب کے سراپا اور اس کی سیرت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

حسینءِ او حسن نا سردار ارے
اَخہ ور کہ پاؤ خوش گفتار ارے
حیا نا ہم خوشبو ئس اوڑان بریک
وفا نا محبت نا حقدار ارے
اِی اونا صفتِ ءِ کروٹ انت انت
کپوت گام زیبا خوش گفتار ارے
ہم کُلان گچین ءِ ہم کُلان جوان
نا دیدار ءُ گفتار ءُ کردار ارے
بر احساس تو منزل آ گام خل
اگرچہ کسر بھاز دشوار ارے (ا)

کہ میرا محبوب بہت ہی حسین اور حُسن کا سردار ہے۔
اُس سے حیا کی خوشبو آتی ہے۔لاکھوں میں ایک ہے۔اس لیئے کہ وہ خوش گفتار با کردار ہے۔
یٰسین بسمل اپنے محبوب کے حسن و جمال اس طرح سے بیان کرتا ہے۔

"لب شکر دنان نے تو مرواری آ
پھل ونو اف گلشن د گلزار تو"

محمد حسن غمخوار کو اپنی محبوب کے خدو خال اس طرح نظر آتے ہیں۔
وہ کہتا ہے کہ میرا محبوب کوئی حور و پری ہے یا پھر قدرت کا بنا ہوا کوئی شاہکار ہے۔اس کی نگاہ جس پر بھی پڑتی

ا۔جنگ،احساس،طاہرہ،"صدف"،براہوئی اکیڈمی،کوئٹہ،1995ء،صفحہ 96۔

ہے۔ وہ دلوں کو چیر دیتا ہے۔ وہ شاعر کی شاعری ہے وہ باطن میں بھی اور ظاہری طور پر بھی اسے کوئی دیکھے اور سمجھے تو انہیں وہ کسی شاعر کی شاعری لگتی ہے۔ میں اسے سلام کرتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ ہم کلام بھی ہوتا ہوں۔ وہ بھی تو مہربان ہے۔ میرا محبوب سادہ لوح پہاڑی ہے۔

"حور د پری ئسے۔ کاری گری ئسے
الست آن کشک اُستے دھنو خوشی ئسے

اودے سلام کیوہ اوڑتون کلام کیوہ
او ہم تو مہربان ءِ سادہ ءُ مشی ئسے"

ایک اور شاعر ظاہر شمیم کو اُس کے محبوب کا تصور یوں دکھائی دیتا ہے۔

"اِی مصور نا تصویرے اینو خناٹ
تینا تُنّغ نا اِی تعبیرے اینو خناٹ

اونا زیبائی ہر کنڈا تالان ہس
اونا جلوہ ٹی کشمیرے اینو خناٹ"

یعنی آج مجھے میرے محبوب کا دیدار نصیب ہوا۔ جو میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ وہ اس قدر حسین و جمیل اور خوبصورت ہے کہ اُس کی اس دلکشی پر کشمیر کا گمان ہوتا ہے۔

براھوئی غزل اور رِندانہ مضامین

خطے کے دیگر زبانوں کی ادب کی طرح براھوئی ادب میں بھی رندانہ مضامین فارسی کی توسط سے آئے ہیں۔
براھوئی غزل میں دیگر مضامین کی طرح رندانہ شاعری بھی براھوئی غزل کی ایک روایت رہی ہے۔ رندانہ شاعری کے مختلف موضوعات ہیں۔ مثلاً مہ نوشی، کیف و مستی اور بادہ و ساقی سے متعلق اشعار کہنا۔ شراب کی تعریف مہ کشی اور مے خانہ شامل ہیں۔ رندانہ شاعری کی ایک الگ رنگ قلندرانہ مضامین کو اشعار میں بیان کرنا ہے۔ یعنی غزل میں اس کے علاوہ ملامتہ انداز میں بات کرنا یعنی گنہگاری۔ توبہ کرنے سے بیزاری وغیرہ کو رندانہ مضامین میں شمار کیا جاتا ہے۔

یوں تو رندانہ شاعری کے لیئے رُباعی بہترین اور سازگار ہوتا ہے۔ غزل بھی اس طرح کے مضامین کے لیئے بہترین میدان فراہم کرتی ہے۔ براھوئی شاعری میں رندانہ مضامین کا آغاز بیسویں صدی عیسوی کے آوائل کے شعراء کے ہاں سے ہوتا ہے یعنی تاج محمد تاجل اور عبدالمجید چوتوئی براھوئی زبان کے اولین شعراء خیال کیئے جاتے ہیں۔ جنھوں نے رندانہ مضامین کو رواج دیا۔ یوں تو دونوں کی شاعری میں عشقِ حقیقی کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ تاہم اس کیلیئے انھوں نے رندانہ مضامین کو اپنایا۔ انکے ہاں اب سے مراد عشق حقیقی سے لبریز جام ہے اور ان کے ہاں محبوب کا تصور بنی پاک ہیں اور وہ عشق کو ہر چیز سے بالا اور برتر خیال کرتے ہیں۔

عشق حقیقی کا اپنا ایک الگ رنگ اور مستی ہوتا ہے عاشق کو اپنے آس پاس موجود لوگوں اور سماج سے بے خبر ہو کر خالق کے ساتھ براہ راست مخاطب نظر آتا ہے۔ کیونکہ انھیں اس بارے میں کسی اور وسیلے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفی شعراء زمانے اور سماجی پابندیوں سے آزاد کیف و مستی میں خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ تاجل کی شاعری براھوئی ادب کے لیئے ایک بیش بہا خزانہ ہونے کے علاوہ معاشرے کی ترقی خدا کے ساتھ عشق دل کی صفائی، ظلم اور مظلوم کی طرف داری کا درس ہیں۔ تاج محمد تاجل کے یہ اشعار عشقِ حقیقی اور رندانہ مضامین کی بہترین مثال ہیں۔

"عشق بھنگ کنے کہ شرابے
اودے بے عقل پاہک خرابے
انتس اونا ڈوھ و گناہ تن
عشق ءِ دین و ثوابے"

یعنی عشق چاہے بھنگ یا شراب کا نشہ کیوں نہ کرے یہ کوئی بے وقوف انسان ہوگا جو کہے کہ بھنگ اور شراب پینا حرام اور خراب ہے عاشق کا بدی اور گنگاری سے کیا واسطہ عشق ہی دین اور نیکی کا کام اور ثواب ہے۔ براہوئی زبان کے ایک اور صوفی شاعر عبدالمجید چوتوئی نے بھی شراب اور مے کشی کو صوفیانہ انداز میں کلام کا موضوع بنایا ہے۔ انکی تصنیف جوش حبیب کے اشعار حضور صلی اللہ وسلم کے فراق میں دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں جو بہت صاف اور شیرین ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں اور اثر پزیری کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مولانا چوتوئی کے ہاں بھی زیادہ تر مضامین عشق حقیقی سے متعلق ہیں اور انکے ہاں بھی دیگر صوفی شعراء کی طرح رندانہ مضامین پائے جاتے ہیں اپنی شاعری میں ساقی میکدہ مے وشراب کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں اپنے ایک غزل میں کہتے ہیں کہ

ساقی شراب والا پیالہ ءِ پُر کہ نی داسا
دا بیمار آ برک حازق علاج ءِ تہ کہ نی چاسا
حکیم جلدی ہت دار وایت ڈواٹ تینا
مریض خن خلتے تینا شروع کر دوائی نا (۱)

یعنی اے ساقی مے کے تمام پیالے بھر کر رکھ دو۔ میں جس محبوب کے ہجر میں بیمار پڑ گیا ہوں آہی چاہتا ہے۔ آ اے میرے محبوب! تیرے جدائی اور فراق میں بیمار پڑ گیا ہوں۔ میرے محبوب آ دیکھ کہ تیرے جدائی کے غم سے نڈھال مریض کو اپنے آنکھوں سے دیکھ اور تب دوا کر لینا۔

اس کے علاوہ براہوئی کے ایک اور صاحبِ طرز شاعر مولانا محمد یعقوب شرودی نے بھی اپنی غزلوں میں رندانہ مضامین کو موضوع بنایا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

"جام عشق نا کہ ہر کسے تِسس
تلخی جوڑءِ سم خواہک ہمو"

یعنی اے میرے محبوب تو نے جسے بھی عشق کا جام بھر کر دیا ہے۔ اس کے لب تلخ جام سے سیر آب ہو گئے۔

اسی طرح رندانہ شاعری کی تسلسل کو براہوئی کے جدید شعراء نے بھی برقرار رکھا ہے۔ تاہم اُن کے ہاں

1- چوتوئی عبدالمجید "جوشِ حبیب" پبلشرز خود 1357 ہجری صفحہ 23۔

رندانہ مضامین ذو معنی ہیں نادر قمبرانی کہتے ہیں۔

" اُست آک پریشانو بے حد و حساب اینو

تمس کہ مرے لاڈی شاایتے شراب اینو" (۱)

یعنی اے ساقی میں جدائیوں کے عذاب میں مبتلا ہوں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں تکلیف کے دن گزار رہا ہوں۔ایسی حالت میں ساقی تو میر اسہارا بن جا۔ تم نے جتنے بھی جام بھر دیئے ہیں۔وہ مجھے لادے۔

نادر قمبرانی اپنی ایک اور غزل میں کہتے ہیں کہ غموں نے زندگی کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔اسے شیخ اس صراحی سے وضو نہ کر جسے تو نے پانی سمجھ رکھا ہے وہ انگور کے عرق اور پاک شراب ہیں۔

"غمک زندگی نا بھاز بے حساب

نیستی ناڈکھان استاک کباب

کپہ وضونی کوروئی دیراف

انگور نا ارغو دا پاکو شرابو " (۲)

رزاق صابر کے ہاں ساقی اور پیمانہ ایک نئے انداز سے لئے گئے ہیں اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں۔

"گر یار متو ساقی پیمانہ کہ مس انت مس

معمور شراباتیان میخانہ کہ مس انت مس

کاٹم نا تخنگ دو آن آغازے محبت نا

شمع غا اگر قربان پروانہ کہ مس انت مس (۳)

یعنی اگر مے خانے میں ساقی کے دوستی نہیں تو پیمانہ سامنے رکھ کر بھی کوئی مزہ نہیں۔ میخانہ شراب سے مغمور بھی ہو تو تب بھی اس میں دل نہیں لگتا۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر چلنا در اصل محبت کا آغاز ہے شمع پر گر پروانہ قربان ہو تو کیا ہے۔

جدید براہوئی شاعری میں اسحاق سوز ایک منفرد فکر و خیال رکھنے والے شاعر ہیں۔ انکے ہاں بھی رندانہ

۱۔ قمبرانی نادر "مشزہ وگردک" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1992، صفحہ 51۔

۲۔ قمبرانی نادر "مشزدہ وگردک" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1992 صفحہ 65

۳۔ صابر عبدالرزاق "چراغِ صابر" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1981 صفحہ 30۔

مضامین میں ساقی و میکدے کی باتیں پائی جاتی ہیں۔

"کچینا وخت ءِ گم کپہ خیالا تا فسانہ ٹی
بروکا وخت کی تینا گڑئس کہ زمانہ ٹی
صفتے اینو ساقی نا اونا میخانہ داوڑ
سرہ غاک ایڑے پیالہ ءِ شرلبا بیانہ ٹی (۱)

یعنی وقت بہت اہم ہے اسے خیالوں اور افسانہ گھڑنے میں ضائع نہ کر اپنے آنے والے نسلوں کے لیئے زمانے میں کچھ کر کے چلے جانا ساقی میں ترے میخانے کی داد دیتا ہوں کہ اس میں آنکھوں کے کٹوروں کو پیمانہ بنا دیا ہے۔

قیوم بیدار ساقی سے یوں درخواست کرتا ہے کہ اے ساقی مجھے میخانہ سے نا اُمید واپس نہ کر میں اتنا ستایا ہوا ہوں کہ کوئی آئے میرے حال کو میرے دل کے دروازے سے دیکھے تو اُسے میرے حال کا پتہ چل جائے گا۔

"ناأمید میخوارے کپہ ساقیامخانہ غان
حالتے برُہر کنانی است نادروازہ غان" (۲)

جدید براہوئی شاعری میں رِندانہ مضامین کو اپنی شاعری میں بیان کرنے والا ایک اور نامور شاعر عزیز راہی ہیں۔ عزیز راہی اپنے ایک رباعی میں ساقی سے کہتا ہے کہ اے ساقی مجھے آج شراب پلادے اور ساتھ ہی مطرب سے کہہ دے کہ وہ رباب سنبھالے تا کہ اس بے خودی میں اس پر عذاب زندگی کو بھول جاؤں۔

کناساقی کنف اینو شرابس
اینو مطرب ہتف چنگ و ربابس
دا دنیا فانی و ہم بے وفائے
ارے دا زندگی سکھ عذابس (۳)

اپنے ایک اور غزل میں عزیز راہی مے نوشی سے متعلق کہتا ہے۔

۱۔ سوز محمد اسحاق "گروشک" براہوئی اکیڈمی پاکستان کوئٹہ 1995 صفحہ 155۔
۱۔ بیدار قیوم "مشمبلاخ" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 89۔
۲۔ راہی عزیز "دیوان راہی" پبلشر خود 1995 صفحہ 913۔

کہ اے ساقی پیالہ بھر کر مجھے دے دو تاکہ مدہوش کر تھوڑی دیر کے لیئے اس دنیا اور زمانے کو بھول جاؤں

"شراِس شاساقی کنا پیالہ ئی

مرے ہوش یک سوغا خیالٹی"(۱)

اسلم پروانہ میخوار کی دیوانگی اور مستی کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دیوانگی کیا ہے قسم لے لو مجھے پتہ نہیں کہ دیوانہ کون ہے۔ میں پھر بھی یہ پوچھتا ہوں کہ مجھے شرابِ عشق اور میخانے کا پتہ بتادو۔

"شراب ءِ عشق و میخانہ اراد ے

گنوک تینٹ او پیانہ ار ادے" (۲)

براہوئی کے خاتون شاعرہ طاہرہ احسان میخانہ میں موجود رندوں کی مدہوشی کو یوں بیان کرتی ہے۔

محو ءِانتظار تولوک صراحی ردوٹی ءِ رنداک

نی افیس جام ءِ ساقی پیالہ ءِ میخانہ نا ہوئک (۳)

ان درج بالا مثالوں کے علاوہ براہوئی زبان کے جدید شعراء کے ہاں ایسی مکمل غزلیں بھی ملتی ہیں جو تمام ساقی اور شراب سے متعلق ہیں اور ان میں ساقی کو ایک علامت محبت بیان کیا گیا ہے۔

ایسے شعراء میں سے ایک نام رزاق صابر کا بھی ہے جو اپنی ایک پوری غزل میں ساقی سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اسے ساقی محبت کا شراب پلادو۔ آج سارے سے خانے کو لٹادو۔ آج کچھ زیادہ ہی پلادو۔

یہ رندانہ مجلس سحر تک محفل سراہوئے

شراب محبت کنف ساقیا

ایتو میکدہ پلف ساقیا

دار نداک صوب اسکان تولوک اریر

شراب اینو گیشتر اتف ساقیا

۱۔ راہی عزیز "دیوانِ راہی" پبلشر خود 1995، صفحہ 238۔

۲۔ پروانہ محمد اسلم "جذباتِ اسلم" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1995، صفحہ 112۔

۳۔ جنک احساس طاہرہ "صدف" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ صفحہ 97۔

خلیءِ اے صراحی ءِ پرغ
شر آباتا جوئےوہف ساقیا

ننانیام ئی رازدار نی اریس
صنم تون ملاقات کرف ساقیا

نشہ ئی حقیقت نامست کرننے
ہادث ناکیف ءِ ورف ساقیا

اینو راز نا کینہ ایتاتے نن
داپردہ ءِ نیام آن سرف ساقیا (۱)

براہوئی کے نامور شاعر اسحاق سوز کے کلام میں بھی رندانہ شاعری سے ایک پوری غزل اس طرح سے ہے جس میں وہ کہتا ہے۔

ساقی تمہارے آنکھوں کا خمار بادامی ہے۔ مجھ پر نگاہ محبت بھی تو ہو۔ مجھے تو نے اپنی زلفوں کا اس طرح سے اسیر بنادیا ہے۔ جیسے پوری دنیا میں شام ہو گی۔

ناخنکو واخمار نگا عجب بادام اے ساقی
نگاھس مہر ناپحٹ مرے انعام اے ساقی

کنے زُلفا تا پیچاتے ئی نی بندی کرینس ون
کرینس کھہ دنیا سے تی مچاشام اے ساقی

اِی پادہ است ءِ مجبورانی چپ کر تلوسہ کپہ
دلے نا یات ئی دیرے ارے آرام اے ساقی

قریب آتیان نردک اٹ قریبی ءِ ای پڑوک اُٹ
قریب آتا توای دو آن اریٹ بدنام اے ساقی

پٹکو کاتیان نا دا اسٹ اس سوز اسحاق ئے
نی ھلکس کل نادوتے اومس گیرام اے ساقی (۲)

۱۔ صابر عبدالرزاق "چراغ صابر" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1981ء صفحہ 17۔

۲۔ سوز محمد اسحاق "نگروشک" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1995، صفحہ 127۔

اسی طرح عزیز مینگل اپنی غزلوں میں رندانہ شاعری بھی کرتے ہیں انکے کلام میں رندانہ انداز اس طرح سے ہے۔

ھنٹیک جام نا آرزُو ساقیا

مرے جوڑ تا ہر دم صبو ساقیا

دے ونن ننکو نا مئے خوارا تے

فقط نا ہرے جستجو ساقیا

شرابءِ تخس مر رندا تیان

ننے وڑ تفک نا دا خو ساقیا

ننے جولا ہر فنے بشام ئی

گلس ننے ایت زُو ساقیا

ہتم نا دا دیکو خواہک عزیز

مردسن تتم دو پہ دو ساقیا(۱)

یعنی میرے لبوں کو جام کی آرزو ہے کہ ہر وخت وہر لحہ صبو سے ہمکنار ہوں۔اے ساقیا مجھ جیسے سے خواروں کو صرف تیرے ہی جستجو ہے۔ائے ساقیا اگر تم شراب کو رندوں سے دور رکھکر جام بھر لو گئے گی۔بہار میں اور پانی کے اندر رہتے ہوئے بھی میری پیاس نہیں بجھی۔اے ساقیا اگر کچھ نہ ہو تو صرف ایک گھونٹ پلا دو۔اے عزیز بہار کے دن ہیں کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہ میں اور میرا محبوب باہوں میں بائیں ڈالکر بہاروں میں کھو جائے۔

قیوم بیدار کہتے ہیں کہ اے ساقی میخوار کو میکدہ سے ناامید مت لوٹادو۔تم او میرے دل کی دروازے سے دیکھو کہ میرا کیا برا حال ہے۔اپنوں کے ساتھ اس قدر بھی دوری اچھی بات نہیں تم تو دیوانے ہو جو کسی دیوانے سے شکایت کرتے ہو۔

"ناامید میخوارے کپہ ساقیا میخانہ غان

حالتِ بر ہر کنانی است نا دروازہ غان

ا۔ مینگل، عزیز، "شلی"، براہوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 26۔

ناروائی جوان افک داخدر تینا تیتون

نی اولیس دیوانہ کہ کیسہ گلہ دیوانہ غان

ای ہشنگاٹ پورغ مسوٹ دااصولِ عشق نا

عشق نا ای دلنغ ءِ ہلکونٹ پروانہ غان

حالت ءِ کیوہ بیان ہنیسہ انتے ساقیا

مسونٹ ہیگانہ ای تینٹ تینا کاشانہ غان

باز ٹوکر کننگونٹ اک ایت اینو پیالہ ئس

جام نا پیالہ ءِ بیدار ال نی دردانہ غان (۱)

یہ وہ رندانہ مضامین تھے۔ جو براہوئی غزل میں اپنی مخصوص مطالب ومعنے کے ساتھ سفر کرتے آرہے ہیں۔ رندانہ مضامین یعنی مے و مستی ومدہوشی براہوئی غزل گوشعراء کے ہاں ذو معنی ہے۔ جہاں سے و مستی کے کیفیات کو براہوئی کے صوفی شعراء نے حقیقی عاشق کے دیدار یعنی رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے دیدار کے نشے میں مست ہونے کو کہا گیا ہے۔ وہاں ددسرے شعراء نے اسکی مستی کو یعنی حقیقی شراب کو اپنی کلام میں موضوع بنا کرے و مستی کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ رندانہ مضامین نے براہوئی غزل کو اپنی رنگینی مدہوشی مستی کے کیفیات سے رنگین تر بنادیا ہے۔

۱۔بیدار، قیوم، ''شمبلاخ''، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1989ء، صفحہ 89۔

براہوئی غزل اور عارفانہ مضامین

غزل میں دوسرے مضامین کی طرح عارفانہ مضامین بھی براہوئی غزل میں فارسی سے آئے ہیں۔ فارسی کی طرح براہوئی غزل میں بھی عارفانہ شاعری کی روایت رہی ہے۔ جسے عام طور پر تصوف کہتے ہیں۔

تصوف کا براہوئی شاعری اور خاص طور پر براہوئی غزل پر بہت زیادہ اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ تصوف نے ہی غزل کو بے باکی اور صداقت کا لہجہ عطا کیا ہے۔اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ ابتداء میں غزل میں جو عشقیہ ابتذال عریانی تھی۔ اسکی جگہ عشقِ حقیقی، محبتِ حق اور عشقِ رسول یعنی حمد و نعت کے تحت جذبات کے اخلاص نے لے لی اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی اور ملی مطالب بھی بہت حد تک تصوف کے ذریعے غزل میں داخل ہوئے" حمہ مشربیت، انسان دوستی اعلے اخلاق کے مضامین اور تعصب ریاکاری اور فرقہ پرستی کے خلاف افکار بھی تصوف کے ذریعے غزل میں پائے جاتے ہیں۔(۱)

اس کے علاوہ باری تعالیٰ کی یکتائیت کا تصور ترکِ دنیا فنا و بقا اس سے متعلق مطالب جو غزل میں پائے جاتے ہیں وہ تصوف کے زیر اثر براہوئی غزل میں آئے ہیں۔ تصوف کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ اس کے معنی بنیادی طور پر تزکیہ نفس تجلسہ روح اور تخلیۂ سر ہے۔ یعنی اپنی نفس کا تزکیہ یا اور اک اس طرح کیا جائے کہ نفس تمام دنیاوی خواہشات سے پاک ہو جائے اور صرف خدا کی عشق سے سرشار ہو جائے خدا تک پہنچنے کے مقصد نے عشق کے تصور کو وجود میں لایا اس طرح تصوف اور عشقِ حقیقی ایک ساتھ ہو گئے۔ ایک عاشقِ صادقِ اپنے محبوب یعنی خدا کی محبت میں تڑپ رہا ہے ہجر سے نالاں ہے وصال کا طالب ہے اس کے نظر میں کائنات کی تخلیق ہی عشق ہے۔

تصوّف دراصل سچائی صداقت کی تلاش اور جستجو میں محویت کا نام ہے۔ لہذا اس جذبے نے غزل کو سچائی و تکریم عطا کی ہے۔ براہوئی غزل چونکہ فارسی غزل سے براہ راست متاثر ہے۔

فارسی غزل پر تصوف کے اثرات اور آغاز کے بارے میں مولانا نعمانی شبلی کہتے ہیں کہ :۔

غزل کی تحریک عشق و محبت کے جذبات سے ہوتی ہے اور اس کی تعلیم کی پہلی ابجد عشق و محبت ہے تصوّف کا ابتداء اگرچہ تیسری صدی ہجری میں ہوئی لیکن پانچویں صدی اسکے اوج اور شباب کا زمانہ ہے اور یہی زمانہ غزل کی ترقی کا پہلا نوروز

1- صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر" فارسی غزل اور اس کا ارتقاء" مجلس تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج لاہور 1993 صفحہ 208۔

ہے۔(۱)

یہ وہ زمانہ تھا کہ دنیا میں تاتاری بربریت اور وحشت دنیا میں قائم حکومتوں اور سلطنتوں کا شیرازہ بکھیر دیا تھا اور انہیں ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزار رہا تھا۔ انکے ظلم و بربریت نے غزل میں سوز و گداز پیدا کیا۔ اس زمانے میں بہت سے مشہور فلسفی اور شاعر پیدا ہوئے سب سے پہلے کلیم سنائی نے غزل کو ترقی دی۔ کلیم سنائی وہ پہلے شاعر تھے۔ جنھوں نے غزل کو ایک علیحدہ صنفِ سخن کی حیثیت دی انہوں نے نہایت کامیاب عاشقانہ اور عارفانہ غزلیں کہیں اس کے بعد واحدی مراغی، خواجہ فرید الدین عطار مولانا روم اور عراقی نے غزل کو نہایت ترقی دی۔

یہ لوگ چونکہ عشقِ حقیقی کے دلدادہ تھے انکے کلام میں حقیقت کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ تاتاریوں کی بربریت اور سلطنتوں کی تتر بتر کی وجہ سے قصیدہ کی مقبولیت گھٹ گئی اور شاعری کی بہاؤ نے دوسری طرف کا رُخ کیا۔ جس کا ذریعہ اظہار غزل سے ہٹ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ ان تمام باتوں نے ملکر غزل میں اثر پیدا کیا۔ انکے بعد خسرو اور حسین نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اس زمانے میں شیخ سعدی پیدا ہوئے۔ طبیعت میں رنگینی تھی۔ نوجوانی کو حسن و عشق کے حوالے کیا۔ پیران سری میں حلقہ تصوّف میں شامل ہوئے وہ فطرتاً شاعر تھے۔ زبان میں اتنی روانگی اور خداداد تھی کہ ان باتوں نے ملکر غزل کو چار چاند لگا دیئے۔ انکی غزلیں ایران میں اتنی مقبول ہوئیں کہ انکے بعد خسرو اور حسین نے اس شراب کو اور تیز کر دیا۔(۲)

غزل چونکہ ہر قسم کی منافرت، سیاسی، تاریخی، معاشرتی اور مذہبی اقدار سے بالاتر ہوتی ہے اس میں اخوت اور بھائی چارے کی آمیزش ہوتی ہے چونکہ انسانوں میں جنگ و جدل کا سبب مذہبی منافرت ہے۔ دنیا میں لاکھوں کروڑوں جانیں اس کی بدولت برباد ہوئی ہیں۔ خود ایک مذہب کے لوگوں میں ذرا ذرا سی اختلافات پر نہایت ناخوشگوارت ساعتیں قائم ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو کافر اور مرتد کہتے ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اہلِ دِل ان نزاعتوں کو ناپسند کرتے ہیں اور جس قدر حقیقت پرستی اور عرفان شناسی کا اثر زیادہ بڑھتا ہے اسی قدر یہ خیالات مٹے جاتے ہیں اور نظر آتا ہے کہ سب اُسی ذات یکتا کے طالب ہیں اور سب اُسی کے عشق میں چور ہیں۔

اُسی زمانے میں صفویہ حکومت کا آغاز ہوتا ہے اور کچھ عرصے بعد تمام ایران میں طوائف الملو کی مٹ گئی ایک

۱۔ نعمانی شبلی مولانا ''شعراء العجم حصہ پنجم '' سن اشاعت ندارد پبلشر حاجی فرحان علی خان صفحہ 24۔

۲۔ نعمانی شبلی مولانا ''شعراء العجم حصہ پنجم '' پبلشر فرحان علی خان لاہور جلد اشاعت ندارد صفحہ 27-26۔

وسیع اور پر امن سلطنت قائم ہوگئی یہ خاندان خود شریف اور شریف پرور فضل وکمال کا نہایت قدر دان تھا۔ شعر و شاعری کو انہوں نے یہ عزت دی کہ حکیم شفائی کی تنظیم کے لیئے شاہنشاہ وقت نے راہ میں سواری سے اتر جانا چاہا۔ اُس زمانے میں تیموری خاندان ہندوستان میں فیاضیوں کا بادِل برسار تا تھا۔ یہ ساماں شاعری کی ترقی کے لیئے اب حیات سے کم نہ تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعری نے اس دور میں ترقی کے منازل طے کیئے۔

اس سے پہلے کبھی نہیں کیئے تھے اس دور میں غزل کی جس قدر طرزیں ممکن تھیں تصوّف کے سواسب کی بنیاد پڑ گئی۔ شعیت کو تصوّف سے ضد ہے۔ چونکہ تمام ایران میں جبراً شعیہ مذہب کو لاگو کیا گیا تھا۔ اس لیئے صوفیانہ شاعری کی بقا ممکن نہ تھی تاہم تصوّف میں کچھ ایسی بات ضرور موجود ہے۔ کہ لوگ نقالی کی کوشش کرتے تھے۔ انہی حالات میں غزل کا خمیر تیار ہو رہا تھا۔ اول تو جنگی زندگی کے باوجود شاید پرستی عام تھی۔ بڑے بڑے قاہر اور متشرع سلاطین علانیہ حسن پرستی کرتے تھے۔ انکے مداح میں جو قصائد لکھے جاتے تھے اُن میں اُن معشوقوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔ خود سلاطین شعراء نے فرمائش کر کے ایسے مضامین لکھوا لیتے تھے ترک غلام اور فوجی اکثر سادے اور حسین ہوتے تھے۔ ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء نے فوجی سپائیوں کی معشوقانہ تعریف کی ہے۔ اس کا جو اثر شاعری پر ہوا یعنی معشوق کی سر آپا اوصاف میں تمام رزمیہ اور رزمیہ اصطلاحیں آگئیں۔ یہی وجوہات موجود تھے کہ ادھر تصوّف کا دور شروع ہو چکا تھا۔ تصوّف کا مایہ خمیر عشق و محبت ہے اور چونکہ اکابرین صوفیہ میں بعض فطرتاً شاعر تھے اس لیئے انکے جذبات موزوں ہو کر زبان سے نکلے۔

قوم میں سپہ گری کا جوش ختم ہو چکا تھا۔ ادھر تاتاریوں نے تمام ملک کو ویران کر دیا اور تمام اسلامی حکومتوں کو دفعتاً خاک میں ملادیں۔ ان متواتر اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا سارا زور سوز و گداز اور درد بن گیا۔ اس لیئے غزل سے زیادہ کوئی چیز موزوں نہ تھی۔ اس عہد کی غزلیہ شاعری میں جو درد اور تاثیر ہے انہی اسباب کا اثر ہے اوحدی، مولانا روم، عطار خسرو، حسین ایسے ہی دور میں پیدا ہو سکتے تھے۔(۱)

ایران اور بلوچستان کے درمیان سینکڑوں سالوں سے تاریخی ثقافتی اور مذہبی رشتے استوار تھے۔ بلوچستان جغرافیائی اعتبار سے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے وسطی ایشیا ایران خلیجی ممالک اور ہندوستان کے لیئے پل کا کام دیتا ہے۔ بلوچستان کے مغربی سرحد پر واقع ہونے سے ایران کے ہر قسم کے اثرات چاہیئے وہ تاریخی ہوں یا ثقافتی یا مذہبی بلوچستان کے لوگوں کے

ا۔ نعمانی شبلی ''شعر العجم حصہ پنجم'' پبلشر حاجی فرحان علی خان سن اشاعت ندارد صفحہ 38-47۔

مزاج پر پڑنا قدرتی بات ہے۔ فارسی زبان میں تمام اسلامی فقہ شرع اور دوسرے علوم کا ترجمہ سینکڑوں سال پہلے ہو چکا ہے۔ للہذا فارسی خطے کا ہمسایہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں عام بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہاں بلوچستان میں بہت سے ایسے شعراء گزرے ہیں۔ جنھوں نے فارسی زبان میں طبع ازمائی کی ہے اور زمانے میں خوب نام پیدا کیا ہے مثال کے طور پر رابعہ خضداری کا نام سرِفہرست ہے۔ فارسی شاعری کے حوالے سے رابعہ وہ نام ہے جو رودکی کی ہمسر اور ہم پلہ شاعر کے طور پر مشہور ہیں۔

اس کے لیئے بلوچستان میں انگریزوں کی امد تک یہاں کا سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی۔ دربار اور دفتری زبان ہونے کی وجہ سے فارسی زبان کو بلوچستان میں خوب پنپنے کا موقع ملا ہے اس طرح رابعہ خضداری کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں نائب محمد حسن بھی فارسی غزل گو شاعر کے طور پر ابھرے اور پھر اس کے بعد یکے بعد دیگرے شعراء مثلاً گل محمد زیب مگسی اور مرزا علی احمد علیم اللہ علیم جیسے نامور شعراء پیدا ہوئے۔

اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اور نیتجتاً براہوئی شاعری اور خاص کر صنفِ غزل پر فارسی کے اثرات کا مرہونِ منت ہے۔ للہذا فارسی غزل میں جو تصوّف اور عارفانہ رنگ ہے۔ براہوئی غزل کا بھی وہی رنگ ہے۔

مولانا ملک داو براہوئی زبان کے پہلے شاعر ہیں۔ جنکا تمام کلام میں مذہبی رنگ موجود ہے۔ لیکن مولانا عبدالمجید چوتوئی براہوئی کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عارفانہ اور عشقِ حقیقی کے مضامین کا غزل میں تصوّر پیش کیا۔ مولانا عبدالمجید چوتوئی کی تمام شاعری میں عشقِ حقیقی سے نگاؤ نظر آتی ہے۔ وہ سچے عاشقِ رسول ہیں۔ انکے کلام میں سے چند اشعار جو وحدت الوجود کائنات کو خلق کرنے کے بارے میں ہیں چند ایک مثالیں پیش ہیں۔

"ایمان اتہ خدا غا اوڑان پد مصطفےٰ غا

خیال کپہ نی گناہ غا ایمان مرے سلامت

الپہ شرک خدا تو بے مثال ایک تینا تو

خوش مہ اونا ثنا تو ایمان مرے سلامت"

یعنی پہلے خدا پر ایمان لاؤ اور اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا بندہ اور رسول تسلیم کرو۔ تم گناہ کے طرف متوجہ نہ ہو تاکہ تمہارا ایمان ثابت سالم اور سلامت رہے اور صرف خدا کی ثناء بیان کرتے رہو۔

مولانا عبدالمجید چوتوئی خدا سے عشق کے بعد نبی آخر زمان کے بھی پکے اور سچے عاشق ہیں۔ اُس کا دل عشق

رسول سے لبریز ہے۔ اپنی ایک غزل میں کہتا ہے کہ

"ہندن ھمسین اُس دلبر نامٹ وشانے خنپر
داغمزدہ غاشانی ظلم و جفائے بس کر

ذاتا جمال ناکلان نازک بدن ءِ پھلان
خنک ناکسرا خیالی دیدار کنا اُست ابتر

اُست اف غم آن خالی بے وس در آنا سوالی
مُر کر نقابے مونان بدر منیر کہ ظاہر

عبدالمجید پارے جوان مُر نا درد آن بیمارے
دل جوئی ایت شافی نی دا وار آ اونا بر"

یعنی اے میرے رسول آپ کو اللہ نے بہت ہی حسین اور شیرین بنایا ہے۔ مجھے اس دنیا میں آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا اے میرے رسول اپنے اس مشتاق پر مزید ظلم نہ کر میرے نبی پر تیرا ذات ایک جھلک دیکھنے کے لئے میری آنکھیں بے قرار ہیں۔ میرے دل کو جو غموں سے بھر گیا ہے میں بے یار و مددگار تیرے در کا سوالی بن کر آیا ہوں نقاب چہرے سے ہٹا کر اپنے جمال اور حسن کا جلوہ تو دکھادو۔

تاج محمد تاجل براہوئی کے غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں انکی تمام تر شاعری غزلیں عشق اور عشق حقیقی کا درس دیتے ہیں۔

"ننے عشق ءِ سدا مولا نا شکر کہ رب نی اُس
محمد یار سول اللہ صنم نا گل عجب نی اُس

گلاب نا گل حسن میر ءِ حسین ءِ اونا پیر ءِ
جنت خاتون غمگیر ے علی سر تاج لقب نی اُس

ابو بکر صدیق ثابوت، عمر، جواہر ہیرا یاقوت
سخی عثمان غنی لاہوت، علی اعلیٰ نسب نی اُس

محور تون غوث ءِ نی کریاد۔ حیاروزی سیر اولیاد

اول آخرام نی آباد ننے ہر دخت طلب نی اُس

فقیر تاجل شکر صبر ، محمد باطن و ظاہر

نامرلی اول آخر شفاعت اوزوشب نی اُس"(۱)

یعنی ہمارا عشق صدا سے ہے اور صدا قائم ہے۔اسے میرے مولا میں تیرا شکر بجالاتا ہوں کہ ہمارا رب تو ہے۔ محمد صلی اللہ وسلم جو تیرے نبی اور رسول ہیں اور میرے محبوب ہیں۔اس کے بعد اہل ہاشمی اور رسول اللہ علی وسلم کے نواسے امام حسن اور امام حسین جو میرے مجلس کے میر ہیں۔ میں انکو اپنا پیر مانتا ہوں۔ خاتونِ جنت جو انکے غم میں نڈھال ہیں۔ ولیوں کے سر تاج حضرت علی ہیں۔ابو بکر صدیق عمر ہیرے اور جواہر ہیں۔ عثمان غنی اور علی اعلے نسب ہیں۔

تم نے اگر عشق کا آغاز کرنا ہے تو راتوں کو حضرت غوث اعظم دستگیر کو یاد کر اور اپنے لیئے حیاروزی اور اولاد کی التجاع کر اس کے بعد ازل تا ابد تم آباد رہو گے فقیر تاجل شکر ادا کر اور صبر کر محمد صلی اللہ وسلم کی عشق جو میرے ظاہر و باطن میں سرایت کر چکا ہے روزِ قیامت وہی تیری شفاعت کرے گا۔

نور احمد اپنے ایک عارفانہ کلام میں کہتے ہیں کہ اے میرے رب میری زندگی تمام ہوئی۔ میں نے گناہ کیئے اے رب میرے بیڑے کو پار لگادے نور احمد کا ایک عارفانہ غزل یوں ہے۔

"حیاتی ہنا مس ختم زندگانی

کرک پار بیڑا الہی کنانی

لعنت خلک غم پیالہ دو آن کنا تما

سلیتو خوشی نا شراب ان نشانی

یک لخت ویرانہ مس تازہ گلشن

کرے ظلم بے داد بادہ خزان نی

ا۔ صابر، عبدالرزاق "کلامِ تاجل" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1988ء صفحہ 31۔

مر وسس باغ ئی داسہ بالکل او خاموش

فراقت کہ مون ویرانہ غانی

ہوائے نسیمی بفک داسہ باغان

سبب داد ے افیس گل ءِ تازہ غانی

احد احمدی نا ہوکس توارے

کرک تھپ ءِ معلم طبیب حاذقانی (۱)

یعنی اے خالق میں نے یونہی زندگی گزار دی۔ میں نے گناہ کیئے اے میرے رب میرا بیڑہ پار لگادے میں نے غموں کے پیالے کو لات مارا ہے میرے پاس مسرت کے شراب نہیں ہے۔ جس گلشن کے بہار کو خوش آمدید کہا تھا۔ یک لخت خزاں نے آگیر لیا ہے۔ شاید نسیم سحر کا گزر اس طرف بھی ہو باد سحر نے باغ میں آنا اس لیئے چھوڑ دیا ہے۔ کہ جس پھول کے لیئے وہ اپنا فرضی پورا کرتا تھا۔ چمن میں وہ پھول نہیں ہے۔

اسحاق سوز کا ایک غزل جس میں عارفانہ اشعار یوں ہیں :۔

"دنیا دا بے بقائے عبرت کرک نی انسان

منہ دے نار گس ءِ ڈاڑا مفہ نی حیران

اخسہ مریس والی مالک جواہر آتا

بج و پردس داکان غیر س کہ نیک عمل آن

دارا امر سکندر والی جھان نا اسر

ہُر تا اُرادو اینو آخر ہنار داکان

اخسہ واڑے بیتوس سینگار کیسہ تینے

اسہ دے تل اٹ زمین تا آخر مرسہ مہمان

۱۔ گل خداداد "کلام نور" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1978ء صفحہ 24۔

نسخہ صحیح آداد ے قرآن نا دامن ءِ ہل

غافل مفہ نی ہر گز ررو چہ ، نماز، دین آن

اے سوز عیش رنگاک دنیا نا عارضی او

داکان ورک نی تیٹون نیک عمل نا سامان (۱)

اے انسان کیا تمہیں عبرت نہیں یہ دنیا فنا ہونے کو ہے۔ تم اس فنا ہونے والے دنیا کے رنگوں میں کھو گئے ہو۔ تمہارے پاس جتنا بھی مال ودولت ہوان میں سے کچھ بھی تمہارے ساتھ نہیں لے جایا جائیگا۔ تمہارے ساتھ اگر کوئی چیز ہے تو وہ تمہارا نیک عمل ہوگا۔ یہ زرین لباس جو تم زیب تن کرتے ہو۔ آخر ایک دن زمین میں منوں مٹی کے تلے دبے ہوئے ہو گے تمہارے لیئے اے انسان صحیح راستہ بس یہی ایک ہے کہ تم قرآن کا دامن تھامے رکھو۔ روزہ، نماز اور دین سے ہر گز غافل نہ رہو۔ اے سوز دنیا کے یہ حسین رنگ محض چند دنوں کے لیئے ہیں۔ تم اپنے ساتھ نیک و عمال لے جانا۔

حسن غمخوار بھی براہوئی زبان کے صوفی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں سے چند عارفانہ اشعار یوں ہیں۔

"ادا نگی نظر شاوہ نی آس خدایا

ہر لپارہ کادانی آس خدایا

دعا تئی پیدا اثر نی کرو کا

وادنیا نا نیام آن کسر نی کرو کا

کئے نیک وبد نا خبر نی کرو کا

مدینہ ٹی داکان سر نی کرو کا

ای فریاد وس یادہ نی آس خدایا

ارانگی نظر شاوہ نی آس خدایا

جہان کلے روزی رساں نی تروکا

کسر گم کروکے نشان نی تروکا (۲)

ا۔ سوز، اسحاق "جذبات سوز" پبلشر براہوئی ادبی دنیا بخشِ داصل بلوچستان 1972، صفحہ 10۔

۲۔ غمخوار، حسن "توبے نا بتا" براہوئی اکیڈمی پاکستان کوئٹہ 1996، صفحہ 17۔

حسن غمخوار کاایک اور غزل میں عارفانہ اشعار کانمونہ یوں ہے :۔

''محبت ننے زندگی تسونے

ننے ھیل اوہندغی تسونے

محبت ہر اوُر دوعائے پارہ

ننے غم تیان ہم خوشی تسونے

محبت خدا ناا سہ گنج ئسے

کہ گنگاتے یاودی تسونے

عبادت ئسے ناوڑ کینہ تہ

خدا اغا ننے داخودی تسونے

چھرک تیز مس داخہ بے سیوتی تا

کہ گوشے اثر خاخری تسونے

مرے مہر تالان وشت تالان

حسن ڈن دعا ظاہری تسونے (۱)

ان اشعار کا ترجمہ یوں ہے :۔

۱۔ میں جس طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ادھر مجھ خدا ہی کے رنگ نظر آتے ہیں مجھے جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ خدا ہے۔ دعاؤں میں جو اثر پیدا کرتا ہے وہ خدا ہے نیک اور بد سے باخبر رکھنے والا اور مرتبہ تک پہنچنے میں جو سبب کار ہے۔ وہ خدا ہے انکے دوسرے غزل کے اشعار کا ترجمہ یوں ہے کہ۔

۲۔ محبت نے انسان کو زندگی دی ہے محبت ہی نے انسان کو بندگی عطا کی ہے۔ محبت جس غم اور درد کے دوا کو کہتے ہیں اس نے انسان کو ہر خوشی دی ہے۔ محبت خدا کے خزانوں میں سے ایک خزانہ اور نعمت ہے۔ جس نے گونگے کو بھی زبان عطا کی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم محبت کو عبادت جان حق ادائی کرے۔ جس نے ہمیں خودی دی ہے۔

۱۔ غمخوار، حسین ''توبے ناتیتا'' براہوئی اکیڈمی پاکستان کوئٹہ 1996، صفحہ 27۔

اسلم پروانہ کے ایک غزل عارفانہ اشعار

"استان نیک تینٹ جواب

واللہ اعلم بالصواب

دیدار ناسامان عجب

لیکن حجاب آخر حجاب

مرد کرم اونا عجب

اُستاتے کیک اخس کباب

شہرٹ ارے اونا جمال

وشت اٹ ہم گوازخ گلاب

اینو کرے اخس عطا

ھمہ ہلپک دانا حساب

محبوب حق نن توارے

ملے اگر کوثر شراب

داڑے مرد دنیا فنا

دنیا ارے مثل حباب

ہمس مرے ہمت ننے

نفس ءِتینا تورِن خراب

اینواودے اسلم امر

ہر جاخنک تینہ عذاب (۱)

ان اشعار کا ترجمہ یوں ہے کہ انسان کو اپنے حساب کتاب کا جواب خود دینا ہے۔ اس دنیا کے مالک نے ایدار

۱۔ پروانہ ، اسلم "جذباتِ اسلم" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1995، صفحہ 65۔

کے جو قاعدے اور اصول بنائے ہیں وہ صرف شاید پردہ ہی ہے۔ جہاں بھی جاؤ صرف اسی ذات یکتا کی قدرت نظر آئے گی۔ اس نے آج جو کچھ عطا کیا ہے۔ کلاس کا حساب ضرور ہو گا۔

مختصر یہ کہ عارفانہ شاعری کی ابتداء مولانا عبدالمجید چوتوئی نے اپنے شاعری اور غزلوں سے کی۔ ان کے بعد کے شعراء تاج محمد تاجل اور مکتبہ درخانی سے وابستہ شعراء نے نہ صرف اس رنگ کو درجہ کمال تک پہنچایا بلکہ اس میں نئے نئے رنگ بھی بھرے۔ دورِ جدید میں بھی براہوئی غزل میں عارفانہ مضامین پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ دورِ جدید کے شعراء میں محمد اسحاق سوز، محمد حسن غمخوار، مولانا عبدالخالق لابئی، محمد اسلم پروانہ اور دوسرے بہت سارے نوجوان شعراء نے بھی اپنے کلام میں عارفانہ شاعری کی روایت کو قائم کرر کھا ہے۔

باب ششم: براہوئی غزل میں جدید رجحانات

۱۔ براہوئی غزل کا سیاسی اور معاشرتی پس منظر

۲۔ براہوئی غزل میں مقصدیت

۳۔ براہوئی غزل میں رُومانویت اور کلاسیکیت

۴۔ براہوئی غزل میں الم نگاری

۵۔ براہوئی غزل اور مزاحمت

۶۔ براہوئی غزل میں تنقید کا عنصر

۷۔ براہوئی غزل میں نفسیاتی رجحانات

براہوئی غزل میں جدید رجحانات

براہوئی غزل میں جدید رجحانات اور رویّوں کا اظہار قیامِ پاکستان کے بعد نمایاں ہونے لگا۔ گزشتہ ابواب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ جب ہندوستانی لوگ یا قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے سرکاری ملازمین اور عام شہری جب بلوچستان منتقل ہوئے اور بلوچستان آکر اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تو ان مہاجرین اور نئے آباد کاروں میں وہ ادیب، دانشور اور شاعر جو ادبی ذوق رکھتے تھے یا محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے یا دوسرے محکموں سے تعلق رکھتے تھے، اپنے طور پر اپنے تہذیبی اقدار کے مطابق یہاں مجالس اور خاص کر شعر و سخن کی محفلیں سجا لیتے تھے۔ وہ شعراء اور دانشور جنہوں نے برصغیر کی سیاسی تاریخ کے بہت سارے نشیب و فراز دیکھے تھے یا ہندوستان کے سیاسی بٹوارے کے بعد معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی رویّوں کو اپنے اشعار، مضامین اور دوسرے اصناف ادب کا موضوع بنایا کرتے تھے اور اس کا اظہار اپنے اشعار میں برملا کرتے تھے وہ ان مجالس میں بلوچستان کے مقامی شعراء، ادباء اور دانشوروں کو بھی مدعو کرتے تھے۔ ان ادبی مجالس کا مقامی شعراء پر بہت اثر ہوا۔ چونکہ براہوئی شعراء بھی ان دانشوروں کی نشستوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیئے ان براہوئی شعراء کے کلام میں بھی نئے رجحانات اور رویّے داخل ہوتے گئے۔ بلوچستان کے دانشور اور شعراء پہلے سے ریاست بلوچستان میں قبائلی جبر، ریاستی تشدد، برطانوی راج کے بعد انگریزوں کا بلوچستان کے سیاسی، داخلی امور میں بے جا مداخلت کے خلاف برسرپیکار تھے۔ نئے آباد کاروں کے ان مجالس سے وہ اور زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی ان تحریکوں کو جو سیاسی اور سماجی تھے، نئے انداز میں منظم کرنا شروع کر دیا پھر قیامِ پاکستان کے بعد نئے سیٹ اپ میں بلوچستان کے حالات اور انتظامی مستقبل کے سوال نے بلوچستان کے شاعروں، دانشوروں اور خصوصاً براہوئی شعراء کو جدید خطوط پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا اور پھر انہیں اپنی شاعری میں بھی ان حالات کو موضوع بنانا پڑا۔ یہی وہ حالات تھے جنکی بدولت براہوئی غزل کو پنپنے اور اپنے اندر سماجی، سیاسی اور قومی عنوانات کو جگہ دینے کے مواقع میسر آئے اور یہی وہ مسائل اور عنوانات ہیں جو براہوئی میں غزل کے جدید رویّوں اور رجحانات کا سبب بھی بنے۔

اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی براہوئی شعراء کو پاکستان کی دوسری زبانوں کے شعراء کو سننے، سمجھنے اور دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اور پھر رسائل اور جرائد نے بھی غیر براہوئی شعراء کے کلام کو براہوئی شعراء تک اور براہوئی شعراء

کے کلام کو پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں تک پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ مجموعی طور پر یہ وہ عناصر اور اسباب ہیں جن سے براہوئی غزل کو نئے رجحان، نئے رویئے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا موقع ملا۔ لہذا براہوئی غزل پر جدید رجحانات اور رویوں کے تناظر میں جو بھی اثرات مرتب ہوئے۔ ان سب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان جدید تبدیلیوں اور نئے رجحانات اور رویوں کے ذیل میں جو عنوانات زیرِ بحث آئینگے وہ درج ذیل ہیں : یعنی اس باب میں براہوئی غزل میں مقصدیت، براہوئی غزل میں رُومانویت اور کلاسیکیت براہوئی غزل میں الم پسندی، دورِ حاضر کے تقاضے اور نفسیاتی رجحانات وغیرہ جیسے تبدیلیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

براہوئی غزل کا سیاسی اور معاشرتی پسِ منظر

براہوئی قبائل کی تاریخ پر جب بھی نظر پڑتی ہے۔ تو تاریخ کے کسی بھی دور میں ہم انہیں حالتِ جنگ، انتشار، نقل مکانی، غربت وافلاس سے ہمکنار پاتے ہیں۔ قطع نظر اس نظریہ سے کہ بلوچوں (بنام براہوئی) کے طائفے کہاں سے آئے۔ براہوئی ایران کے تمام بادشاہوں کے عہد میں ہمیشہ منفرد آزاد اور خود مختارانہ حیثیت کے مالک رہے۔

بلوچوں کا یہ طائفہ جو تاریخ میں اکراد یا کُرد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ایران کے سامانی عہد یا ساسانی عہد سے لیکر عادل نوشیرواں کے عہد تک تاریخ میں خود تو نمایاں رہے۔ لیکن تاریخ سے ان کا ادب اور زبان غائب رہا۔

مختلف ادوار میں براہوئی قبائل کے جنگوں میں مت جانے ہی ان کے ادب اور زبان کو تاریخ کے تاریک گوشوں میں دھکیل دیا۔ ایران میں جس حکمران کی بھی بادشاہت اور حکمرانی رہی ہو انکے دربار شعراء کی موجودگی سے جگمگاتے تھے۔ اگر آج ایران کے حکمرانوں کی تاریخ اور داستان زبانِ زدِ عام ہیں تو یہ صرف اس دور کے شعراء کی مرہونِ منت ہے۔ اگر آج ایران کو پھر سے نذر آتش کیا جائے تو پھر بھی ایران کی تمام تاریخ اور ثقافت فردوسی کے شاہنامہ میں محفوظ ہوگی۔ یہاں یہ مثال دینے کا مقصد اور مراد ایرانی درباروں میں شعراء کی پرورش اور موجودگی ظاہر کرنا تھی کہ ایران کے مختلف بادشاہوں کے عہد میں شعراء کی سرپرستی کی جاتی رہی اور انکو بہترین کارکردگی پر انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی امراء اور بادشاہانِ وقت بے دربار میں شعراء کی پریزائی کیا کرتے تھے۔ اچھے اشعار کہنے پر انکے منہ لعل وجواہر سے بھر دیئے جاتے تھے۔ ہندوستانی بادشاہوں کے اس ذوق کو دیکھ کر بہت سے ایرانی شعراء نے ہندوستان کا رُخ کیا۔

لیکن بلوچستان میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُس کے حکمرانوں کے دور میں شعراء کو جگہ دی گئی ہو۔ عام طور پر یہاں معاشرہ قبائلی تھا۔ اسلئے شاعری کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں شاعری کا پیشہ کم تر لوگوں یعنی لوڑی، ڈوم یا مطرب وغیرہ کا تھا۔ لیکن بعد میں بہت سے ایسے نامور شعراء بھی پیدا ہوئے۔ جو نہ صرف براہوئی سماج کے سیاسی اور معاشرتی رویّوں میں تبدیلی لانے کے موجب بنے۔ بلکہ انہوں نے تاریخ میں خاص مقام بھی حاصل کی ان شعراء میں ملا محمد حسن، بھام، ریکی، مولانا نبوجان، عبدالمجید چوتوئی، مولانا محمد عمر دینپوری، قیصر خان، فیضل فقیر، مولانا عبداللہ درخانی اور تاج محمد تاجل وغیرہ شامل ہیں جنہوں

نے اپنی غزلوں میں یہاں کے سیاسی اور معاشرتی قدروں کو اُجاگر کیا۔

1839ء میں جب انگریزوں نے بلوچستان پر حملہ کر کے خان محراب خان کو شہید کر دیا تو اس عہد کے براہوئی شاعر ملا محمد حسن نے اس تاریخی اور سیاسی سانحہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

"پرنگی خسین آگوجے
پدٹہ ڈیڈو تا فوجے
نی پادریاؤنا موجے

کرینے مون سراوان ءَ
قلات نا میری ءُ وخان ءَ
بلوچ نا بزانگا شان ءَ

پرنگ سردارو میراتے
بلوچاتا حقیر آتے
بہاٹ ہلک او فقیراتے

کرے او فتے جتا خان آن
درے تا دین وایمان آن
شہید آتا بلند شان آن (۱)

ترجمہ :۔ فرنگی سرخ گوہے کی طرح ہیں اس کے پیچھے حرام خوروں اور مردار خوروں کی فوج ہے ایسا لگتا ہے جیسے دریا موجزن ہو۔

انگریزوں نے سراوان کا رُخ کیا ہے۔ انہوں نے قلات کی میری اور بلوچوں کے اونچے شان کو زمین بوس کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ فرنگی نے سرداروں، میروں، فقیروں کو قیمتاً خرید لیا ہے اور انہیں ان کے خان سے الگ کر دیا ہے۔ وہ نہ صرف خان سے الگ ہو گئے ہیں بلکہ دین وایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ لہٰذا وہ شہدا کے اونچے شان ومرتبہ سے قاصر ہیں۔

ا۔ قمبرانی نادر "وحدتِ افکار" حصہ براہوئی، صفحہ 478۔

اسی سیاسی سانحہ کو ریکی نے یوں بیان کیا ہے :۔

دے ئس پر نگی رُمب کرے
میری ءِ بھلا دمب کرے
سردار ولی محمد شہید
او مینگل آتاشہہ مرید
ورناتے کلے پچ کرے
سواری کے ھل وچ کرے
ہر پار غان مینگل برے
ہر کس قلات ءِ سر مرے
کافر پرنگ ملک ءِ پھلا
او ننگ و ناموس ءِ درے
شاباش کبودر مینگل ءِ
با اشترو سیاہ جنگل ءِ
تینا رخ چکا تفے
ولدالزیان ءِ بسح کرے
بور پیشکوی خرن خنی
اودین نادشمن ارے
کافر لعین باز سھمرے
توپ د توفک اوڑ تون ارے
مڑداتے باکاف ساہ تا
لس مال وکاٹم تویرے (۱)

ا۔ قمبرانی، نادر "وحدتِ افکار" حصہ براھوئی، صفحہ 81-480۔

ترجمہ :۔ فرنگیوں نے تیزی سے آکر قلات کی میری کو نیست و نابود کر دیا۔ ولی محمد شہید جو مینگلوں کے شہہ مرید ہیں نے نوجوانوں کو جمع کر کے قلات جانے کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں پر روانہ کیا۔ انہوں نے بہ آواز بلند کہا کہ اے مینگلوں جہاں بھی ہو۔ قلات کے طرف رُخ کرو۔ کیونکہ کافر نے ہمارا ملک ہم سے چھین لیا ہے۔ جس سے ہماری ننگ و ناموس خطرے میں ہے قابلِ فخر ہیں وہ مینگل جنہوں نے کمر کس لیئے ہیں۔ بورے بالوں والوں کے خلاف اور نیلے آنکھوں والوں کے خلاف جو دین کے دشمن ہیں۔ کافر بہت ہی طاقت ور ہیں۔ اُس کے پاس توپ اور بندوقیں بھی ہیں لیکن ہم بلوچ ہیں۔ ہم غیرت مند ہیں۔ ہمیں موت کی کوئی پرواہ نہیں۔

بلوچستان پر انگریزوں کے مکمل قابض ہونے کے بعد انہوں نے یہاں ہر سطح پر تبدیلی لانے کے لیئے منصوبہ بندی کی۔ انگریزوں نے بلوچستان میں سیاسی طور پر مستحکم ہونے کے بعد اپنی مذہب عیسائیت کے لیئے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اس عہد میں برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے عیسائی تبلیغی جماعتوں کی آمد ورفت شروع ہوئی۔ اس طرح بلوچستان میں مذہبی مداخلت کا بھی آغاز ہوا۔ ردعمل کے طور پر مقامی علماء نے ڈھاڈر میں مدرسہ درخانی قائم کر کے اس سیلاب کو روکنے کی سعی کی جو بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اس مدرسہ کے علما نے مذہبی شاعری کے ذریعے عام لوگوں کو کفر کی یلغار سے بچنے اور مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ ان شعراء میں مولانا محمد عمر دینپوری، عبدالمجید چوتوئی اور بعد کے علما نے براہوئی غزل میں دینی اور مذہبی مسائل بیان کیئے۔ اس طرح یہ صورت حال قیامِ پاکستان تک جاری رہا۔

قیامِ پاکستان تک براہوئی ادیب دانشور اور شاعر جن سیاسی حالات سے گزرے یہ سیاسی عہد غیر انسانی، عدم مساوات، جہالت، سرداروں کی بے راہ روی اور حکمرانوں کی عدم توجہی کا عہد تھا جس نے براہوئی شعراء اور ادیبوں کو دوسرے راستوں پر چلنے کے لیئے مجبور کیا۔ اس سیاسی عہد کو براہوئی شاعری میں جگہ تو دی گئی لیکن اس عہد میں براہوئی ادب کے قاری پیدا نہیں ہوئے۔ جس سے اس شاعری کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ شاعری کا ذریعہ اظہار محدود تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اور خاص کر ون یونٹ کے قائم ہونے کے بعد معاشرتی اثرات نے براہوئی غزل کو سیاسی اغراض و مقاصد میں رنگ دیا۔ اس عہد کے ممتاز عوامی شاعر اور شاعر انقلاب نادر قمبرانی تھے۔ جس نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں میں سیاسی بیداری کی مہم چلائی۔

نادر قمبرانی اپنے سرداروں کی خرمستیوں اور حاکم وقت کی بزدلی اور ڈرپوکی سے نالاں نظر آتے ہیں۔ وہ اس عہد کے تاریخی جہل اور استحصالی سماج کے بھی خلاف تھے۔ ان حالات کی عکاسی نادر قمبرانی نے نہ صرف اپنی غزلوں میں کی بلکہ ان

کی کئی نظمیں بھی ان ہی موضوعات پر مبنی ہیں۔

داپٹ وبیوان نا شعر
دامینگل و مشتا کسر
نیکن ہر دکوزدکہ بر
داقافلہ ئے موتانی در

بش مر کہ ورناو خت ہنا
دُو آن تا تاج و تخت ہنا
زہر نگ پلار ملے در یر
پرغ کہ تماخت ہنا

سیالاک ہنارالارننے
ولد اشفانٹ پارننے
نامرد وبے ہمت لغور
کم سیال وکٹوک چارننے

تکہ تلار جھلتا قسم
میری ناپٹ خلتا قسم
چلتن ناشم تلتا قسم
بولان ناول ولقا قسم

تینا بلوچستان کے نن
پٹ و جھل وبیوان کے نن
مست مال و مڈی ئے کرون
اتیون کہ ولد اجان کے نن

موناہنوکن سوب وشام

ہزل پہ ہزل گام پہ گام (۱)

دنیا کی سب سے بڑی نعمت آزادی ہے۔اس نعمت کو حاصل کرنے کیلئے لوگ اپنی سروں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔دنیا میں کوئی بھی ایسا سرزمین نہیں جس کی بنیادیں آزادی کے پروانوں کے خون سے نہ رنگے گئے ہوں۔آزادی حاصل کرنے والی اقوام چاہیئے وہ جنوبی افریقہ کے لوگ ہوں۔انگولا کے ہوں۔فلسطین کے ہوں،بوسنیائی ہوں یا کردستان کے ان ملکوں کے عوام نے اپنی لہو کا نذرانہ دیکر آزادی کے جنگیں لڑی ہیں اُن میں بہت سے اقوام نے آزادی حاصل کرلی ہے اور بہت سے ابھی تک شمع آزادی کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔

اپنی ایک غزل میں نادر قمبرانی آزادی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بلوانا شاغتہ کس آجوئی پنچپس اف
زندناولپارے داکا ثم تننگ دوبریک
ہنگل آورنا کوناموسے وطن نار کھپرد
زندگی ناداشرف او فناکہینگ زُدبریک
زہیلا کونجے تخنس نی پوٹوا تموکیتے اف
اونادیدن ڈکھ درنجاتے ممینگ دُوبریک
قوم کن آباد مرے جنت مرے اونا وطن
داگڑا بے دم ورنگ خواری کننگ دوبریک
زندگی ناسوبے تیناکا ثماکس کٹیو
سنگتی، سیلوٹ لوڑدہ رخ تفننگ دوبریک
آجوئی ناگودے دہن خمبٹی دسچا ھلیس
دابری پر دِترنا شویفننگ دوبریک

ا۔ قمبرانی نادر "مشنز،وگردک" صرحہ 91-90 پبلشر براہوئی اکیڈمی جون 1992۔

بے توار اعیش و آرام زندگی ئی مر کسے

زندگی پارہ تھو توز غم خلقٹ دو بریک (۱)

قیامِ پاکستان کے بعد "اپنے ملک میں اپناراج" کے جذبے سے سرشار لوگوں کا خیال تھا کہ اب ہمارا ملک آزاد ہے۔ اب ہم خود مختار قوم کی حیثیت سے جی رہے ہیں۔ اب انگریز سامراج کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ انگریز سامراج چلا تو گیا لیکن وہ اپنے ہم نشین چھوڑ گئے جو اس ملک کو انہیں کے طرز اور طریقوں پر چلانا چاہتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے کچھ ہی عرصے کے بعد ملک میں راتوں رات جمہوریت کا قتل ہوا۔ ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔ جو 1970ء تک پھیل گیا۔ 1968ء میں محمد ایوب خان نے اقتدار جنرل یحییٰ خان کو سونپ دی۔ جنرل یحییٰ خان نے صوبوں کو بحال کر دیا اور عام انتخابات کرائے۔ پھر جمہوریت نے نرم بستر پر کروٹ بدلی۔ لیکن صبح ہونے سے پہلے حکمران پھر جمہوریت کے نام پر پاکستانی عوام کو ایک دوسرے سے الجھائے رکھنے کی پالیسی پر گامزن ہوئے جو اُن کے پیش رو چھوڑ چکے تھے۔ 1970ء کے عام انتخابات میں بلوچستان میں عوام کی اپنی حکومت بن گئی جو مرکزی حکومت کو پسند نہ آئی۔ حکومت ختم کرائی گئی پھر وہی فیصلے وہی طور طریقے اپنائے گئے۔ بلوچستان میں فوج کشی کی گئی سیاست دانوں کو پابند سلاسل کر دیا گیا اور نوجوانوں کو اپنی بقاء کی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اس عہد کو جدید براہوئی شاعری کے سرخیل میر عبدالرحمان کُرد یوں بیان کرتے ہیں۔

پھد اجیل و زنجیر تا دور بس

پھد اتو فک و تیر تا دور بس

پھد اگولہ و بمب باری نا زور

پھد املکتی قہر و آفت نا شور

پھد انعرہ اس خلق مینگل علی

پھد الڑزہ ئی بسو گھسٹ و گلی

پھد امیر سفر خان نا ہکل توار

او نا دہشتان و شمناک بے قرار

1- قمبر انی نادر "شنزہ و گروک" پبلشر براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1992، صفحہ 64-63۔

آغا سلیمان غازی نازور

اونا تیر باری او نا گشت و کشور

لونگ خان مینگل گچینا امیر

وطن نا شہید آتا لوز ندہ پیر

شفع جان ہنگل تغان بش مروک

شہادت نا کیفو خمارے خنوک

شہادت نا درجہ شہادت نا شان

خوش اوفتیان پیغمبر آخر زمان

سیاہ مستانو واک مشتا تفیر

شہید آتا قبر آتیا پھر دسیر (۱)

جہالت، سماجی ناہمواریوں اور برے سماجی رسموں اور قبائلی جنگوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے۔ براہوئی زبان کے ایک نامور شاعر جناب امیر الملک مینگل بھی اپنے پیش رو شعراء سے ہم آواز نظر آتے ہیں۔ امیر الملک نے اپنی قوم اور ہم وطنوں کی زبوں حالی، افلاس، جہالت، غربتِ سماجی بے راہ روی، حاکم وقت اور ظالم سرداروں کی ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔

اپنی ایک غزل میں امیر الملک جہالت سے نفرت، علم سے دوستی، قبائل جھگڑوں سے نفرت اور اس ایٹمی دور میں بھی قدیم طرز زندگی پر کاروان کو چلانے کے خلاف اپنے ہم وطنوں اور دوستوں سے استدعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

نُم آبو دوستاک زندے تمارا

خلے بادن باؤن اڑی اِنگا نمارا

داجہاز و ایٹم تا دورٹی ہم

نن میل تار ندٹی صحرا بہ صحرا

1- محمد عبدالرحمان میر "شف گروک"، پبلشر براہوئی اکیڈی کوئٹہ، 1996، صفحہ 109-107

بہ پہ اری ئی دوزخ جوڑ کرے نُن
داز ندے زہیدار وپُر بہارا
نہ ڈس ونیکیہ منزل نا نشانے
وقاب تموکا جلاپ تا پہ تارا
سلیس نئے کاروان ونیکہ زہیر
ارین راہی دُن اُچے بے مہارا
نور اچمیک شوہر نا گمان
پدین کیر استخانے جوش ولارا
داتوے جانزدہ ناو پنگا ایکاک
اُمر آسودہ ہے زند لوچ وخوارا
داز ندٹ پوٹواجانی نا مراک
دُن توکاپے گر نتگا کشارا
بید مر آتے دولبدہ کین زندہ
بدی تے تکہ خن نن تلخ وزہرا
کتابی او کرینے ایت تم تن
امیرن نیت ہلبو نم خدارا (۱)

براہوئی معاشرہ کی اساس اور بنیاد قبائلی نظام پر قائم ہے۔ قبائلی نظام کے تحت ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا ہے۔ سردار کے علاوہ قبیلے میں شامل ہر طائفے کا اپنا ایک سفید ریش، معتبر ہوتا ہے۔ جسکو میر ٹکری وغیرہ کہتے ہیں۔ قبیلے کے ہر طائفے کے لیئے ان رہنماؤں کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ پھر مختلف قبائل قبائلی اتحاد کو مزید مضبوط بنانے کے لیئے خان کا انتخاب کرتے ہیں اس طرح تمام براہوئی اور بلوچ قبائل ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں۔ براہوئی معاشرہ جس کو اس کے اقدار دوسرے

1- مینگل امیر الملک جسٹس ''چور تا گل'' صفحہ 41-40 پبلشر براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، 1992۔

معاشرہ سے الگ اور منفرد کرتے ہیں۔ وہ اس کے اپنے وضع کردہ سماجی اقدار ہیں۔ کہ جس میں مہمان نوازی، باہوٹ کی حفاظت، خواتین کا احترام، وطن سے پیار، بڑے بوڑھوں کے حقوق بچوں کے حقوق کی حفاظت وغیرہ شامل ہیں۔

براہوئی معاشرے میں ان اقدار کی حفاظت اور حقوق میں جب بھی کوتاہی ہوئی تو براہوئی غزل نے انکی نشاندہی کی اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی۔

براہوئی کے ممتاز شاعر اسحاق سوز اپنے قوم کے جوانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور اُسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ زمانہ کہاں سے کہاں جارہا ہے۔

نناا ست غافل نماا ُست غافل
خلنگوا مرداِ مراداتا منزل
زمانہ ہر اکان ہراڑے رسینگا
ننے داخدراف خبر داخہ غافل
درد، اینو، پچہ ناحیستاتے ئی
او شاعر تینا شعرٹی کرنی داخل(۱)

ترجمہ :۔ اگر ہم بھی غافل رہے اور تم بھی تو ہم کسطرح اپنی مرادوں کے منزل کو پاسکیں گے زمانے کو دیکھ کہاں سے کہاں جا پہنچا اور ہم ہیں کہ اس قدر غافل ہیں۔

اسحاق سوز اپنے عہد کے نوجوانوں کو یہ پیغام بھی دیتے ہیں۔

بش مرک اینو خداد انوجوان ملک وملت قوم نا مرپاسبان
بئنے اینو کہ جنبش ٹی زمین چکرٹ اینو ارے ہر آسمان
کپہ غفلت غفلتان ننج دُو بفک، وقت اف آرام نا اسے مہربان
نعرہ تکبیر خلسانی ھنک، جنگ نا میدان ٹی اے نوجوان
نی اوبس شہباز بزرٹبال کر فتح نا ئیکن ہرد کے آسامان

1- سوز اسحاق "گردشک" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1995، صفحہ 196۔

سوز نا شعرے منک اے نوجوان

مرد مر اینو ارے نا امتحان (۱)

ترجمہ :- میرے وطن کے جوانو اٹھو! ملک، ملت اور قوم کے پاسبان ہو آج ہمارا ملک تاریخ کے برے دور سے گزر رہا ہے۔ تم خواب غفلت میں کیوں پڑے ہو۔ اٹھو اللہ کا نام لیکر میدان عمل و جنگ میں کود پڑو۔

غربت اور افلاس جو براہوئی معاشرے کو صدیوں سے ورثہ میں ملی ہے۔ عزیز راہی یہاں کے لوگوں کی زندگی کی منظر کشی اپنی ایک غزل میں یوں کرتے ہیں۔

چار کنڈان بے وساتا ہو غنگ وز مبار سے

زندگی سے انت نادادروتا امبار سے

ہر غیبے زندگی نا غم تیان اک واراف

میر ناہر دے اراٹی دھول ناڈ مبار سے

مال و دولت اچ سلیپک اچ گڑائے اف بقا

مفت نادا چار دے کہ منفرٹی غمبار سے (۲)

ترجمہ :- چاروں طرف سے غریب مفلس اور لاچاروں کی رونے اور آہ وزاری کی آواز سن رہا ہوں کیا یہ کوئی زندگی ہے یا کچرے کا ڈھیر آج ہر کوئی بے بس غریب غموں کے بوجھ تلے ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن امراء کے گھر پر روز خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔

درج بالا اُوپر کے بیان کردہ وہ واقعات، سیاسی حالات اور سماجی اقدار تھے جن کو براہوئی غزل نے موضوعِ سخن بنایا۔ براہوئی غزل نے نہ صرف اُس دور کے سیاسی حالات کو موضوع بنایا بلکہ براہوئی سماج میں عدم مساوات معاشرتی برائیاں اور حاکم وقت کی زیادتیاں بھی براہوئی غزل کا موضوع بنے۔

دوران تحقیق معلوم ہوا کہ براہوئی شعراء کی کسی دور میں بھی سرکاری یا درباری سرپرستی اور پزیرائی نہیں ہوئی۔ تاہم اس کے بغیر بھی براہوئی غزل نے ترقی کے وہ منازل طے کیئے جو کسی بھی زبان کے غزل نے طے کیئے ہونگے، آج اکثر

۱۔ سوز، اسحاق "جذباتِ سوز" براہوئی ادبی دنیا شیخ واصل بلوچستان 1972 صفحہ 54۔

۲۔ راہی عزیز "دیوانِ راہی" پبلشر خود 1995، صفحہ 280۔

رونما ہونے والے عالمی اور ملکی واقعات اور موضوعات کو براہوئی غزل نے اپنی کینوس میں جگہ دی ہے۔ان تجربات اور تجزیوں کے روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ براہوئی نے جدید رجحانات کے تناظر میں اپنے معاشرے کی سیاسی اور سماجی پس منظر میں صحیح عکاسی اور ترجمانی کی ہے۔

براہوئی غزل میں مقصدیت

کیابراہوئی غزل میں مقصدیت کے اعتبار سے سماجی، اخلاقی، سیاسی اور قومی موضوعات سما چکے ہیں ؟ کیا براہوئی غزل کادامن مسرتوں سے بھرپور ہے ؟ چونکہ غزل شاعری ہی کی ایک صنف کے طور پر اپنی پہچان کراتی ہے۔اس لیئے اگر یہ تمام موضوعات غزل میں تلاش کیئے جائیں توسب سے پہلے شاعری میں مقصدیت کو موضوع بحث بنایا جائے۔پھر بعد میں براہوئی غزل میں زیرِ بحث موضوع کو چھیڑا جائے۔

ڈاکٹر جانسن اٹھارویں صدی کے ایک ممتاز نقاد ہیں انہوں نے شاعری کو اور شاعری میں مقصدیت کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"شاعری کاکام مسرت فراہم کرناہےاور شاعرعام انسانی فطرت کی عکاس ہے۔
عام انسانی فطرت کی نمائندگی کے علاوہ کوئی چیز زیادہ عرصے تک اور زیادہ لوگوں
کوسامان فراہم نہیں کرسکتی"۔(۱)

اگر مختلف قوموں کے شعراء صرف قومی حوالوں سے رسم ورواج یا صرف اپنے اردگرد کے ماحول کی کیفیتوں کی عکاسی کرینگے تووہ شاعریاشاعری محدود ہوکررہ جائے گی۔ اس شاعری سے دیگر اقوام اور زمانوں کے لوگ پوری طرح استفادہ نہیں کرسکیں گے۔اس لئے شاعر کو چاہیئے کہ وہ انفرادی تجربات اور حقائق کو شعر میں اس طرح سموئے کہ وہ محض انفرادی نہ رہ جائیں بلکہ اُن سے عام انسانی فطرت کے حقائق آشکارہ ہوجائیں جن سے تمام عالم انسانیت محظوظ ہوسکے۔

براہوئی غزل نے بھی اپنے اردگرد کے حالات، اپنے سماجی اقدار اور خطے میں رونما ہونے والے تاریخی، سماجی اور قومی تشخص کے ساتھ ساتھ آزادی کواپنا مقصد بنایاہے۔ براہوئی غزل پر فارسی اور اردو غزل کے اثرات موجود ہیں۔ایران میں فارسی غزل نے قصیدوں اور مثنویوں سے سفر کرکے غزل تک پہنچنے میں کافی وقت صرف کیا۔فارسی غزل کو بہت سے خون آشام اور ظلم وبربریت کے دور دیکھنے پڑے جس کی وجہ سے اُس میں معصومیت کی جگہ سوزوگداز نے لے لی اور تصوف فارسی غزل کو درجۂ کمال تک لے جانے میں معاون ومددگار ثابت ہوا۔اردو غزل نے فارسی سے کافی اثرات قبول کیئے چونکہ مغلوں کے دور

۱۔ محمد احسان الحق، پروفیسر "اصول تنقید" پبلشرز چوہدری محمد سعید اقبال، علمی کتب خانہ اردو بازار لاہور، 1988ء، صفحہ 178

میں برصغیر پاک وہند کے درباروں میں مغل بادشاہ شعر و سخن کی محفلیں برپا کیا کرتے تھے اور شعراء کو انکے سماجی قدروں سے بڑھکر انعام واکرام دیا جاتا تھا اسی وجہ سے بہت سے ایرانی شعراء ہندوستان جانے کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ ان دونوں زبانوں کی غزلوں میں شعور اور دلی کیفیات کو اُبھارنے میں کافی قوت موجود ہے یعنی فارسی غزل نے ایران میں چلنے والی، قومی، تاریخی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کو تقویت دی۔ اس طرح اردو غزل نے ہندوستان میں اس طرح کی تمام تحریکوں کو عوام میں متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً برصغیر پر انگریزوں کی مداخلت کے بعد 1857ء میں انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی جنگ آزادی ناکام ہوئی۔ ہندوستان کے مغل بادشاہ کو گرفتار کر کے معزول کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر جو خود بھی اردو کے اعلیٰ پائے کے غزل گو شاعر تھے ہندوستان کی بربادی اور اپنی بے سر سامانی وبے کسی کو اپنی ایک غزل میں یوں بیان کرتے ہیں :

"نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے وہ ایک مشتِ غُبار ہوں
نہ تو میں حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں
پئے فاتح کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں"

اور جب مغل شاہنشاہ پر مقدمہ چلا کر اسے جلاوطنی کی سزا دی گئی اور انہیں اپنی جلاوطنی کے دن گزارنے کیلئے زبردستی رنگون بھیج دیا گیا تو انہوں نے اپنی اس کیفیت کو بھی اپنی غزل میں بیان کیا ہے جو اسطرح ہے :

"لگتا نہیں ہے دل میرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
بُلبُل کو پاسباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں
کتنا ہے بد نصیب ہے ظفؔر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں"۔

یہ دونوں غزلیں اُس زمانے کے اعتبار سے مسلمانوں کے زوال اور ریاستی جبر کے آئینہ دار ہیں۔

1857ء کی جنگِ آزادی اور مغلیہ سلطنت کی تدفین کے بعد جب برصغیر انگریزوں کی عملداری میں آیا تو اہلِ علم و دانش نے سنجیدگی سے یہ بھی سوچا کہ انگریزوں کی ترقی کا راز کیا ہے؟ اس ضمن میں ہمیں سب سے پہلا نام غالبؔ کا ملتا ہے۔ اگرچہ غالب نے کوئی تحریک شروع نہیں کی لیکن جب نوجوان سر سید غالب کے پاس "آثار العنادید" کا نسخہ لیکر گئے تو غالبؔ نے بے ساختہ کہا:

"ارے بھائی یہ کیا لکھ لائے ہو فرنگیوں کی طرف دیکھو جنھوں نے دُوخانی انجن ایجاد کیا ہے"۔

اگرچہ سر سیدؔ کو یہ بات بُری لگی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بعد میں مکمل یکسوئی سے مغربی عُلوم اور فلسفہ و ادب کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو نئے دور کے تقاضوں کو سمجھنا ہے اور آگے بڑھنا ہے۔ گل و بُلبُل کے افسانے اور تخیلاتی محبوب سے چھٹکارا حاصل کر کے حقیقی زندگی اور اُس کے مسائل پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے 1847ء میں سائنٹفک سوسائٹی بنائی۔ اس سوسائٹی میں سائنسی عُلوم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنے کے لئے نمایاں سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ یہ قدم سر سید کا برصغیر کے مسلمانوں کے لئے جدید عہد میں داخل ہونے کا پہلا مرحلہ تھا۔ سر سید نے مغربی عُلوم کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نہ صرف عُلومِ جدیدہ پڑھا جائے بلکہ شعر و ادب کے فکری دھارے کو بھی مقصدیت کی طرف موڑا جائے۔ سر سید کے نزدیک مقصدیت اصلاحِ معاشرہ اور علوم جدیدہ کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوموں کی ترقی اور علمی ورثہ شعر و ادب میں ہی منتقل ہوتا رہا ہے۔ شاعری اور خصوصاً غزل ہماری اجتماعی فکر کی غماز تھی۔ اسلئے اُنہوں نے شاعری کو وسیلہ اظہار بنا کر حالیؔ، شبلیؔ اور مولانا آزادؔ کے ذریعے مقصدی شاعری کو رائج کیا۔ یہ تحریک بے حد مؤثر اور کامیاب ثابت ہوئی اور حالیؔ نے غزل گوئی ترک کر کے مندرجہ ذیل اصطلاح جسے عرفِ عام میں مسدسِ حالیؔ کہا جاتا ہے فرمائش کر کے لکھوائی۔ مسدسِ حالیؔ ہماری شاعری میں مقصدیت کی طرف ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔ اسکے علاوہ سر سید نے ہماری نسل کو داستانوں سے نکال کر زندگی کے حقیقی مسائل سے متعارف کرایا اور انگریزی صنف Essay کو مضمون نگاری کی شکل میں رائج کیا۔ انکے مضامین "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوتے رہے۔ سر سیدؔ بنیادی طور پر مستقبل پرست آدمی تھے اور آج ہماری سوسائٹی جس مقام پر کھڑی ہے اور علوم تازہ سے فیض حاصل کر رہی ہے اُس کا سہرا صرف اور صرف سر سیدؔ کو جاتا ہے۔

اسی تحریک کی ارتقائی شکل ہمیں ترقی پسند تحریک کی صورت میں ملتی ہے۔

اور پھر برصغیر کے بٹوارے اور قیامِ پاکستان کے بعد انسانوں کی غول در غول ایک شہر سے دوسرے شہر کو ہجرت اس آمدورفت کے دوران خواتین کی بے حرمتی اور انکے ساتھ ناروا سلوک نے اردو غزل میں المیہ، رنج و درد، سوز و گداز شامل کر کے اُسے پُر تاثیر بنا گیا۔ اس کے علاوہ بھی اردو غزل نے سماجی، قومی، سیاسی اور تاریخی اقدار کو موضوع سخن بنا کر عوامی شعور کو بیدار کیا۔

بالکل اسی طرح براہوئی غزل نے بھی تاریخ سے سبق سیکھنے، اپنے بہادر اسلاف کے کارناموں کی تاریخ پر فخر، محبوب یعنی مادرِ وطن پر مَر مٹنے کو فرضِ اولین قرار دیا۔ براہوئی غزل میں مقصدیت نے براہوئی سماج میں کیا کیا اثرات مرتب کئے اُن میں سے چند ایک نمایاں ہیں:

براہوئی غزل نے انسانی فطرت کے بنیادی جذبات و احساسات کو اُجاگر کیا۔ براہوئی غزل لوگوں کے دلی جذبات اور تہذیب کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ براہوئی غزل نے مُردہ ضمیروں کو بیدار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ براہوئی غزل حقیقی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر لوگوں سے نفرتیں، زنگ آرائش سے پاک معاشرہ قائم کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ براہوئی سماج میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا علاج بھی کرتی ہے۔ براہوئی غزل لوگوں کے خفتہ جذبات کو بیدار کر کے انہیں فطرت کے حُسن سے متاثر کر کے اعلیٰ انسانی اقدار اور احساسات سے آگاہ کرتی ہے۔

ذیل میں چند ایک شعراء کے غزل کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے براہوئی غزل میں قومی، سیاسی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی اقدار میں اہم تبدیلیوں کو مقصد بنایا گیا ہے۔ عبدالمجید چوتوئی کی شاعری ملاحظہ ہو جو عشقِ رسولؐ سے لبریز ہے:

"زیاتا تاج ئس خوش رنگ زاری فریاد
است آن کنا ہرف زنگ زاری فریاد
مُر افیس اُست آن کنا زاری فریاد
نی دوست ئس ساہ کنا زاری فریاد
خلق نا ئوران رسول زاری فریاد
نا زیارت ءِ شرف شان زاری فریاد

غم تے ملائس زیبا زاری فریاد

اُستے پلانس زیبا زاری فریاد

خواجۂ شفا نا نی اُس زاری فریاد

کاٹ حیا نا نی اُس زاری فریاد

شافی نی بر ہُر کنے زاری فریاد

تینکن فدا کر کنے زاری فریاد

جوآن جمال نی دلبر زاری فریاد

تک نیال نی شکر زاری فریاد

جی کنا جان جگر زاری فریاد

نی اُس کنا گنج گوہر زاری فریاد

دا ے مجید کیک نے آ زاری فریاد

شافی دا بندہ آ کرک اودے نی آزاد" (۱)

ترجمہ :۔ تمام انبیاء کے تاج ہو میرے دل پہ جو زنگ ہے اُتار دو۔ میری دل کی ہر دھڑکن تیرے نام سے آغاز کرتی ہے۔اےَ نبیؐ آپ پر دل و جان قربان۔اے نبیؐ آپ تمام کائنات میں انبیاء کے سردار ہیں۔ مجھے اپنی زیارت کا شرف بخش دے۔ میں آپ پر فدا ہوں۔اے میرے جان جگر رسولؐ۔اے میرے گوہر نایاب اپنے غلام مجید کو آزاد کردے۔

مولانا عبدالمجید چوتوئی نے مسلمانوں کو شرک سے منع کرنے کو اپنی غزلوں میں مقصدیت کا درجہ دیا ہے۔

ایک جگہ مولانا شرک کے بارے میں کہتے ہیں :

"پاریٹ مے کتابان۔شرک کپہ اےَ مسلمان

باغی مفہ ضیا غان ۔شان رب نا عظیم ءِ"(۲)

ترجمہ : میں نے کلام اللہ سے ہی ہدایت کی باتیں بتائی ہیں۔اےَ مسلمان شرک نہ کرو۔ تم دین سے مُنہ نہ موڑو

۱۔ چوتوئی، عبدالمجید،"جوشِ حبیب"، کوئٹہ، 1357ء، صفحہ 54,55۔

2- بیدار، قیوم،"عبدالمجید چوتوئی فن و شخصیت"، پبلشر براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1983ء، صفحہ 26۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور عظیم ہے۔

نیم حکیم خطرہ جان و نیم مُلّا خطرہ ایمان کے مصداق کو بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالمجید چوتوئی کہتے ہیں :

نیم مُلّا اُف شریعت آن خبر
او نوشتہ یاد کیرہ کسب و ہنر
خوانرہ یا عشق نقلات نا کتاب
او حقیقت آ رسینگتوس خراب
گر حقیقت آن خبر او مسکہ
او شریعت آئے محکم مسکہ
گر حقیقت اَٹ مروُس دا عجب
نے حقیقت آن خبر اُف انت نسب
نے خدا علم تِس عمل کر با صفا
خوش مرے نے آن خدا و مصطفیٰ" (ا)

ترجمہ :۔ نیم مُلّا کو شریعت سے واقفیت نہیں ہے۔اس لئے وہ کسب و ہنر یاد اور تحریر کرتا رہتا ہے۔ وہ صرف عشق اور نقالیت کی کتابوں کے پڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں۔وہ حقیقت کو پہچانتے نہیں۔اگر انکو حقیقت کی پہچان ہوتی تو اُنکے ایمان شریعت پر مستحکم ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم کی روشنی سے فیض یاب کیا ہے۔اچھے عمل کرو تاکہ خُدا اور رسول اکرمؐ دونوں تم سے خوش ہوں۔

مولانا نور احمد نے وطن دوستی، وطن کی مٹی اور اُس کی خوشبو سے پیار کو اپنی غزلوں میں مقصدیت کے طور پر اپنایا ہے۔ایک غزل میں وہ کہتا ہے :

"اے بُلبُل ءِ شیدا پا نا وطن اراوے
مفتون اریس نے پھُل ءَ واڑے چمن اراوے

ا۔ بیدار، قیوم، "عبدالمجید چوتوئی فن و شخصیت"، پبلشر زبراہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1983ء، صفحہ 32۔

حیران و نی پریشان ہر کنڈا خیال کیسہ

ہر رہگزر نا سوالی گل سخن ارادے

اے ہُدہُد ءِ مبارک ایتے خبر کنے نی

پا سر و جو ءُ بادی گل ءِ چمن ارادے

صیاد نا تیر اراکان بس مید کرے اراڑے

تموک اُرسہ دانگ اینگ دا تیرزن ارادے

قاتل کریس نی قتل چپ توسنوس اُریسہ

مقتول تموک ور آ نا پا نی کفن ارادے

احمد نا گڈ فناغان اِچ ہنپروس آواز

فریاد کروس پاروس شیرین سخن ارادے" (۱)

ترجمہ :۔ "اے وطن پر مر مٹنے والے قربان ہونے والے بُلبُل تمہارا وطن کہاں ہے ؟ تم کو ختم کیا جا رہا ہے۔ تمہارا چمن کہاں ہے ؟ تم کیوں پریشانی میں ہر طرف دیکھ رہے ہو۔ گذرنے اور جانے والا یہ پوچھ رہا ہے کہ تمہارا وطن کہاں ہے۔ اے ہُدہُد مجھے خوشخبری تو سُنادے کہ میرا چمن آزاد ہے۔ قاتل نے تو وطن کے ایک شیدائی کو ختم کر لیا لیکن نوجوان بے گور و کفن کی للکار یہ ہے۔ احمد تمہارے فنا ہونے کے بعد کون تمہاری آواز سنے گا اگر تم فریاد بھی کرو اور یہ کہو کہ شیرین گفتار کہاں ہے"۔

براہوئی زبان کی جدید شاعری کے سرخیل میر عبدالرحمان کرد اپنی شاعری میں وطن، وطنیت ، کو اپنی شاعری میں مقصدیت بناتے ہیں جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں۔

اوستاک پریشانو بے حد حساب اینو

مونا بہ نیان ہیدس نن مُسن عذاب اینو

نابودی آن نن مرا اے بلوچی ءُ

غمیان وطن نا چامس اُست کباب اینو

ا۔ گل خداداد، "کلام نور"، پبلشرز براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1978ء، صفحہ 22۔

رندی ئٹ کرک قولس میدانئی پیش مر

بھر گ تو چاکر تو تینے کہ حساب اینو

ایران آنظر شانی لوغانا نگاہس کر

کوہنگ قہاران بارا ایتے نی جواب اینو

خڑک اس نا منزل شامس کہ تماروس

ڈوآن تینا مُسن نن خوار عذاب اینو (۱)

وطن میں قبائلی جبر، سیاسی عدم توازن اور براہوئی سماج میں سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی پستی اور پسماندگی کے اسیر نوجوانوں کی جذبہ محنت، دوستی، امن کا پرچار کرنے کے لئے نوجوان ممتاز شاعر حسن غمخوار کی ایک غزل کی مقصدیت یوں نظر آتی ہے۔ اس غزل میں وہ وطن کے نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

"او ورنا وطن نا تینا تقدیر جوڑ مر

تقدیر سے جوڑ کراونا تدبیر جوڑ مر

دنیا نا روانی ءِ ہُرک مُستی ہنگ ءِ

نی ہم سلیپہ نیام ٹی راہ گیر جوڑ مر

ہش کر گدان ءِ تینا طوفان دا چھرک آک

گندار جوڑ کر ننے شہہ تیر جوڑ مر

سربازی او غازی ہم ارے نیتو ہزارا

دشمن نا تینا طوبے آ ماہ گیر جوڑ مر

ہمت اگر نی کیس حسن نے تو سلوکے

ہس ظلم باز مسونے آخیر جوڑ مر" (۲)

۱۔ گرد، عبدالرحمٰن، میر، "شف گروک"، پبلشر براہوئی اکیڈمی کوئٹہ۔، 1996ء، صفحہ 128۔

۲۔ غمخوار حسن "طوبے نا بکا" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1996ء صفحہ 51۔

ترجمہ :۔ اے نوجوان اٹھ باندھ کمر اپنے وطن کی تقدیر بن جا۔اُٹھ اپنے قوم و وطن کی تقدیر بدل لے۔ کیا تم کو دنیا والے نظر نہیں آتے کہ کس رفتار سے آگے کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ تم راستے میں کیوں کھڑے ہو۔ تم بھی ان کے ساتھ ہمسفر اور راہگیر بن جاؤ۔اُٹھو اس تیز و تند طوفان میں اپنے لئے ایک گھر تعمیر کرو اور ہم جیسے ناتوانوں کو بھی کام پر لگا دو۔اُٹھو وطن پر برے دن آئے ہیں۔ تمہارے پاس ہزاروں ایسے پروانے موجود ہیں جو وطن پر مر مٹنے کے لئے تیار اور سر بکفن ہیں کیونکہ صرف تم ہی دشمن کو مٹا سکتے ہو۔اُٹھو تیرے وطن میں سرداروں اور نوابوں نے ظلم ڈھائے ہیں ایسی قوتوں کے سامنے زنجیر بن جاؤ۔

جب ہم غزل میں مقصدیت کی بات کرتے ہیں تو درج بالا شعراء کے علاوہ عبدالرزاق صابر ، عزیز مینگل ، طاہر شمیم ، انور براہوئی وغیرہ بھی ان موضوعات پر اپنے اپنے حصے کا حق ادا کر چکے ہیں۔ ان شعراء نے بھی اپنی اپنی غزلوں میں مقصدیت کو بنیاد بنا کر شاعری کی ہے۔

براہوئی غزل رومانویت اور کلاسیکیت

"The word Romanace has come from the old French Romanase which denoted something written in French as opposed to classical Latin. From the chivallanic adventure, the modern meanings of Romance and Romantic Developed. (1)

لفظ رومانویت ہم تک لاطینی زبان سے پہنچا۔

یونان کے عظیم فلسفی، ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار جتنا کام کر گئے اُس کے بعد کے ناقدین نے جانچ پڑتال کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یونانی اہلِ دانش ر کلاسیکیت اور رومانیت دونوں کے ملے جلے رنگوں کے امتزاج سے ادبی شاہکار تخلیق کرتے آئے ہیں۔ انکے ہاں جب کسی تخلیق کے اسلوب (form) اور ہیت (structure) پر زور دیا جائے جس میں منطق، علت و محلول نظر آئیں تو وہ کام pieace of art کلاسیکی کہلائے گا اور ہر کلاسیکی کام خواہ کسی بھی زبان میں ہو رہا ہو اُس کا ڈکشن بہت اونچے مقام پر یعنی فلسفیانہ ہوتا ہے۔ مگر رومانیت اور کلاسیکیت کسی بھی دور میں کسی بھی زبان کے ادب میں تنہا تنہا نہیں ملیں گے کیونکہ یہ اسطرح بندھے ہوئے ہیں جیسے صبح و شام، خزاں و بہار ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

یونانیوں سے یہ رجحانات انگریزی ادب میں داخل ہوئے اور ارد گرد یعنی جرمن، فرانسیسی اور دوسرے زبانوں کے ادب میں بھی شامل ہوئے۔ انگریزی ادب جو ہمیں تحریکوں کی صورت میں ملتا ہے جبکہ الزبتھ کے دور میں رومانویت بھی تھی اور کلاسیکیت بھی۔ لیکن اٹھارویں صدی میں کچھ ذہن محض کلاسیکی کام کرتے رہے جس کی بناء پر اُس صدی کا نام Neo-Classical Age پڑ گیا۔ جس کی خرابی یہ ہوئی کہ تمام تر کام محض شہری زندگی (city life) کے مسائل Aristocratic کا اس کی مصنوعیت کا شکار ہو کر رہ گیا۔ ان ادیبوں میں ڈرائیڈن اور پوپ (Pope) قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے نیو کلاسیکل دور کو الگ پہچان دی۔ مگر چونکہ یہ کلاسیکل تہذیب خالص نہیں تھی اس لیئے ولیم بلیک جیسے شاعروں نے اس نیو کلاسیکی دور کا توڑ ان الفاظ میں کیا:۔

"We don't need the initiate the ancient Greek and Latin Masters if

---

1- Ayto John, " Dictionary of Word's Origin" Page 448.

we only have our imagination to employ in the causes of poetry".

اور پھر ان الفاظ کے بعد ولیم ورڈزورتھ اور ایس ٹی کالرج نے اٹھارویں صدی کے اواخر میں Romantic Movement چلائی۔ اور یوں لفظ رُومانویت Romanticism انگریزی ادب کے تیس سالہ دور کا نشان بن گیا۔ جس میں عظیم شاعر، ناول نگار، نثر نگار، ناقدین اور مضمون نویس پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اس دور کو امر کر دیا۔ جس میں فطرت کے نظاروں، حُسن اور انفرادی آزادی کی باتیں ہوتی رہیں۔

دنیا بھر کے ادب اور ادوار پر اگر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آئیگی کہ ہر کام، ہر شہ پارہ اور تخلیق میں رُومانوی اور کلاسیکی اثرات ملیں گے۔ رومانی ادب یوں تو فطرت کے حُسن، دیہاتی زندگی کی سادگی، فرد کی آزادی اور تخیلاتی دنیاؤں پر مشتمل ہوتا ہے، مگر ہمارے خطے میں ''رومان'' محض محبوب کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہونا، گل و بُلبل کے حُسن و نازنین کے قصیدوں کو سمجھا جاتا ہے۔ اور غزل اپنے ان رومانوی خیالات کا اظہار کرنے کے لئے سب سے خوبصورت ادبی صنف سمجھی جاتی ہے۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ لفظ غزل عربی لفظ ہے۔ ہرن کی دردناک چیخ اور آہ و بکاہ کو کہتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ عرب میں محبت کے دردناک جذبات اور ہجر کی یاسیت اور مایوسی سے برانگیختہ ہو کر جب کوئی شاعر اپنے انہی جذبات کا اظہار کرے تو غزل سے بہتر صنف اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ عربوں میں محبوب کا تصور مؤنث ہے، جبکہ فارسی شاعری میں محبوب کا تصور مذکر ہے۔ (عربی ادب میں مذکر، مؤنث اور تخلّص ہوتے ہیں) جبکہ فارسی شاعری میں محبوب کا تصور صرف مذکر ہوتا ہے۔ جس کے گہرے اثرات اردو، بلوچی، براہوئی اور پشتو شاعری پر پڑے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی پسند شاعری شروع ہوئی تو غزل گل و بُلبل کے افسانوں، محبوب کی زلف اور قصیدوں سے آزاد ہو کر معاشرتی مسائل کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوئی۔ سب سے پہلے اُردو زبان کے ممتاز شاعر نذیر اکبر آبادی ہیں جنہوں نے اپنی نظموں میں معاشرتی مسائل کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔

''دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں
خود ناچتی ہیں سب کو نچاتی ہیں روٹیاں''

یا فیض احمد فیض کی غزل ''ڈھاکہ سے واپسی''

''تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے صبر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

کب نظر میں آئیگی بےداغ سبزے کی بہار

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد" (۱)

جو رے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے

تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سر رہگذار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر راہ سیاہی لکھی گئی

یہی داغ تھے جو سجا کے ہم میں نرم یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخ وفا پہ رسن پہ دار کرو گے کیا

جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ وفادار چلے گئے" (۲)

حبیب جالب اپنے انقلابی جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں :۔

"کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں

عجب اپنا سفر ہے راستے بھی ساتھ چلتے ہیں

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے

نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

ہم اہلِ درد نے یہ راز آخر پا لیا جالبؔ

کہ دیپ اونچے مکانوں میں ہمارے خون سے جلتے ہیں" (۳)

اور ساحر لدھیانی کہتے ہیں کہ :۔

عقائد وہم ہیں مذہب خیال خام ہے ساقی

ازل سے ذہنِ انساں بستہ اوہام ہے ساقی

۱۔ فیض احمد فیض، "شامِ شہر یاراں"، کلیات فیض، مکتبہ کارواں کچہری روڈ، لاہور، 1977ء، صفحہ نمبر53۔

۲۔ فیض احمد فیض، "شامِ شہر یاراں"، کلیات فیض، مکتبہ کارواں کچہری روڈ، لاہور، 1977ء، صفحہ نمبر50۔

۳۔ جالبؔ، حبیب، "حرفِ حق"، مکتبہ دانیال، صفحہ نمبر62۔

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردہ شب کو
جہاں ہر جسم کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مئے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں پہ بھوک سے کہرام ہے ساقی " (۱)

" ہرچند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبع خودآرا نہیں ہوتی

معمورہ احساس میں ہے حشر سا برپا
انساں کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداری احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

قطرے کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بےبس کا سہارا نہیں ہوتی" (۲)

اسی طرح براہوئی شاعری پر بھی وقتاً فوقتاً خطے میں چلنے والی تحریکوں کے اثرات مرتب ہوئے مثلاً مشرقی یورپ میں بالشویک انقلاب دونوں عالمی جنگوں اور خاص کر دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کے خلاف جرمن فوجوں کی کامیابی اور ہٹلر کی جانبازی کے قصے ، ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف چلنے والی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" یا آزادی کی تحریکات بلوچستان میں قدیم قبائلی ریاست میں قبائلی طرزِ حکومت ، انگریزوں کے خلاف غم و غصے کے علاوہ براہوئی غزلوں میں معاشرتی و قومی مسائل کے علاوہ ہر قسم کے عنوانات کو غزلوں کا موضوع بنایا گیا۔

گو کہ براہوئی شاعری کا اصل مزاج (فوک) ہے کیونکہ براہوئی زبان دنیا کی اُن چند ایک زبانوں میں سے ہے جو آج تک خالص ماحول میں پروان چڑھی اور فوک رنگ اسی لئے بہت نمایاں اور وسیع ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ براہوئی

۱۔ لدھیانوی، ساحر، "تلخیاں"، سنِ اشاعت ندارد، پبلشر خورشید احمد شیخ، رابعہ ہاؤس لاہور، صفحہ 34۔
۲۔ایضاً

غزل کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوئی۔ قدیم براہوئی شاعری میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ جس میں اخلاقیات کی تعلیمات اور مذہبی معلومات فراہم کی گئیں اور شاعری کا موضوع اس سے ہٹ کر نہیں تھا۔ یہاں کلاسیکی رنگ نہایت سادہ ہے لیکن 1839ء میں جب انگریزوں نے محراب خان کو قتل کر کے قلات پر قبضہ کیا تو یہاں سے براہوئی زبان میں مزاحمتی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا جس کی ابتداء پہلی بار ملا محمد حسن نے کی اور بعد کے آنے والے شعراء نے سماجیات، اخلاقیات اور دیگر مسائل پر شاعری کی یا غزل کہی۔ براہوئی ادب اور شاعری میں لفظ رُومان کے معنی وہی رہے جو اردو اور فارسی شاعری میں موجود ہے۔ گل وبلبل کے افسانوں سے لیکر واردس کے قصوں تک براہوئی غزل اپنا علیحدہ مقام رکھتی ہے۔

براہوئی غزل پہ (موضوع خواہ مزاحمتی ہو یا عشقیہ) رُومانوی رنگ غالب رہتا ہے۔

جس طرح پروفیسر نادر قمبرانی ایک غزل میں اپنے رُومانوی خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

تدینگوئے ھتم ولدا بروس نی
نا رنداتے واڑے خمپروس نی
ھنینا دے تے وا اُستا ھتوس نی
بفک باور کنے گیرام کروس نی
ھتم نا موسم ءِ برباد کپہ
ہنو دا دم دُو آن ارمان کروس نی
خنوس نی بے وفائی ئے جہان نا
ضرور اُستا ننے ولدا ھتوس نی
برک زُو گواڑخا دیک منو
ڈغاران بازنا اتس بنوس نی
ناقدرے بے ننے آن دیر چائیک
خمارا خلتے اُٹ دیرا ھروس نی

ا۔ قمبرانی، نادر، پروفیسر، "مشنزہ گروک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 88۔

اور اپنی دوسری غزل میں مزاحمتی خیالات کا اظہار کرتے وہ کہتے ہیں کہ :

پلتوا نا شائیتہ کس آجوئی بنچپس اف
زندنا واپارے دا کاٹم تنگ اُٹ ڈو بریک

ہگل آور ناکو ناموسے وطن نا رکھیرہ
زندگی نا دا شرف اوفتا کھنگ اُٹ ڈو بریک

زیبلا گونجے خلس نی پوٹوا تمو کسے اف
اونا دیدن ڈکھ ورنجاتے سہنگ اُٹ ڈو بریک

قوم کن آباد مرے جنت مرے اونا وطن
دا گڑا بےرحم ڈرنگ خواری کھنٹ ڈو بریک

آجوئی نا گودلے دُھن خُمبٹی دیچا ھلیس
دا پری پرہ دِترتا نا شولیفنگٹ دو بریک" (۱)

معاشرتی ، سماجی اور معاشی حالات جیسے بھی ہوں براہوئی غزل اپنا مخصوص رومانی لہجہ نہیں بھولتی ۔ یہ براہوئی غزل کی شان ہے۔

رُومانویت اور کلاسیکیت رنگ براہوئی زبان کے شاعر تاج محمد تاجل کی شاعری میں الگ اور منفرد نظر آتا ہے تاجل کے اپنے دور کے جو سیاسی ، سماجی حالات تھے اُن پر اِن کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ تاجل کے کلام میں جہاں صوفی ازم یعنی اخلاقی اور سماجی بے راہ روی کے خلاف پیغام نظر آتا ہے وہاں اُنکی شاعری میں رومانویت اور کلاسیکت کا عنصر بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ایک غزل میں رومانویت کو یوں اُجاگر کرتے ہیں۔

عجب دھنز و عجب ڈونز کوڑی ٹی بے بقا اُس
ھور خفک خنور خنک اخسر صفن صفا اُس
کسے حرص عجب ترس تا کہ غنی غنیا اُس

ا۔ قمبرانی ، نادر ، پروفیسر ، "نشتر گروک" ، براہوئی اکیڈمی ، کوئٹہ ، 1992ء ، صفحہ 63۔

خبر ہچ کس ءِ ناف ہر کس پاہک کنا اُس

کسے شوم کسے سخی اریس کل ناپناہ اُس

کسے چڑیف کسے دڑیف بے ڈدھ وبے گناہ اُس

فقیر تاجل ءِ ناگل ارے تحقیق خدا اُس

پنجتن نتو کمک ءِ رسولؐ نا شفا اُس (۱)

امیر الملک مینگل براہوئی کے حساس اور درد مند شاعر ہیں۔وہ اپنی رُدمان کا اظہار جب بھی کرتے ہیں تو وہ اپنے وطن،وطن دوستی،وطن کے پہاڑ،ندی،بہار و خزان اور موسموں سے اپنے محبت کا والہانہ اظہار کرتے ہیں۔امیر کو محبت ہے وطن سے امیر کو محبت ہے امن سے،وہ محبت کرتے ہیں اُن نوجوانوں سے جو ستاروں تک پہنچے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں۔انکے کلام میں محبت رشوت اور انسان دوستی اہم موضوع ہیں۔

ان کی ایک غزل پیش ہے جو رومانویت اور کلاسیسیت کے اعتبار سے اپنی پہچان آپ ہے۔

داحکم بلبلے مس کہ غزل سرائی

یابلبو کادے ئے پاکہ روشنائی

طلہ خانے پارکسک دُن نر منگا سینے

زغم جتہ خوار دوئی تیر کاسہ گدائی

پار عاشقاتے خلبو تُم خیر دوستی آن

پلنگاپارے پارہ ئی کہ کج ادائی

چی ءِ گپ سے دانم عقل وزانتے اُہو

او شہپر ءِ وقابے پارہ کپوت چاہی

داایت سے بستو، تاریخ نامون ءِ لکھوک

طوفان ئی مریک زیات خاخر ناجھلائی

۱۔صابر عبد الرزاق "کلامِ تاجل" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1988، صفحہ 54۔

چاہک امیر دادے داد یک دیگری آ

تہار مہ مراداول سرگڈ سرتہ روشنائی (۱)

رُومان کار زاق صابر کے ہاں اپنا رنگ ہے صابر کو عشق ہے عشق سے وہ حسن کو عشق کی نگاہ سے پرکھتے ہیں۔ انکے کلام میں رومانویت اور رومان میں زندگی کا پیغام ہے۔

انکی ایک غزل پیش ہے۔

خریفیٹ ای گل گلاب اس استنا گلزار ٹی

پیش کیوہ دیوہ اودے یار آنا دربار ٹی

است اٹ ارمان ءِ خنوای کوچہ ءِ دلدار نا

نعرہ وکوک اٹ پن ءِ تہ ای الیو بازار ٹی

مضُور آن ای زیات افٹ کم اوڑان افٹ ای

عشق نا آزان تسٹ جاہلا تا شار ٹی

خوشی آن زیادہ ار یردوست عمک تینا اُستنا

انت اوکھٹ اس ای کرینٹ عشق نا واپار ٹی

صبر نا دُو آن تو داخس بے قرار صابر اریٹ

عشق ٹی کی سلو کے اف اثر کو کار ٹی (۲)

طاہرہ احساس جتک براہوئی کے خاتون شاعرہ ہیں۔ انکی کلام میں رومانویت اپنی کلاسک رنگوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ انکی ایک غزل پیش ہے۔

اہیکہ مہر ناشراب صنم

امتن کیسہ پا حجاب صنم

۱۔ مینگل امیر الملک "جوزنا پل" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1997، صفحہ 94-93۔

۲۔ صابر عبدالرزاق "چراغ صابر" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، 1981 صفحہ 14۔

نیمہ شعر ئس خلیوہ زیبدارءُ

نی برک کنہ غل رباب صنم

کیسہ انتئے نی بے رُخی کنو

کیسہ اُستے کنا عذاب صنم

اُستے سینہ ٹی نی ہشاس کنا

داسالس مسونے کباب صنم

پرغ دیوال ءِ پردہ ناداسا

نیام ٹی لسونے نقاب صنم

تیزارے دے تنک آن ناجلوہ

نے آن شرینگا آفتاب صنم

اے کہ نے ترسونے خدا رنگ ئس

کنے ہم تسونے شباب صنم

خیال نے تونے فکر نے تونے

است ناخانہ ءِ خراب صنم

کیک احساس اخہ منت نے

داسا توایت نی جواب صنم (۱)

براہوئی کے غالب اسحاق سوز کے کلام میں رومانویت یوں نظر آتی ہے۔

نماد ازیبل دتر سے جوانو

نناگر ہم نظر سے جوانو

جواب افک نماداز ہے

نماد الاڈٹ گمر سے جوانو

1- جنک احساس طاہرہ "صدف" براہوئی اکیڈمی پاکستان کوئٹہ 1995، صفحہ 106-105۔

مخو پھلس ھستم ناپارے

نماد اجوڑ تا خبر سے جوانو

وفا کرک نی وفا خنک نی

وفانا جانی کسر سے جوانو

مزل نامرٰی سفر نالذت

کسر نا سختی سفر سے جوانو

ہزار صدمہ خنک محبت

ولے کہ اونا اثر سے جوانو

سخارے دائما نظر نا

کنا غزل نا اثر سے جوانو

برک داسوزے خنک نی تینا

غزل ٹی اونا خبر سے جوانو (۱)

قیوم بیدار کے اشعار میں جہاں رومانس اور عشق کا اظہار ہوتا ہے وہاں ان کے کلام میں اپنے وطن اُس کے مٹی کی خوشبو اور انسان دوستی کا اظہار ملتا ہے۔ وہ رُومانس کو اپنی فکری سلسلے سے جوڑتے ہیں اور اپنے محبوب سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں۔

عِشقٹ نا ہند غس اینو دیوانہ مس ہنا

او شمع سینا رندٹ پروانہ مس ہنا

خوشحال وباکمال ئس میرئس مخلاتا

مجلس وخلاتیان بیگانہ مس ہنا

تیرس نظر نا یار اک اوڑا اثر کرینے

دا زندگی تہ اینو افسانہ مس ہنا

ا۔ سوز، اسحاق، "گروشک"، براہوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 92-91۔

خوشی تے زندگی نا گیرام او کرینے

ڈکھ و غماتیٔ وا ویرانہ مس ہنا

میخانہ ٹی لو غمتا خوشی ناجاے بشخا

انداز اینوا و نا رندانہ مس ہنا

پٹورے خنپر ورے یاد ہم کروائے اودے

کلان اینو بیدار بیگانہ مس ہنا (۱)

براہوئی کے ایک اور جوانمرگ شاعر اسلم پروانہ اپنے اشعار میں ٹوٹ کر محبت کرنے والے نظر آتے ہیں۔ وہ محبت اور رومان کے رنگوں میں یوں اپنا اظہار کرتا ہے۔

محبت محبت محبت کینہ

محبت کہ استانہ منت کینہ

محبت ءِ خلق آتا زینت کینہ

خداتے کہ طاقت طاقت کینہ

تینا نوجوان آتا عزت کینہ

تینا پیر نگا تا خدمت کینہ

تینا ورد آتا حاصل دامت کینہ

تینا اُست نن تینا دولت کینہ

ہنینا ہیانا تا حرفت کینہ

اواری آن دو خیر برکت کینہ

اینو پارہ باز اک بغاوت کینہ

نن حق تو ہم عداوت کینہ

۱۔بیدار قیوم "مشمبلاخ" براہوئی ادبی اکیڈمی کوئٹہ، 1989 صفحہ 112-111۔

در و غٹ کہ واڑے عبادت کینہ

ارا کان ذُو تیئمہ لذت کینہ

داو نیائے مجاکہ شہوت کینہ

تیار داڑے تالان زلت کینہ

ہمت کے اسلم توہمت کینہ

داو یرانہ وشت آتہ جنت کینہ (۱)

پروفیسر واحد مینگل کے کلام میں رومانویت کا رنگ اس طرح نظر آتا ہے۔

نا حسن پر بہار کنا عشق بے قرار

چندی ہزار وار کرے است نے توار

مس طور سرمہ جلوہ نا توشان اے خدا

خزِمی خنی تو مس حسین بھاز بے شمار

دلباغ پھُل پھُل و چمن یار ددیگہ نا

بشام ھتم نو دشلپر او فیتون اوار

معصوم ہرادالو ناپاک اس ختیان

لس نشہ تو جوانی نا اودے کرے خمار

اف قید و بند پار نما خیال و فکر نا

ہر پاس مرے شام مرے یا مرے سحار

وازندگی تو دردے ارمان سے صنم

رُو آن زندگی نا کرین زار زار زار

ا۔ پروانہ، اسلم "جذباتِ اسلم" براہوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ 1995، صفحہ 48۔

مینگل غریب نا عشق مریک شوق نا تمام

رُو آن اونا چاسہ مریک دست نئے و چار (۱)

یسیٰن بسمل محبتوں کے چراغ کے طور پر اپنے رومانس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

مہر نا موب نا کنکاٹ ای
عشق نا روشنا چراغٹ ای

اف ساجانو جندہ نا تینا
تہرہ تینے ام اواُدٹ ای

جوڑ تیا بخشندہ با کنا مُلک
پومفک کس وَلے کہاٹ ای

دے وتن سوب دیمہ مونجائی
اف خدایا امر غدایٹ ای

است دِتر چڑ خنک خوینکان پر
فکر و غم تا ہمو رباٹ اِی

باز پارے کنے زمانہ مگر
پاہو بسمل کنے خرائٹ ای (۱)

افضل مراد کے غزل میں رومانویت اور کلاسکِ کا انداز یوں ہے۔

زندنا ہر گام ٹی نے پڑہ
تینا محبت صحب و شام ٹی نے پڑہ

داسا مونجائی نا ہیت ئے کبرہ

۱۔ مینگل واحد "است نا توار" براہوئی اکیڈی پاکستان کوئٹہ 1999، صفحہ 122-121۔
۲۔ بسمل یسیٰن "سنبل" پبلشر خود 1997، صفحہ 92۔

شاعری ناشام ئی نے پڑوہ

تیغعہ پٹک ہر است داڑے امان

اے بر دو کا گام ئی نے پڑوہ

نا کسر کنتون مک رہنما

داسہ ناالزام ئی نے پڑوہ

داساتیناٹی کناخڑ کابفک

داخرینا جام ئی نے پڑوہ

کنتو چس اف کہ ای نے اتوک

ناترو کا جام ئی نے پڑوہ

پین کس اینک کل لو نامراد

تونا پیغام ئی نے پڑوہ (۱)

عالمی ادب پر مختلف ادبی تحریکوں کے حوالے سے جو اثرات ہمیں نظر آتے ہیں۔اُن اثرات سے براہوئی ادب اور خصوصاً براہوئی شاعری نے بھی فیض حاصل کی ہے۔اسی طرح کلاسیکت اور رُومانویت کے اصطلاح کو اگر ہم خالص ادبی مفہوم کے تناظر میں دیکھیں تو براہوئی شاعری میں اس کے گہرے اثرات نظر آئیں گے۔

1- مراد افضل "سمند" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، 2001 صفحہ 61-60۔

براہوئی غزل میں الم نگاری

تمام مشرقی شاعری میں جس میں براہوئی شاعری بھی حیثیت جز شامل ہے۔حزن ویاس، رنج وغم کے مضامین سے آراستہ ہے۔ایک یورپی نقاد کے الفاظ کورام بابو سکینہ نے یوں بیان کیا ہے۔ :

''اہل مشرق اپنی طبیعت کی افتاد سے افسردہ خاطر پر اسرار سوچ بچار میں وقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوئے۔دنیائے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں۔اُنکی زندگی میں زیادہ تر حزن ویاس، درماندگی و بےچارگی زندگی سے تنفر دنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصور دنیاوی ترقی اور مرضہ الحال سے اجتناب شامل ہے اور اس دنیا کی بےزاری کی وجہ سے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی فریب اور تصوف کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔بارگاہ ایزدگی میں گڑگڑا کر دعائیں مانگنا، تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا، انسانی قوت ارادی کو بالکل وبے کار سمجھنا، زمانہ اور آسمان کی شکوہ و شکایت یہ سب باتیں اہل مشرق کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہیں''(ا)

یہ تو تھے ایک یورپی نقاد کے خیالات،اُن کے خیالات اپنے تہیں بجا ہیں لیکن ان خیالات اور خدشات سے ہٹ کر مشرقی اور مشرقی تہذیب وتمدن کی اپنی خوشبو ہے۔رنگوں کے قوس وقزح کا امتزاج ہے۔ مشرق اور مشرقی تہذیب کو مغرب کے مفکرین کے اندیشوں اور خدشات کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔الم پسندی صرف براہوئی شاعری میں نہیں بلکہ یہ فارسی شاعری کا تسلسل ہے۔ فارسی شاعری کی۔ یہ اور بات ہے کہ براہوئی غزل یا شاعری پر فارسی اور اردو کے یکساں اثرات موجود ہیں۔ شاعری میں رنج والم نے کب جگہ پائی اس پر پہلے ابواب میں بحث ہو چکی لیکن یاد دہانی کے طور پر پھر دہرانا کہ :

تاتاریوں کے حملوں نے ایران کے گوشے گوشے میں تباہی وبربادی، قتل وغارت گری کا بازار گرم کردیا۔ان سانحات وحادثات نے لوگوں کے دلوں کو مجروح کر ڈالا۔دنیا سے بےزاری زندگی کی بے ثباتی کے نقوش تقدیر کی بالادستی اور اُن سے پیدا ہونے والا زندگی سے فرار دلوں میں گھر کر گیا۔

فارسی شاعری کی طرح براہوئی شاعری اور خاص کر صنف غزل میں درد یا الم پسندی کے مختلف رجحانات

ا۔ سکینہ، رام بابو، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، (مترجم مرزا محمد عسکری)، علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، 1967ء، صفحہ 32

ہیں۔ ان رجحانات میں پسماندگی، ظالم و جابرانہ نظام چاہے وہ سیاسی ہو یا قبائلی، جاگیردارانہ ہو یا نیم جاگیردارانہ، براہوئی شاعری میں خصوصاً غزل کو متاثر کیا ہے۔

لیکن پروفیسر احسان الحق اپنی کتاب اصولِ تنقید میں یوں رقمطراز ہیں :

''غزل کی صنف اس لحاظ سے عالمی ادب میں منفرد ہے کہ اور عجیب و غریب ایک خارجی وحدت ہونے کے باوجود اس کے ہر شعر میں جداگانہ خیال ہوتا ہے۔ فکر و خیال کا تسلسل نہیں ہوتا بلکہ اس حد تک کہ ایک ہی غزل میں ایک دوسرے سے لا تعلق، خواہ معمولی سا تعلق رکھتے ہوں، خواہ مسلسل ہوں، خواہ متضاد سب کے لئے ایک غزل کے مختلف اشعار میں جگہ موجود ہے۔ غزل کی اس خصوصیت پر مشرقی و مغربی نقادوں نے تنقید کی ہے اور اعتراضات اٹھائے ہیں۔ یہ صورتحال یعنی غزل کی پریشان خیالی ہمارے زمین کو مانوسیت پیدا ہو جانے کی باعث اتنی عجیب اور مضحکہ خیز معلوم نہیں ہوئی جتنی مغربی نقادوں اور قارئین کو ہوتی ہے'' (۱)

اس تمام ادبی اور تنقیدی مباحث کے باوجود جب ہم براہوئی غزل میں الم نگاری کے ماخذ ڈھونڈتے ہیں تو ہمیں براہوئی غزل میں الم پسندی کے خیالات، رویئے اور رجحانات اور اس پر مبنی مضامین مختلف موضوعات سے جنم لیتے ہوئے ملتے ہیں کہ جن میں محبوب کا کج ادا ہونا یا پھر کوئی اور ذاتی وارداتِ قلبی یا حادثات اور سانحات کا جنم لینا وغیرہ شامل ہیں۔

ا۔ محبوب کی کج ادا ہونا :

محبوب کی بے رخی کو موضوع بناتے ہوئے منظور بلوچ اپنی ایک الم پسند غزل میں کہتے ہیں :

دا شارئی نا خن تان کنا غم بدل مریک
دخُس نے سوچوہ ای تو ہر ہیت غزل مریک
بے قدر مروئے ہندغ دا الو کنے گمان
نازرک شیشئی آ امر اُست خل مروئے
ظالم نا ظلم ئے خمپک کس اس دخُس ہم داڑے

ا۔ محمد احسان، پروفیسر ''اصول تنقید'' پبلشرز چوہدری محمد سعید اقبال، علمی کتاب خانہ، لاہور 1988، صفحہ 485۔

دا بے وسی کسینا امر زُو متل مریک

پھلاتا ہیت ئے کیوہ مگر تپرہ داخس

دا زندگی نا ارمان پٹ و چیل مریک

نُچ زندگی ئی داخہ اسی سرپند مسونٹ

کہ موسم آنبار منظور ہندغ بدل مریک" (۱)

براہوئی کے ایک اور درد پسند شاعر یٰسین بسمل اپنے غزل میں محبوب کی کج روی کا یوں نشانہ بنتے ہیں :

ھنا چاوہ کنتو جتائی کرے

امر پاو او بے وفائی کرے

کرے کنتو اقرار تینٹ ہنا

کلو سعہ ایکان راہی کرے

نظر ونا دیچائے لگا کنے

سا اُف کہ ویر دوست خوائی کرے

خداغا خفا افٹ ای داسہ ہم

درے اُستے تینا ثنائی کرے

پنے اونا ڈکاٹ ای ہرکسان

ولے تینٹ او کج ادائی کرے "(۲)

محبوب کا سفر بھی عاشق کے لئے ناقابل برداشت لمحہ واقع ہوتا ہے۔الم پسندی کے موضوع میں محبوب کا سفر عاشق کو ہلا کرر کھ دیتا ہے۔براہوئی غزل میں محبوب کی جدائی اور سفر کو پروفیسر واحد مینگل اپنے غزل میں بیان کرتا ہے :

یقین کر او دلبر جتائی کینے

جتائی نا ہر پاس موتان کرینے

۱۔ منظور احمد، منظور، "برگشت"، پبلشر قلات پبلشرز جناح روڈ کوئٹہ۔1998ء، صفحہ 120-119۔

۲۔بسمل، یٰسین، "سَنبل"، پبلشرز و پرنٹر خود، کوئٹہ، 1997ء، صفحہ 93۔

خُدا کسے تا کپ یکہ گدانے
اواری و سنت کلان گچینے
کنے بےوفائی تا خلپہ شغانے
خُداغا ہلیوہ ہمیشہ پنے نے
نہ تینا نہ چین تا سوچے خلیوہ
نما یاد اُستان کلے درے نے
ارے زہیلہ تا شمار ان تینٹن
کہ زیبائے کلان او کلان ہنئے
کلو نے رینگا بریسہ کنے آ
بریسہ برک زُوت اللہ ہتے نے
برک زُو نی دلبر کہ موسم خرابے
نمی نا چھکے ءِ جھر تفے نے
کنا اُست نیکن امر بے قرارے
نما دید کن اینو سکھس ھفے نے
اگر دید نا شوق مینگل ارے نے
تو کر زہد و خواری ءِ پھٹفِ تفے نے"(۱)

جھالاوان کے ایک اور براہوئی شاعر عزیز راہی نے محبوب کی سفر اور جدائی کو اسطرح موضوع بنایا ہے :

پھر شلاپٹ و مشا رونقِ گلزار بتو
بھاز ڈکھاتِ سہان اُستنا غم خوار بتو
نا دوا غان متو نا تہپ آتا علاج
نا دُعا غان پدا ہوش ٹی بیمار بتو

۱۔ مینگل، عبدالواحد، پروفیسر، "اُست نا توار"، پبلشر براہوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ، 1999ء

تیر مس عمر نا آہ و غم و فریادٹ

ساعتس اُستنا خوشی کہ او دلدار بتو

تسہ قافلہ والاتے کسر نا تا نشان

روشنی تعہ تروکا ہمو استار بتو

سینہ غا بھاز نا نت تخار قافلہ غاک

پائیمالی نا نئے تینا مگر سار بتو

خلتے تورین نن و دے ہمونا کسرا

نور غلتان فنا مس ولے یار بتو

راہی دنیا ٹی کس دھن ہم بیوس مف

تینا غمتا نئے اظہار نا ہم وار بتو "(۱)

فارسی شاعری کی طرح براہوئی شاعری میں بھی رقابت کا موضوع بہت ہی اہم ہے۔ ایران کے شعراء محبوب کو بے حیا اور ہر جائی کا نام دیتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری میں اس موضوع نے یا اس سے وابستہ جذبات نے اس موضوع کے تحت محبت اور اس سے وابستہ دوسرے عناصر مثلاً حسد کینہ، شک و گمان، سب نے زاویے بدلے ہیں اور اس سے اور اس کیفیت نے غزل کو درد والم کی کیفیت اور جذبات کو اور ہی نکھار دیا ہے۔

محبوب اور رقیب کو موضوع بنا کر براہوئی کے ممتاز شاعر عبدالرزاق صابر اپنی غزل میں رقیب کے ظلم کی داستان سناتے ہیں:

بیمارے عشق ءِ داڑد دوا کپہ طبیب اینو

دنیا سلپس اوڑان مرگ ءِ قریب اینو

مخنگ نا خواہش افک اوغنگ نا افک قوت

حالتِ اُستنا دا مسک عجیب اینو

ا۔راہی، عزیز، "دیوان راہی"، پبلشرز پرنٹر خود، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 199۔

اے اُست بے قرارا دڑکنگ ءِ لس کہ داسا
دنیا سلیس نے آن موتِ قریب اینو
ارمان کروکو کس اُف اُست آ ہتوکو کس اُف
دوستاک و سنگتاک ہم مُر رقیب اینو
دنیا نا آسرا تیک کُل کھہ بے ہکارو
پاردر کُل کہ چٹا صابرؔ غریب اینو"(۱)

الم پسندی کے دوسرے عنوانات میں محبوب کی ناز و ادا اور محبوب کے متعلق بدگمانی شامل ہے۔ ان موضوعات کو بھی براہوئی غزل میں خاص مقام حاصل ہے۔

کبھی کبھی براہوئی عاشق اپنے محبوب کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو جاتا ہے کہ اگر محبوب کچھ عرصے کے لیئے اس کے شعری تخیل سے اوجھل ہو تو اس دوران عاشق کے دل میں مختلف قسم کے وسوسے جنم لیتے ہیں۔ کہ اس وقت میرا محبوب کہاں ہوگا۔ محبوب کی طرف سے بدگمانی کو انور اپنے غزل میں یوں بیان کرتا ہے :

"چاٹ اس لگانے عجب کنے
اُست ہوغفک بے سبب کنے
نے ملا خوشی نا زندگی
رنج و قہر و غضب کنے
کہنگ نا خُلیسِ تحپرہ
تُنغ بفک انتئے یار رب کنے
بھروسہ اُف اسہ پاس نا
نا غم کرے بے طب کنے

صابر، عبدالرزاق ، "چراغ صابر"، پبلشرز براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1981ء، صفحہ 15۔

کسرے تینا نے آن جتا کیو

برے اگہ دہن ءِ کسب کنے

شعر پادہ انتئے پاو امر

انور نا ارے ادب کنے" (۱)

براہوئی غزل میں عزیز مینگل محبوب کی ناز وادا کو موضوع بناتے ہوئے کہتے ہیں :

اُست ٹی خن تیان کسر نی کریس

اسیر تینا دام اٹ امر نی کریس

نا صورت و حنینا ننے دوست بس

ننے آ طلسمی اثر نی کریس

بلینگان کہ دے پہ دے عشق ٹی

سدا تینا حُسن آ گمر نی کریس

کرک بس نی تینا تالنگ ءِ رُسوا

جہان ءِ دا کل ءِ خبر نی کریس

خلوکا ٹی ستاغان تینا عزیزؔ

امر عشق کن پا جغر نی کریس" (۲)

محبوب کی بے وفائی اور کج ادائی، ہجر و فراق کی کیفیات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے ذاتی وارداتِ قلبی بھی اس موضوع کے لیئے براہوئی غزل میں راہ ہموار کرنے کا سبب بنے ہیں۔ یہ خاصا تقریباً ہر اس ادب کا ہے جس میں اظہار کے وسیلے اور سلیقے موجود ہیں۔ ہجر و وصال کے مضامین غزل کے مزاج سے چونکہ بہت سازگار ہیں اس لیئے براہوئی غزل میں بھی ان کی بھر مار ہے۔

۱۔ براہوئی، انور، "دتر ہور"، پبلشر زوہتر خود، کوئٹہ، 1985ء، صفحہ 77۔

۲۔ مینگل، عزیز، "شلی"، پبلشر ز براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 65۔

براہوئی غزل اور مزاحمت

براہوئی شاعری میں مزاحمتی رویوں کو تلاش کرنے کے لیئے براہوئیوں کے سماجی قبائلی اور سیاسی بندھنوں اور قرابتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

براہوئی بنیادی طور پر خانہ بدوشانہ زندگی گزارنے کے عادی ہیں ان کا سماجی ڈھانچہ قبائلی ہے اور اسی قبائلی طرز حیات میں رہ کر انہوں نے اپنے لیئے سماجی سیاسی، قبائلی اور زندگی گذارنے کے دوسرے طور طریقے اپنائے ہیں۔ براہوئی قبائل میں ایک خصلت یہ رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ماتحت رہ کر زندگی گزارنے کے کبھی عادی نہیں رہے ہیں۔ براہوئی بنیادی طور پر بہادر اور جنگجو واقع ہوئے ہیں بلوچی کے ملک الشعراء میر گل خان نصیر براہوئیوں کے بارے میں اپنی کتاب " بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی"میں تحریر کرتے ہیں۔

براہوئی یابروہی دراصل بلوچی لفظ برزکوہی سے ماخوذ ہے۔ جن کے معنی اونچے پہاڑوں پر رہنے والے لوگوں کے ہیں۔ یہ اسی لفظ کی بگڑی ہوئی صورت ہے براہوئی دراصل اُن کوشانیوں کے اولاد ہیں جو کوچ وبلوچ کہلاتے تھے اور کوہ البرز کے گردونواح میں آباد تھے۔بقول فردوسی جن پر نوشیرواں بادشاہ نے فوج کشی کی اور اُن کا قتلِ عام کیا۔(۱)

اس فوج کشی اور قتل عام کے بعد براہوئی وہاں سے نقل مکانی کر بلوچستان کے مختلف علاقوں میں آکر آباد ہوتے گئے۔

یہاں ہمارا مقصد چونکہ براہوئیوں کو تاریخ کی روشنی میں دیکھنا نہیں ہے۔بلکہ صرف ان رویوں کو واضح کرنا ہے جو براہوئیوں کے نفسیاتی مزاج کا حصہ بنے اور جن سے شاعری میں مزاحمت کا عنصر داخل ہوا۔

ماضی قریب تک بلوچستان میں ہر بلوچ قبیلے کا کوئی نہ کوئی قومی شاعر ہوا کرتا تھا۔ جنکا کام اشعار کہہ کر قبیلہ کے لوگوں کو محظوظ کرنا ہوتا تھا۔ یہ شعراء عموماً لوڑی یاڈوم ہوا کرتے تھے۔اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک مشہور شاعر شاہ کریم تھا۔شاہ کریم نوشکی کے مینگل قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔بلوچستان کے دیگر براہوئی شعراء کی طرح اِن کا بھی کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ شاہ کریم کا آبائی پیشہ شاعری تھی۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کا فرزند بشام مینگل قبیلے کا قومی شاعر مقرر ہوا۔انیسویں صدی میں

۱۔ نصیر، گل خان، میر "بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی"بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1976، صفحہ 2۔

جب بر صغیر میں انگریزوں نے ظلم و جبر کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ انگریز مختلف ممالک کو فتح کرتے جا رہے تھے۔ یہ فتوحات انہیں بلوچستان تک بھی لے آئے۔ یہاں کے لوگوں نے ہر محاذ پر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ 1839 میں انگریزوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مینگل قبیلے کا سردار میر ولی محمد مارا گیا، اگرچہ میر ولی محمد مینگل کا تعلق علاقہ وڈھ سے تھا۔ لیکن پھر بھی نوشکی کے مینگل اس سانحہ سے بھڑک اٹھے اور بشام نے ایسے موقع پر ہیرو کا کردار کیا اور اپنے اشعار سے جو عموماً رزمیہ ہوا کرتے تھے۔ مینگلوں کو جوش دلایا۔

بشام عموماً فی البدیہ اشعار کہا کرتے تھے۔ جب تک بلبل نامی رباب ان کے ہمراہ نہ ہوتا۔ اُس وقت تک رہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ نوشکی میں ایک سردارزادہ تھا جس کا نام سخی تھا۔ اُن کا اکلوتا بیٹا باران تھا۔ ایک دِن شعروشاعری کی محفل گرم تھی۔ باران نے بشام سے کہا کہ تم میرے آباؤ اجداد کو جانتے ہو وہ جو شاندار کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں۔ میں بھی اُن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میرے بارے میں چند اشعار کہہ ڈالو۔ یہاں بشام نے جو اشعار کہے تھے۔ وہ شاعری میں مزاحمتی شاعری کے زمرے میں آجاتے ہیں۔ جنہیں مثال کے طور پر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

بلبل سرو نزربابے
بشام ناست کتابے
شعرئے اینک ملائنک
شہ شئے دُن رعاتمک
ہندی عودرس خواہک
بشام تن نک پائنک

باران سخی نامارے
خوش رنگ میب دارے
پال سنجر نااوارے
مردان ہمشی تہ دُرک
ڈاکیءَ آرازیرک

دااملی اے ارے حق

مینگل بد آئے ڈک

مینگل صناپر ہیر

ہتے کہ سے تراں نر

بزز تو سونے داہم سر

شاغا سپاہی تے اندر

اف تہ مٹ دور خور

زغماتہ خواجہ دوست اے

زغم پارہ دین تا مست ارے

کل شاملک زئی تا اُست ارے

دشمن تا چاپک ءِ چست اے (۱)

نوشکی کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے ہر دور میں اور ہمیشہ سے ایسے جیالے پیدا کیئے۔ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے تاریخ میں امر رہے۔ ان لوگوں میں ادیب اور شاعر بھی شامل تھے۔ نوشکی کے قدیم شعراء میں ہشام، ریکی، قیصر خان اور بلو جیسے اعلےٰ پائے کے شاعر بھی شامل ہیں۔

براہوئی زبان کے ایک اور رزمیہ گو شاعر ریکی بھی نوشکی میں پیدا ہوئے۔ ریکی کا بچپن بھی دوسرے شعراء کی طرح بھیڑ بکریاں چرانے میں گذرا انکی طبیعت شروع سے ہی شاعری کی طرف مائل تھی۔ جب انہیں قومی حمیت نے للکارا تو بے خوف و خطر انہوں نے انگریزوں کے خلاف اشعار کہہ کر قوم کی نمائندگی کی یا بلوچستان کے عظیم خان میر نصیر خان دلی کی روح کو امداد کے لیئے پکار اوہ نصیر خان جنھوں نے پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے فوجوں کو مرہٹوں کے ہاتھوں شکست سے دو چار ہونے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے میر نصیر خان نوری کو ایک قومی ہیرو قرار دیتے ہوئے انکی مدد کے لئے لکھا میر نصیر خان جنگی تلوار نے خالصہ فوج کی کمر توڑ دی۔ انیسویں صدی میں صرف قلات ہی میں نہیں بلکہ برصغیر میں انگریزوں کے

ا۔ براہوئی عبدالرحمان ڈاکٹر "قدیم براہوئی شعراء" پبلشر ادارہ ادب بلوچستان کوئٹہ 1968، صفحہ 36-35۔

ظلم واستبداد کا بازار گرم کرر کھا تھا۔ یہاں ریکی میر نصیر خان ولی کے روح کو جس طرح مدد کے لیئے پکار تا ہے۔ یہ صنف کے حوالے سے براہوئی کے مزاحمتی شاعری میں اہم مقام رکھتا ہے۔

وختے نصیر خان ولی

ہلی نیامان ترہ کرے

اینو نتیدے دیگرے

پچہ ننے دے دیگرے

شاباش کبودر مینگل اے

یا اُشتر د سیاہ جنگل اے(۱)

براہوئی شاعری میں مزاحمتی شاعری کے حوالے سے جس نام نے خاص اہمیت حاصل کی وہ ملا مزار بدوزئی (بنگلزئی) کا ہے۔

ملا مزار بدوزئی کی پیدائش کا سال تو معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ان کی جائے پیدائش کا تعین ہوا ہے کہ وہ اسپلنجی میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں پلے پڑے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایجنٹ ٹو گورنر جنرل جسے مقامی زبان میں لاٹ صاحب کہتے تھے۔ نے بلوچ سرداروں کو سبی کے میلے کے دوران کہا کہ میں اور میرے میم صاحب کراچی جارہے ہیں۔ اگر آپ سردار لوگ میری بگھی کو اسٹیشن تک کھینچ لیں تو سرکار آپ لوگوں سے بہت خوش ہوگی۔ میلے میں موجود تمام سردار لبیک کہہ کر بگھی میں گھوڑوں کی طرح جت گئے اور اس طرح وہ بگھی میں سوار لاٹ صاحب اور میم صاحب کو ریلوے اسٹیشن تک لائے اس منظر کو ملا مزار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ان دنوں بلوچستان میں انگریزوں نے اپنے کاسہ لیس سرداروں کو کافی اختیارات دے رکھے تھے۔ اس زمانے میں سرداروں کا اپنے قبائل پر ظلم ونار وا سلوک زبان زد عام تھا۔ ملا مزار اعلے پائے کا شاعر تھے۔ وہ بلوچی، سندھی، اردو اور براہوئی میں شاعری کیا کرتے تھے۔ لیکن سوائے اس طویل نظم کے جو ادبی تاریخ میں "لاٹ کی بگھی" کے نام سے مشہور ہوا جو بیک وقت چار زبانوں میں کہی گئی ہے۔ ان کی شاعری کے دوسرے نمونے دستیاب نہ ہو سکے۔ یعنی بلوچی، سندھی، براہوئی اور اردو ملا مزار

۱۔ براہوئی عبدالرحمان ڈاکٹر "قدیم براہوئی شعراء" ادارہ ادب بلوچستان کوئٹہ 1968، صفحہ 44-43۔

بدوزئی کی یہ نظم براہوئی مزاحمتی شاعری میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔اوراس نظم کو مزاحمتی شاعری کے صنف میں خاص طور پر پیش کیاجاسکتا ہے۔لہٰذا یہاں براہوئی مزاحمتی شاعری میں ان کا یہ نظم بطورِ خاص پیش کیا جاتا ہے۔

امیر غوث بخش ریساڑی ترمزار
شاہواڑیں ریشد خان میر نامدار
بار ہوئی رویق نن ہو جھٹ پٹ
ارین ای ونی تین پہ تین سیال ومٹ
ہمو کان البو نہ اتن نہ سٹ
نواں کہ شرف ءِ نا کیر گٹ
ہمودے عقل کل نامس چٹ
کہ چکار بجھی ءِ پچ وپٹ
ماں خان دہبر ام خان اریرے مہار
سمند رتفنے مخ ءِ مست پار
یلہ کریرہر مسٹ اسہ وار
کہ ہلبو بجھی ءِ ناہس وار
سیاہ ریش ورناک عجب زوردار
بجھی نا چھکنگِ تون کریر ڈھندو قار
بجھی ٹی رجنٹ میم تون اس سوار
عجب ایسر نہ سٹیشن ءَ بے توار
ہے ہے حیا ہچے ملکان ہنا
امپک ہتوس تیناشان وپنا
بجھی ءِ چھکار او فتے خلسکت خنا
کریر مون ءِ مون تینا قوم نا

ہمدے کردسر صلاح جنگ نا

حیائٹ کھوسہ مردسر فنا

غزاغان ہکپتہ عجب رنج وڑد

غریب آتا پلنگ کن اریر شیر ومڑد

ہرادے حشر نا عدالت مرد

امیت ءِ کل ءِ خدا مردردئے

نصاری تے تون اوفتے سنگت کرو

د تاخ اینۂ تئی سفر نا کرو (۱)

یہ چند مثالیں براہوئی کے اُن قدیم شعراء کے کلام سے لی گئی ہیں جن سے براہوئی شاعری میں مزاحمتی رویوں پر روشنی پڑتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بھی بلوچستان میں کبھی بھی سیاسی حالات یہاں کے لوگوں کے لیئے موافق نہیں رہے۔ اس صورتِ حال میں بھی براہوئی شعراء بلوچستان میں عوام کی آواز بن کر ان کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

اس دور میں ایک نام براہوئی کے نامور اور ممتاز شاعر میر عبدالرحمان کرد کا بھی ہے۔ جو اس دور میں اپنی غزلوں میں عوام میں سیاسی بیداری کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور براہوئی مزاج اور سماج کا نمائندہ شاعر بنکر ایسے واقعات وحالات میں اُن حکومتوں سے ٹکر لیتے ہیں۔ جو غیر جمہوری تھے۔ میر عبدالرحمان کرد عوام میں سیاسی شعور کو بیدار کرتے ہوئے اپنے وطن اور سیاسی وسماجی حقوق کی پامالی کو بچانے کے لیئے اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں۔

وڑدور نجاتے کناد وست نی درمان کپہ

اے صنم ٹھپیادا اُستہ ارمان کپہ

عشق نی ہیل کرین جان تنگار سے

قصے تینا جفا نا نیکہ قربان کپہ

1- شاہوانی عبدالحمید پروفیسر "براہوئی زبان وادب" صفحہ 72-71 سارا وان اکیڈمی مستونگ 1995۔

اینو گڈ یکودے عشقنا شیدائی نا

مرگ نا ساعتانی زندنا سامان کپہ

استو پرولنہ عجب سوزنا ہتیس پارے

دوست نادیدکہ پرہیز مشکان کپہ

ہُل ءِ سے گواڑخ ءِ سیناکہ صنم نار تگے

اے صنم زیب تونی گواڑخے بے شان کپہ (۱)

یعنی اے دوست مجھے وطن کے لوگوں کی درد و الم کا داستان نہ سناؤ۔ اس درد نے میرے دل کو جو زخم دیئے ہیں۔ تم ان غموں اور دکھوں کیلیئے ہمدردی نہ کر۔ ہم نے تو عشق کے رسم کو نبھانے کے لیئے جان کا نذرانہ دینے کا سلیقہ سیکھا ہے۔

گلِ لالہ ایک پھول ہے۔ جس میں مجھے میرے محبوب (وطن) کی تصویر نظر آتی ہے۔ تم سرخ گل لالہ کو ہاتھ میں لیکر نہ مسل کہیں اس سے میرے محبوب کی تصویر گم نہ ہو جائے۔

اس دور کے ایک اور شاعر نادر قمبرانی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ اس دور میں جو سیاسی حالات تھے۔ وہ ان کے تناظر میں اپنی غزلوں میں لوگوں کو اپنے وطن کی آزادی اور حقوق چھین لینے کا درس دیتے ہیں۔ وہ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں۔

پلونا شاغیتہ کس آجوئی بشخ اس اف

زندناو اپارے داکا تم تفنگ دوبریک

ننگل آورنا کونا موسے وطن نار کھپرہ

زندگی ناو اشرف او فنا کہینگ دوبریک

زیبلا کونجے خلس نی پوٹوا تمو کستے اف

او نادین ناڑکھ درنج آتے سہینگ دوبریک

قوم کن آباد مرے جنت مرے ادنا دطن

داگڑا بے دم درنگ خواری کننگٹ دوبریک

1- کرد، عبدالرحمان، میر ''شف گروک'' براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1996، صفحہ 89۔

زندگی ناسوبے تیناکا ٹماکس کیٹو
سنگتی سیوت اوڑدہ مخ تفنگ دوبریک
آجوئی ناگودے دُہن خُمبؔ ئی دیچاھلیس
داہری پرہ دِترنا شولیفنگ دو بریک
بے توار اعیش و آرام زندگی ئی مرکسے
زندگی پارہ تہو توز غم خلنگ دوبریک (۱)

یعنی آزادی کوئی ایسا تحفہ نہیں جو کسی کو پیش کیا جائے۔ آزادی تو سروں کی سوداگری ہے۔ وطن کے گھبرو نوجوان وطن کے آن پر مر کٹنے کو تیار ہیں۔ قوم کے لئے آباد رہنے اور وطن کو جنت بنانے کے لیئے دن رات محنت کرو۔ اے میرے پیارے مجھے نہیں لگتا کہ تم آزادی کی دلہن کو بانہوں میں لے سکو یہ تو خون بہانے سے نصیب ہوتا ہے۔

محمد اسحاق سوز جسے صرف عام میں یارانِ سخن نے غالب کے لقب سے نوازا ہے۔ اُنکی شاعری میں جہاں عشق اور محبت کی داستانیں ہیں وہاں وہ اپنے وطن کے لوگوں کو خبردار بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ ایسے بے ضمیر قوم دشمن، وطن فروش امراء کے قربت اور دوستی سے دور رہیں، ہمیشہ حق کا ساتھ دیں چاہے اس کے لیئے انہیں جان کا نذرانہ کیوں نہ دینا پڑے آذانِ حق تمہارا پیغام ہونا چاہیئے۔ تمہارا مقابلہ کیوں نہ وقت کے فرعونوں اور نمرودوں سے ہو۔

او پھندرخ سے داہیان آتا مونا
دوئے تینا تورک اوخان آتا مونا
اوشاعر جہانے تینادوست کر
کرک بال ئی آسمان آتا مونا
لچگا میر اتا تعریف ءِکپہ
مفہ حِس ئی تاریخ دان آتا مونا
تیناحق کن کر جلو مڑدی اٹ ئی
ئی اٹی اُس انتیئے بدان آتا مونا

ا۔ قمبرانی، نادر ''شنزہ وگروک'' براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1992، صفحہ 63۔

نے جوان پارہ آماچ، شاشان، چلتن

نی زغم ہر فسہ تینا جان آتا مونا

خنامف امر سوز باطل نا طاقت

نا حق نا دا آزان آتا مونا (۱)

امیر الملک مینگل اپنے دور میں باطل، ظالم، وطن دشمنوں سے متصادم نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کے نوجوانوں کو اُن طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لئے ابھارتے ہیں جوان کے مادر وطن کے سوداگر ہیں۔ وہ حکمرانوں کے خلاف جہاد کا اعلان یوں کرتے ہیں۔

غم تہ آسیاب وزُلم نا طوفان

آمر یئے کہ اخن سر گڑدان

ایکہ ماتی وطن کہ اُست ٹپی

داکہ پاتا کتہ دنکہ تیر وکمان

اُپرہ اُستنااِی آدینگے

بے وفائی ءِ او تیک نشان

سوبہ کن انتظار مڑدلیس اف

دنکہ ڈپو امٹو رے تانکہ پلان

اُستے توریئن دست وبازوتے

ناخدائے نہ ڈل ونئے سگان

چارر ہے زندنا سلوکٹ ای

جتہ آک غمتہ جوش نا طوفان

دے ءِ دروغا تابروہ اٹ ڈکر

دوننگا تہار مہی اُن رب امان

ا۔ سوز محمد اسحاق "گروشک" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1995، صفحہ 124

غمک خوشیک دجوش کل یکجا

ڈنکہ گندار سے امیر نا بیان (۱)

اس دور کے ایک اور شاعر عزیز راہی ہیں جو اپنے عہد کے لوگوں کو جذبہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

نن تمار اا لیک رندے نا

دیرہڑ سار وشنا صوبے نا

بل کسر نا تیسہ دے آن روشنی

داغدار ارے مکنا توبے نا

دے کریریار اک تمار نگانے

اف اگرا ینو۔ پھگہ وارے نا

چار کنڈ از ندہ غا تا بل چلے

نقس کریر لفتا نیٹ جوئے نا

دوئے دو آنن تخانن توسَن

دے برو سلوا اموے نا

نا کنا فریادے ہر پن پک کسں

بے خلیرہ او مگر تھپے نا

اٹ ءمٹ پینا تخون نن تہمتے

انت مس عقلے نا سارے نا

ہند کرک پائے نے راہی چھپ مریک

نا فراوان تغ ہفک شیرے نا (۲)

جدید غزل گو شعراء میں اقبال ناظر اپنے ایک غزل میں قبائلی طرز زندگی سرداروں کی ہٹ دھرمی، جہالت

۱۔ مینگل امیر الملک "جور نا پٹل" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1992، صفحہ 80۔

۲۔ راہی عزیز "دیوانِ راہی" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1995، صفحہ 67۔

کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اور نئے روشنی، علم کی حصول، ترقی، طرز کہن کو اپنی غزل میں موضوع بنا کر اُن قوتوں پر تنقید کرتے ہیں۔ جو ترقی کے راہ میں حائل ہیں۔

زنجیرِ فکر و سوچ تفوک ءِ رواج ٹی
تینٹ شکار مسنے تینا او راج ٹی

بس اووختا فائدہ نا اونتون مس اوار
شامل تو الوپکہ ننا ننا احتجاج ٹی

اوڑ تون کین انت ملاقات ناسوب ؟
عادت نا سختے بھاز او تلخے مزاج ٹی

اے دڑد مندے قوم نا ہیتاک کل فضول
اف زندنا شعور۔ کہو کا سماج ٹی

ناشور گندہی نا اسل ماس خلیکے
اف فائدہ طبیب در مرضے علاج ٹی

مقدر زندگی نا اسّل کجھنگ ننے
باخوئے یانا ہم او پلینگ خراج ٹی

دوئے ٹی تینا تخک ہر فلک اوڑان
ملک سکون گدان ٹی یا تخت و تاج ٹی

داہپسہ او شرم وحیانا مرے مُجّس
کیرہ شمار الیسنے انت انت او ڈاج ٹی

ناظر پلو کا حصے اُسل چین اف کس
تینا تاری نیام ٹی تینا تا واج ٹی (۱)

ا۔ ناظر، اقبال، ''پن ریچ'' صفحہ 36-35 پبلشر کاروان ادب کوئٹہ، 1999۔

ان شعراء کے علاوہ حسن غمخوار، رئیس نبی داد (مرحوم) سلیم کرد اسلم پروانہ (مرحوم) وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں مزاحمتی رویئوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

غزل چونکہ حسن و عشق کے مضامین اور ہجر و فراق کی کیفیتوں کو اُجاگر کرنے میں زیادہ معاون ثابت ہوتی ہے۔اس لیئے رزمیہ موضوعات اور مزاحمت کے لیئے شاعری میں نظم کی صنف زیادہ بار آور ثابت ہوتی ہے۔براہوئی ادب پر بھی یہی رجحان غالب رہا ہے۔مزاحمت کیلئے نظم کی صنف کا انتخاب کرنے کے باوجود مزاحمتی سلسلے کو آگے بڑھانے میں براہوئی غزل کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

براہوئی غزل میں تنقید کا عنصر

جدید براہوئی غزل میں سماج میں پائے جانے والی تمام خامیاں موضوعِ سخن رہی ہیں۔ سیاست کا میدان ہو یا پھر سماجیات، تاریخ، سائنسی ترقی معاشیات، انسانیت، ادبیات غرض زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں ہے۔ جن کے سماجی، اخلاقی سیاسی و معاشرتی معاملات کے منفی پہلوؤں پر براہوئی غزل میں پر خلوص تنقید نہ کی گئی ہو۔ براہوئی غزل میں یہ وہ تنقیدی رویئے ہیں۔ جنہیں عالمی ادب کے پیمانے پر بھی پرکھا جا سکتا ہے۔

غزل ہی شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں شاعر معاشرے کے برے رسوم کو مثبت بنانے کے لیئے بر ملا اظہار کرتا ہے۔ آج کا براہوئی غزل اکیسویں صدی کے اولی تقاضوں کو مد نظر رکھ کر تنقید کے لیئے اپنے معاشرے میں موجود ہر قسم کی براہوئیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ براہوئی غزل جہاں معاشرے میں برے رسومات کو چھوڑنے کو کہتی ہے۔ وہاں وہ حاکم وقت، ظالم و جابر کو مظلوم کے حقوق کی پامالی سے باز رہنے کی تلقین بھی کرتی ہے۔ براہوئی غزل وطن فروشی کے خلاف اعلان جنگ کرتی ہے۔ براہوئی غزل خواتین کے حقوق کی بازیابی کے لیئے بھی خواتین کو تحریک دینے کی سعی کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں براہوئی غزلوں میں چند نمائندہ شعراء کے غزلوں سے کچھ تنقیدی عنصر تلاش کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

نوجوانوں کی بے راہ روی حصول تعلیم کے لیئے وسائل کو بروئے کار نہ لانے اور خاص کر وقت کو ضائع کرنے والے نشانِ تنقید بن جاتے ہیں۔ صوفی غزل گو شاعر حسن غمخوار نوجوانوں کو محنت نہ کرنے پر تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے یوں کہتے ہیں۔

ہو کہ دوٹی ہلین وختءِ
خرین آہامٹین وختءِ
ہراکہ چارہ بہائے درنا
ہموتاڈولٹ مرین وختءِ
زمانہ مستی ہنانے وختٹ
تفوکادوتے ملین وختءِ

پدی سلیسر دہو کاوختان

ہمو کہ چارہ خرین وخت ءِ

کرون محنت خنون عزت

خدا نا گنج آن گچین وخت ءِ

ہنو کاوختا ہروئی اَفک

برو کو ساعت ہمین وخت ءِ(۱)

براہوئی کے ممتاز شاعر محمد عارف ضیاء براہوئی کے جدید غزل گو شعراء میں اہم اور ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ وہ بہت ہی حساس طبیعت کے مالک اور درد پسند شاعر ہیں۔ وہ اپنی شاعری سے جہاں انسانوں میں بھوک افلاس غربت اور عدم مساوات کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں وہ آج کے اُن نوجوانوں کو جو بے کار رہتے ہیں اور یوں ہی وقت کا زیاں کرتے ہیں۔ انہیں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس عنوان کو وہ اپنی ایک غزل کا موضوع بنا کر ایسے نوجوانوں کو جو خواب خرگوش میں مبتلا ہوں پرواز کے لئے دعوت دیتا ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں اسی پرواز میں دنیا کی تمام آسائشیں موجود ہیں۔ اور یہی پرواز انہیں یہ قوت عطا کرتی ہے کہ وہ مظلوموں کی دردرسی کریں۔ مثال کے لئے اُن کی یہ غزل پیش ہے جو موضوع کے اعتبار سے براہوئی غزل میں تنقید کے عنصر کے لوازمات کو پورا کرتی ہے۔

ڈغار آن پیش مہ لوڑا مبار انک نی اسانا تا

نا منزل باز برزائے مفہ بندی مکانا تا

مقام برزائے شہباز نا ولہ او نا نشان معلوم

اِنک اندا خہ برزانی درک نا نشانا تا

گردک اس آسمان نا مہ ھشہ ماڑی تے بلانی

مرک جھمبر کرک بختانی مظلوم تانبدانا تا

خدمت گار خلقت نا خنوس نی نیک نامی ءِ

کسر کورتے نشان اینۂ زبان مربے زبانا تا

ا۔ غمخوار، محمد حسن، حاجی "توبے نا تخا" صفحہ 43، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1996۔

ملخم مر قوم نائپ آتا وارو مرنی وڑد آتا

مظاطت ءِ کرک ایلم تاتینامال و جاناتا

ضیاء ناہیت ءِال مہ چائزدہ ناطوبے کناسنگت

پدین آروشنائی نا مرے کل ءِ جہانا تا (ا)

بھوک افلاس اور غربت پر تنقید کرتے ہوئے عارف ضیاء اپنی غزل میں ان رہبران ملک و ملت کو للکارتا ہے کہ ملک میں موجود وسائل کو رعایا پر خرچ کرو ناکہ اپنی عیاشیوں۔ وہ خود عوام الناس کو اس غربت و افلاس کے خلاف جدوجہد کرنے پر اکساتے ہیں۔

امر تخوک ار یر داامتحان اث

وسیلہ اف غریباتے جہان اث

کس تالوچ کس ءِ ہند رافک

کس ناافک گندار س گندان لٹ

غریبی ءِ اجراس فتنے چ

پن ءِ تہ بس الیک تیناتران اث

غریبی پٹ ءِ گوہک ہند غاتا

مفک تاپڑ مفلس نازبان اث

مریک زردار نا ہیت ہراسہ چا

مفک نادار نا پن واستان اث (۲)

بلوچستان میں زمانہ سے ایک رسم چلی آرہی ہے۔ جسے صرف عام میں دختر فروشی کہتے ہیں۔ دختر فروشی ان معنوں میں آتا ہے کہ بیٹی کو شادی کرانے کے عوض بھاری بھاری رقوم کا تقاضہ کرنا ہوتا ہے۔ اس رسم کو ہمارے بلوچ سماج

ا۔ضیاء محمد عارف ''سپشل'' صفحہ 48-47 براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ 1995۔

۲۔ضیاء محمد عارف ''سپشل'' صفحہ 120-119 براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، 1995۔

میں ''لب'' کہتا جاتا ہے۔ جبکہ اردو میں اسے حق مہر اور پشتو میں ولور کہا جاتا ہے۔ بلوچستان میں مقامی لوگوں کے گھر کنواری بیٹیوں کے لئیے جب رشتے آتے ہیں۔ تو والدین کی طرف رشتہ بہت ہی بھاری رقوم کے عوض دینے پر رضامندی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ رسم ہمارے سماج میں بہت ہی بری رسم خیال کی جاتی ہے اور اس رسم کے خلاف بہت سے براہوئی شعراء کے علاوہ ادیب، دانشور اور علماء حضرات بھی اپنی نفرت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ان کی نفرت کا اظہار شاعری، افسانوں، ناولوں، ڈراموں، مقالوں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔

براہوئی کے قدیم شعراء نے بھی اس نفرت آمیز رسم کے خلاف آواز بلند کی ہے اور براہوئی کے جدید شعراء نے بھی اس پرچم کو اٹھائے رکھا ہے۔ جس کا اثر براہوئی سماج پر بہت زیادہ ہوا اور اس طرح آج کل اگر یہ رسم ختم تو نہیں ہوئی البتہ کم ضرور ہوئی ہے۔ براہوئی کے ممتاز شاعر انور براہوئی نے اپنی شعری مجموعہ ''دِتر ئی ہور'' میں لب کے رسم کو اپنی ایک نظم کا موضوع بنا کر ایسے والدین پر خوب تنقید کی ہے جو دختر فروشی کے دھندے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

دے مسّر ءِ لب کے کنے اوڑا ارمان ءِ
او عزت دار پا بنگہ، خدانا نشان ءِ
اسٹ او سے سر باوہ کے دم درینگپ
اسٹ داکہ اودے سودا کنگان خلپ
منوہ چپ چاپ اراڑے گدریف تے کاہک
مہنگان بیدس اوڑ کے دے اف او چاہک
خوار وزار ءِ مش ءِ بیاباں مرے یاشار
چُھ آنبار کو تل کہ او بریک خوار
آسودہ مرے ہم تو حقاق تے او امفس
بادہ لمہ، ایڑ۔ اہلم نا خدمت کرینے اخس
خوار وزار ہم مس، شاد خننگ اک
خلق تون مخک مگر الستٹ کڑک

آہ آخر آہ ءِ دے ئس باغان پیش تمک

گڑا ہندغ ءِ حقیقت آن سماءِ اینک

خداغان دعا ہم دہعہ بے اثرے

خدانا پن کیو ھرا سوداگرے

ہندن مسنے ہندن مریک۔ ہندن مروئے

براہوئی نا سیاہ سر آہ کہ سہ کروئے

ظالمباد ہ مسٹر ءِ لب کنگان باز بفک

خلق نا قاتل ءِ قانون بدل مفک

ہر دہ ہرد پھل مشنگار چمن ئی

شرم و حیا ہو مگر کس ناخن ئی

نن ہیت کین تو دنیا نا قانون پاننگ

نا مونا سوداگر تا پن خواننگ

اُست حیران ءِ ضمیر ناخلاف ہیت ہم بگن

بے دردءِ دنیائے خننگ لو چھپ سلن

دنیا پوہ مس تو کتا ارمان پورا مرے

ورنہ بدل کیوہ خلقان تینا کسرے

دہن است نا غم جان ئی کنا سر مس

دہعہ چراغ نا خاطر ھراغا سر مس

لب نا سورسے، دود نا شرمندہ ءَ مثالے

خلق نا جہالت نا زندہ ءَ مثالسے

لب احساس نا مونا پردہ ئس تفینے

لب نا قانون ننے بے راہ کرینے

گڑاس ہنگ مفک توھلینے انتئے

کس سنازیا ظلم کننگہ انتئے

غریبی ارے تو خدا غان گلہ مرے

ڈکھ گدریفنگ نا حوصلہ مرے

مسٹرنالب تیل آنبار ڈنگ خلیک

وخت ضمیر ناصورت وخت قہر نا بریک

برباد ءَ ہندغ ءِ ھنا خس برباد کیک

بے دادہ ہندغ تون ھنا خس بیداد کیک

ھرا خلق ئی پیر امسن آس انور

شرم کیسہ۔ شرم ہلک نے منگہ (۱)

اب اور خصوصاً شاعری کے کسی صنف میں تنقید کا عنصر دراصل معاشرے کے مجموعی حالات کا ردعمل ہوتا ہے۔ براہوئی شاعری بھی ان تنقیدی عناصر سے مالامال ہے۔ شاعری میں غزل کے صنف میں بھی یہ رجحان غالب صورت میں موجود ہے۔ جنہیں مختلف موضوعات کے تحت موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

ا۔ براہوئی، محمد انور "دِترئی ہور" صفحہ 75-73 پبلشر خود پرنٹر محبوب آرٹس پریس کوئٹہ 1985۔

براہوئی غزل میں نفسیاتی رجحانات

"نفسیات Psychology کا ترجمہ ہے جو کہ یونانی زبان کے دو الفاظ Psyche اور Logos کا مرکب ہے۔ لفظ Psyche ایک یونانی لفظ Psukhe سے ماخوذ ہے جس کا مطلب سائنس یا روح ہے۔ Logos کا مطلب لفظ یا منطق ہے۔ قدیم زمانے میں تمام عُلوم کو منطق قرار دیا جاتا تھا اسطرح Psychology کا استعمال سے مراد "علم رُوح" ہے۔ اس علم کا باقاعدہ ذکر ہمیں پہلی مرتبہ ارسطو کی کتاب DeAminma میں ملتا ہے لیکن سائنسی حلقوں میں Psychology کا استعمال ہمیں دسویں صدی عیسوی کی یورپی کتابوں میں پہلی دفعہ ملتا ہے۔ انگریزی زبان میں لفظ Psychology کا استعمال سب سے پہلے گردشِ خون کو دریافت کرنے والے مشہور انگریز سائنسدان ولیم ہاروے (William Harvey 1578-1589) نے کیا۔ Psychology انگریزی میں پہلی مرتبہ 1693ء میں استعمال ہوا اور لفظ Psyologist سن 1727ء میں اور لفظ Psychological سن 1776ء انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک یہ الفاظ یورپی ممالک کے لوگوں میں عام ہو چکے تھے اور برصغیر میں انگریزی علوم کے زیرِ اثر یہ الفاظ اس خطے کے پڑھے لکھے افراد کے روزمرہ استعمال میں آگئے تھے"(۱)

جب ہم ادب میں نفسیات کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی بہت ہی وسیع ہو جاتے ہیں۔ ادب انسانی زندگی کو نکھارنے اور بہتر بنانے کے لئے اپنا تاریخی کردار ادا کرتا ہے اور انسان کے جذبات اور احساسات کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے نفسیات کے ساتھ بھی ادب کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ ادب کہیں بھی کسی بھی زبان میں دنیا کے کسی بھی خطے میں یا کسی دور میں تخلیق ہوئی ہو۔ وہ ایک معاشرے، اُس میں بسنے والے افراد واقوام اور انکے مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی قوم کی نفسیاتی نشوونما کا اندازہ ادب کے ذریعے سے بہتر انداز میں لگا سکتے ہیں۔

دنیا مغربی تحریکوں اور حالات کے اُتار چڑھاؤ، تبدل و تغیر اور نشیب و فراز کا اثر جہاں دوسرے معاشروں اور ادب پر پڑی ہے وہاں براہوئی سماج بھی ان اثرات سے متاثر رہی ہے جو ایک فطری تقاضہ ہے۔ سادہ دل لوگ جو خانہ بدوش ہیں اس صدی میں جو Computer Age اور ٹیکنالوجی کی صدی کہلاتی ہے ایک پوری قوم، اپنا نام، اپنی زبان، شناخت اور ایک بھرپور

۱۔ جعفر رفیق، "نفسیات میں بنیادی موضوعات ،، لفظ نفسیات کا ارتقاء"، پبلشر ز ڈاکٹر آغا سہیل، ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ 299، اپر مال روڈ، لاہور۔، 1993ء (بار دوئم)، صفحہ 15۔

ثقافت لیئے تیز رفتار اور بدلتی ہوئی دنیا میں زندہ ہے اور ایک مخصوص رنگ لیئے دھڑک رہی ہے۔ جہاں افراد مزاجاً خانہ بدوش ہیں۔گو کہ قبائلی رسم ورواج اور مذہبی پابندیاں بھی ساتھ ساتھ پھیلتی رہی ہیں مگر جو براہوئی فرد کا مزاج ہے سو ہے۔زندگی تلخیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ مگر براہوئی اپنی مسکراہٹ نہیں بھولتا اور بے نیازانہ لہجہ جو براہوئی (بلوچ) فرد کی شان ہے پورے خطے میں ملے گا۔ قبائلی جنگیں اور رسم ورواج کا رنگ اگر اس سماج میں موجود ہے تو یہ محض اُن چند استحصالی قوتوں کا پیدا کردہ ہے اپنی مفادات کی خاطر سادہ لوح انسانوں کی اجتماعی زندگی متاثر کر رہا ہے۔خالص براہوئی فرد بیک وقت فقیرانہ اور شاہانہ مزاج رکھتا ہے۔ اس فرد کی جذباتی زندگی بہت سادہ ہوتی ہے۔ براہوئی ادب میں یہ مزاج کھلے عام نظر آتا ہے۔زندگی کی تلخیوں کو ہلکا پھلکا محسوس کرنا بھی بہادری ہے۔وفا قوم سے ہویا محبوب سے براہوئی فرداس سے عاری نہیں۔براہوئی غزل میں قوم سے بے پناہ محبت اور گل زمین سے عشق کی داستانیں ملیں گی (براہوئی گل زمیں سے مادرِ وطن مراد لیتے ہیں) یہ نفسیاتی رجحانات دقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔ عورت کے بارے میں براہوئی سماج کا مرد بہت حساس ہے۔براہوئی مرد عورت پرست ہے اور چونکہ مردانہ ذہن کی تنگ اور کینہ اقدار دنیا بھر کے معاشروں پر اثرانداز ہوئیں لہذا براہوئی سماج بھی اس evil سے عاری نہیں۔ عورت پر کی گئی شاعری میں رسم و رواج بھی آتے ہیں جنہیں کوسا جاتا ہے اور ساتھ ہی اقدار کا پرچار بھی کیا جاتا ہے جو قبائلی سماج کی دین ہیں۔"نفسیات" میں جذباتی زندگی سب سے اہم اور نمایاں ہوتی ہے۔براہوئی فرد نے ہر طرح کے حالات دیکھے ہیں۔ سماجی حالات کے تغیر نے براہوئی ادب پر بہت سے اثرات مرتب کیئے ہیں۔براہوئی غزل میں ننگ و ناموس کی نشانیاں بھی ملیں گی۔براہوئی سماج میں انسان کے محبت آمیز جذبات کھلے عام بیان نہیں کیئے جاتے۔ حیاء کا عنصر بہت شدید ہے۔براہوئی نفسیات میں اس بات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک عام سادہ لوح براہوئی کسی کو ٹوٹ کر بھی چاہے تو اظہار میں بہت تخیل ہوتا ہے۔

براہوئی سماج میں قوم پرستی کی گہری جڑیں موجود ہیں اور یہ قوم پرستی بہت مثبت ہے۔براہوئی سماج میں قوم و قومداری کا نظام جو دنیا میں قبائلی نظامِ حیات کے نام سے مشہور ہے ایک ایسا نظام ہے کہ اس نظام کی خوبی نے براہوئی معاشرہ میں فوجی، مجلسی اور دیگر معاشرتی و معاشی مسائل کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ جس نے بھی براہوئی سماج کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے متفق ہوگا کہ براہوئی بلوچوں کا اس قبائلی نظام میں حالات ووقت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اور یہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس نظام نے قومی ضرورتوں کے تحت کبھی بھی بغاوت نہیں کی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جب اس قوم کی قیادت میر نصیر خان نوری نے سنبھالی تو انہوں نے نہ صرف

اسے ہر طرح سے منظم کیا بلکہ وقت کے جدید خطوط پر استوار اور ہم آہنگ کر کے ایک قبائلی نظام رائج کیا اور اس نظام کا نام "پلوشریک" رکھا۔ میر نصیر خان 1744ء میں بلوچستان کے خان تھے۔ وہ بلوچستان کے پہلے خان (حاکم) ہیں جنہوں نے اپنی حکومت کے امور چلانے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کی اور بلوچستان میں پہلے سے موجود مقامی رسم و رواج کے مطابق کچھ اصول وضع کیے جو آج تک قومی تنظیم کے طور پر براہوئی اور بلوچ علاقوں میں رائج ہیں۔

خان میر محبت خان کے دور میں بہت سے قبائل آپس میں ناراض تھیں اور بہت سی خون ریز جنگیں لڑ چکی تھیں۔ خان نصیر خان نے ناراضگیاں ختم کر کے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر کر دیا اور اس کے بعد اپنی فوجی قوت کو بڑھانے کے لئے ایک قبائلی نظام جس کی ابتداء میر میرو کے دور میں ہوا تھا، ایک قبائلی قوم پرست فوج تیار کی جس کی تنظیم اسطرح تھی:۔

"دستہ خاص، دستہ سارا وان، دستہ جھالاوان۔ دستہ خاص کو دستہ امیر بلوچستان بھی کہا جاتا تھا۔ جو براہِ راست خان کے ماتحت تھا۔ دستہ سارا وان کا سپہ سالار سردار رئیسانی اور دستہ جھالاوان کے سپہ سالار سردار زرک زئی منتخب ہوئے۔ دستہ سارا وان کے سپہ سالار اور دستہ جھالاوان کے سپہ سالار اپنے اپنے صوبوں سے متعلق تمام امور کے ذمہ دار تھے" (۱)

اسکے علاوہ بھی براہوئی قوم پرست فوج میں چھوٹے چھوٹے بٹالین قائم تھے جو پلوشریک نظام کے نام سے مشہور ہیں۔ براہوئی معاشرہ چونکہ ایک قبائلی معاشرہ ہے لہذا براہوئی سماج میں توہمات کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انکی ہر صبح کا آغاز ہی توہم کے عنصر سے ہوتا ہے۔ اگر صبح سویرے براہوئی کے گھر کے کسی دیوار درخت وغیرہ پر کوئی کوا بیٹھ کر کائیں کائیں کرے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آج اس گھر میں کوئی خوشی ہوگی یا کوئی دوست عزیز یا مہمان باہر سے آنے والا ہے۔ جہاں توہمات نے براہوئی فرد کی زندگی کو متاثر کیا ہے وہاں اس کیفیت نے براہوئی ادب پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ براہوئی زبان کے کلاسیکی ادب میں بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن سے توہمات کی موجودگی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ براہوئی زبان میں نثری ادب ہو یا شعری ادب اس میں توہم پرستی کا رنگ شامل ہے۔ براہوئی فرد کی نفسیات پر کافی بحث ہو چکی ہے چونکہ فرد کا تعلق افراد سے اور افراد ہی کوئی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں اور معاشرے کی نشست و برخاست کے طور پر یقے اس معاشرے کی نفسیات کہلاتا ہے اور

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "رواج"، سارا وان اکیڈمی، مستونگ، 1997ء، صفحہ 66,67۔

زبان سے ادائیگی اُن کا ادب قرار پاتا ہے۔ اس لیئے براہوئی سماج اور براہوئی ادب کو بھی اسی صورتحال کا سامنا ہے۔

اس سے پہلے یہ واضح ہوا کہ براہوئی معاشرہ توہم پرست معاشرہ ہے۔ براہوئی معاشرہ خانہ بدوشانہ ذہنیت رکھتا ہے جس میں ملنگی وفقیری کی کیفیتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں :

توہمات سے متعلق کچھ خلقی اشعار جو خانہ بدوش معاشرہ کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں :

"آلم نا ہچے توبے ءَ ساہ گیرا
جتا کپ نئے ملخموت ساہ گیرا
بر کنا لیلی مور نوکر نا جندنا
جتائی تمانے موسم ءِ سندھ نا "(۱)

ترجمہ :۔ ہمارا قافلہ ایسے منحوس وقت روانہ ہوا جب چاند کو گرہن لگ چکا تھا۔ خُدا کرے کہ عزرائیل کسی کی روح قبض نہ کرے۔ او میرے محبوب! ہم سندھ کو جارہے ہیں خدا کرے تم سلامت رہو۔

ایسی بہت ساری مثالیں براہوئی ادب میں موجود ہیں جن سے براہوئی معاشرے میں توہمات کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ براہوئی موسمِ گرما اور بہار میں پہاڑی علاقوں کا رُخ کرتے ہیں جنھوان کی اصطلاح میں خُراسان کہتے ہیں۔ خُراسان میں کوئٹہ (شال کوٹ)، مستونگ، قلات وغیرہ شامل ہیں اور سردیوں میں یہ لوگ کچھی اور سندھ کا رُخ کرتے ہیں۔ اس لیئے خانہ بدوشانہ زندگی کی جھلک بھی براہوئی شاعری میں نظر آتی ہے۔

"تخ سفر جاری و ساری ہمسفر
بےاثر دا خوار زاری ہمسفر
بے خُلیسان منزل آ راہی رواں
انت ئسے نا بے قراری ہمسفر
زندنا مرغن مہارے ، یا پُھنک
موت نا دُھن بے تواری ہمسفر

ا۔ براہوئی، عبدالرحمان، ڈاکٹر، "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، 1982ء، صفحہ 66۔

وڑداتا دائِرو تو اُف درمان ئی

وڑد ءِ ئی ءِ دور باری ہمسفر

چاوہ در وختا شکار اس زندنا

بایدے نی مر شکاری ہمسفر

شار شارٹ نی حسّن نا مون ئی

گنج کسے نا ، دا اواری ہمسفر "

ترجمہ :۔ میرے ہمسفر اپنے سفر کو جاری رکھ گو کہ یہ سفر تکلیف دہ ہے۔ اس سفر کو بے خوف جاری رکھ چونکہ ہمارا منزل آگے ہے۔ زندگی لمبی ہے یا کم، سفر جاری رکھنا ہے اُسوقت تک جبتک موت کے آغوش میں چلے جاؤ۔ دوا میں غم کا علاج نہیں۔ اس درد کے بعد تمہارا منزل تمہیں مل جائے گا۔ میں جانتا ہوں تم وقت کے ہاتھوں شکار ہو چکے ہو لیکن اب تمہیں وقت کو شکار کرنا ہے۔

جہاں براہوئی خانہ بدوشانہ ذہنیت رکھتے ہیں وہاں ان کی طبیعت فقیری اور ملنگانہ کیفیت سے بھی لبریز ہے جس نے انکے ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ یہ فقیری اور ملنگی جہاں براہوئی لوک ادب میں نموپاتی ہوئی نظر آتی ہیں وہاں جدید شاعری میں بھی اپنی وجود کا احساس دلاتی ہے۔ براہوئی کی فقیری اور ملنگی کی کیفیت قدیم براہوئی لوک شاعری میں بھی ملتی ہے مثلاً :

"زہیری تموک اُن سال ءَ نا

موسم خراسان آ کانہ

اول منزل نا سبی نا دانگے

حاجی حمل نا زیارت ءِ کینہ

ایلو منزل نا ڈھاڈر آن دانگے

پیر دُوپاسی نا زیارت ءِ کینہ

ایلو منزل نا بولان آن دانگے

لی لی نا نی زیارت ءِ کینہ

ایلو منزل نا مچھ آن دانگے

دُلو ھئیر نا زیارت ءِ کینہ

ایلو منزل نا سریاب آن دانگے

پیر بلو نا زیارت ءِ کینہ "(۱)

ترجمہ :۔ سال بھر سے کوئی سفر نہیں ہوا۔اب خراسان میں موسم بہار آئی ہے۔ ہمارا قافلہ خراسان جانے کے لئے تیار ہے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ سبی سے آگے ہے جہاں حمل کا مزار ہے۔اس کے زیارت کے بعد ہمارا پڑاؤ ڈھاڈر ہے۔ جہاں پیر دُوپاسی کا زیارت کرینگے۔ اگلا پڑاؤ بولان ہے۔ جہاں ہم لی لی نانی کی زیارت کرینگے۔اس کے بعد مچھ ہے۔ یہاں دلو بابا کا مزار ہے۔ اس کے زیارت کے بعد ہمارا اگلا پڑاؤ کوئٹہ سریاب ہے۔ جہاں ہم حضرت پیر بلو بابا کا زیارت کرینگے۔

فقیری اور ملنگی کی جھلک اسلم پروانہ کی غزل میں یوں ملتا ہے :

"فقیری نئے امیری نا سوالے

نہ غیر آن دستگیری نا سوالے

کنے عشق آن نا ہم خبر اف

نا زلفان اسیری نا سوالے

زہیری زہیر ئسے اُستا کہ شولیک

زہیری ئی زہیری نا سوالے

دا ورنائی ئی پیری نا سوالے

فقط روشن ضمیری نا سوالے (۲)

ترجمہ :۔ فقیری نہ اسیری کا سوال ہے۔نہ غیروں سے دستگیری کا سوال ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عشق عدم کیا ہے۔یادیں بس یادیں ہیں۔جو آنکھوں کو سمندر کے حوالے کر رہی ہیں۔ میں نے نہ جوانی چاہی اور نہ ہی میں لمبی زندگی

۱۔ مینگل، افضل، براہوئی، لوک شاعری، "لوک شاعری" براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 189۔

۲۔ پروانہ اسلم "جذبات اسلم" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ۔1995، صفحہ 135۔

کا طلبگار رہا۔ میرا سوال تو صرف روشن ضمیری کا سوال ہے۔

براہوئی معاشرے میں عام طور پر عورت پرستی عام ہے۔ اُسکے رویّوں میں عشق بھرپور انداز میں شامل ہے۔ براہوئی فرد عشق کرتا ہے جب عشق کرتا ہے تو ٹوٹ کر کرتا ہے۔ اس جنونی کیفیت کے دوران یہ نہیں سوچتا کہ محبوب کے قبیلے والے کتنے طاقتور ہیں۔ عرب عاشق اپنے محبوب سے ڈھنکے کے چوٹ پر عشق کرتا تھا کبھی کبھار یہ عشق لڑائیوں اور قتل غارت کا شکل اختیار کرلیتا تھا۔ اسی طرح براہوئی بھی جب عشق کرتا ہے تو بے خوف وخطر کرتا ہے۔ شاید یہ عشقیہ جراثیم ان میں عربی خون سے داخل ہوئی ہیں۔ جیسے عربوں میں عاشق اور محبوب اپنے عشق کے ہاتھوں کئی دھائیوں تک جنگ وجدل کے بھتے چڑھ جاتے۔ اسی طرح براہوئی سماج میں بھی جب کبھی اسطرح کے عشق کا پتہ چل جاتا ہے تو براہوئی فرد اپنے عشق کے ہاتھوں اپنا خون بہانے کیلئے بھی خوشی تیار ہوجاتا ہے لیکن اس معاشرے میں عورت پرستی کے علاوہ عورت ذات کی بے حد احترام کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہی عورت اسی معاشرے میں ماں کے طور پر، بہن کے طور پر، بیٹی کے طور پر اور بہو کے طور پر بھی اپنی شناخت کراتی ہے۔ براہوئی سماج میں بہت سے ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بڑے بڑے جنگوں کے دوران اگر کوئی عورت درمیانِ جنگ آئی ہو تو ان کے احترام میں وہ جنگ ختم کردی گئی ہے۔ براہوئی سماج میں بڑے بڑے میڑھ میں جب عورت شامل ہوں تو بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں میڑھ نامراد واپس لوٹا ہو۔ براہوئی غزل میں عورت پرستی اور محبوب کے تصور کا اپنا انداز ہے۔

یٰسین بسملؔ اپنے محبوب سے یوں اپنے پیار کا اظہار کرتا ہے:

"ہوغاٹ خوشی آن کہ دلدار پاش مس
مرّان ای خناٹ کنا یار پاش مس
تما خبر کنے ہمو زلفاتا خوشبو آن
حُسن آتا زیب و زینت سینگار پاش مس
محسہ ایکہ مونا کنا بس اُرا تما
تو بے نا ریا دُون کہ استار پاش مس
شوخی ہمو اوا و ہمو ناز لاڈ تو
خوشی تو بُلبُل آ خوش گفتار پاش مس

لیٹین دھنو دلرُبا ئس قسمت کنا کنے

بسمّل چمن نا پھُل ءَ تو گلزار پاش مس "

ترجمہ :۔ جب میں نے اپنے محبوب کو آتے دیکھا تو خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آئے جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ خوشبو میرے محبوب کا ہے۔ جس کی خوشبو اور رنگت دسینگار دنیا میں یکتا ہے جونہی میرا محبوب میرے پاس آیا ایسا محسوس ہوا جیسے چاند کے آس پاس کوئی ستارا جگمگا رہا ہے۔ جس رفتار سے میرا محبوب آرہا تھا جیسے کوئی بُلبُل چمن کے پھولوں میں اپنے انداز سے چل رہا ہے۔

عاصم فریدؔ کے غزل میں عاشق اپنے محبوب سے یوں مخاطب ہے :

"نی خن تیٹ دا اُست ءِ نشانا کریس

کنے زیبا تیکن دیوانا کریس

نا گلابی ءَ رنگ خنتو بادای آ

کنے تینا شیدا ادا نا کریس

ہار سنگار کرے ئس صنم ہئس

پورو اقرار ءِ نی دفا نا کریس

آداری نہ لطف ءِ ای انت کیو بیان

جہانے کنے آن بیگانا کریس

ہس عاصم فرید نا ہندا آرزُو

نی ارمان ءِ پورو گدانا کریس (۱)

ترجمہ :۔ تم نے آنکھوں سے میرے دل پر تیر چلائے۔ تم نے میرے محبوب مجھے دیوانہ بنا کر چھوڑ دیا۔ تمہارے گلابی

ا۔ فرید عاصم، "سھیل"، راسکو ادبی دیوان، نوشکی، 1994ء، صفحہ 36۔

رنگت اور بادامی آنکھوں نے مجھے اپنا اسیر بنادیا ہے۔ بناؤ سنگھار کر کے تم آئے ہو جیسے تم نے اپنانے کا وعدہ وفا کیا ہے۔ ان لمحات کا میں کیا ذکر کروں جب میں اور تم ایک ساتھ ہوں ایسا لگتا ہے کہ تمہارے آنے سے میں دنیا سے بیگانہ ہوں۔

براہوئی فرد وطن کی آن بان پر ہر وقت مر مٹنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ مزاحمت براہوئی فرد کے مزاج میں جزو لازم کی طرح شامل ہے۔ براہوئی فرد کی Historical and Psychological Background کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ براہوئی فرد کے رویّوں میں مزاحمت اور انکار کی عنصر نمایاں ہے۔ مزاحمت انکے مزاج میں ظلم کے خلاف مظلوم کے حق میں، حاکم کے خلاف محکوم کے حق میں، جابر کے خلاف مجبور کے حق میں اور شر کی صورت میں حق کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ تاریخی طور پر کبھی فردوسی کی شاہنامہ میں منفرد ہے۔ اُس نے عادل نوشیروان کے عہد میں مزاحمت اور انکار کی زندگی بسر کی۔ کبھی وہ شہید کربلا کے ساتھ یزید سے برسرِ پیکار نظر آیا تو کبھی انگریز استعمار کو للکارتا ہے۔ حق کی آواز کے لئے اگر انہوں نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا لیکن جب احمد شاہ ابدالی کا دربار مادرِ وطن کے خلاف سازشوں کا آماجگاہ بنا تو وہ انہوں نے مزاحمت کی راہ اپنا کر انکار کی سیاست کی پھر قیام پاکستان کے بعد مختلف حکمرانوں کے مختلف ادوار میں جب بھی مادرِ وطن کے خلاف سازشوں کا آغاز ہوا براہوئی مزاج نے مزاحمت کی اور غلط رویّوں کو ماننے سے انکار کیا۔

براہوئی مزاج میں اس مزاحمتی اور انکاری رویّوں نے براہوئی معاشرہ اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کیئے اور انہی انکاری اور مزاحمتی رویئے براہوئی فرد کی اپنی الگ پہچان کے طور پر اُس کے مزاج اور ادب کے نفسیاتی جائزوں میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

ذیل میں چند ایسے براہوئی اشعار اور غزلیں دی جاتی ہیں جن سے براہوئی مزاج میں وطن دوستی جسے وہ مادرِ وطن کا نام دیکر یاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ براہوئی غزلوں میں قوم پرستی اور مزاحمت اور انکاری رویّوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو براہوئی فرد کی مزاج اور اس کے ادب کی بتدریج نفسیاتی جائزہ و مطالعہ ہے۔

براہوئی پہلے بلوچ اور پھر مسلمان ہے۔ بحیثیت قوم اپنی تشخص کا اظہار بے باکانہ انداز میں کرنا براہوئی فرد کا ایمان ہے۔ میر گل خان نصیر اپنی کتاب "مشعد نا جنگ" نام میں براہوئی کا قوم پرست ہونے کا یوں کرتا ہے:۔

" ارے تاریکی آن روشنائی
بلوچاتا پِدا بس بادشاہی
چہل سال نیست و تاہُود مس اُن نن
زوال نا حداجتی بش اُن نن
سلیس نام نے ام نامداری
نن و دے قومنا اِس مونا خواری
ننا فریاد بہنا بڑزا اسماتا ءِ
ملائک ، عرش و کرسی ، لامکانا ءِ
ملار درگاہِ رحمت نا ملکاک
ننا بخُر توارے لا ملکاک
کرے رب نا فرمان ءِ راہی
میر احمد یار نا بس بادشاہی
میر احمد یار غازی نوجوانا
مرے رحمت بلوچاتا ءِ خدا نا
بلوچ قوم نا پشت و پنا ءِ
سخا اُٹ حاتماں او ماسوائے

ارے عادل نوشیروانے
ارے او قدردانے تون یکجا روانے
ام بخان چٹ کروکے ظالماتا
مدت کہ نی قومنا محتا تفوکے
ام مظلوماتا او آہے ہوکے
نصیر خان نا کرک نی پاتے تازہ
کرک مُرّ قوم نا موتان دا غازہ
کرک تعلیم کن نی اوفتا حیلہ ئس
بغیرس نے آن چین اف تگا وصلہ ئس
آزات پا مرگ اسٹ اس دالکیان خواتا
غلای آن نن مرگے جوان چانہ
بلوچاتا ارے نے آ ءِ اُمیدس
خداوند نصیب کے اوفتے عیدس
ہمیشہ شادمانی ، شادمانی
ہمیش کے بخت و دولت نا غلامی "(۱)

ترجمہ :۔ اس نظم کی تشریح یوں ہے کہ :

ہر تاریک رات کے بعد ایک صبح ہوتی ہے۔ بلوچوں کو بادشاہی ملی۔ اس سے پہلے بلوچ چالیس سال تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ اس جنگ میں بلوچ نام سے زیادہ بے نام ہوئے۔ ہم نے ملک کی طرف مُنہ کر کے فریاد کی اوپر والے نے ہماری فریاد سن لی۔ اُس نے میر احمد یار کی صورت میں ایک بادشاہ کو اپنا حاکم عطا کیا۔ میر احمد یار جو بلوچوں کی پشت و پناہ ہے۔ اُس کی سخاوت حاتم

۱۔ نصیر، میر گل خان، "مشہد نا جنگ نامہ"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1981ء، صفحہ 17,18۔

سے بھی زیادہ ہے۔ ایک بادشاہ عادل نوشیرواں ہیں۔ جس کے عہد میں اس کے قافلے میں بھیڑ اور بھیڑیا ایک گھاٹ میں پانی پیتے تھے۔ اُس نے بلوچوں کو تخت تاراج کیا۔ آزادی یا موت میں سے کوئی ایک بہتر ہے۔ لیکن ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ اے نصیر خان بلوچوں کی تم سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ خدا کرے کہ تمہارے عہد میں بلوچوں کو ایک نئی صبح کا پیغام ملے۔ بلوچوں کے لئے شادمانی شادمانی، تخت، دولت اور بادشاہت ہے نہ کہ غلامی"۔

ان اشعار میں براہوئی فرد جو غلامی کے نام سے نفرت کرتا ہے من حیث القوم بلوچیت کی بات کرتا ہے۔ ظلم کے خلاف وقت کی پکار نظر آتا ہے۔ جہاں وہ عادل نوشیرواں سے ٹکرانے کی بات کرتا ہے وہاں وہ اپنے بادشاہ احمد یار اول وارث نوری نصیر خان کو بلوچوں کی امانت میں دیتا ہے اور اُس سے یہ امید کرتا ہے کہ وہ بلوچوں کی آزادی کے نشان ہونگے۔ ان اشعار میں براہوئی فرد کی ظلم کے خلاف آواز، للکار، مزاحمت اور انکار کی ردئیوں کا احساس ہوتا ہے۔

قیامِ پاکستان سے لیکر ذوالفقار علی بھٹو کی دور حکومت تک حکمرانوں اور بلوچوں کے درمیان کوئی تین بار مسلح فوج کشی ہوئی جنکا براہوئی فرد نے مقابلہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں جب ایک بار پھر بلوچستان کے لوگوں پر فوج کشی ہوئی تو اس کا بھی انہوں نے بھر پور انداز میں مزاحمت کیا۔ اس مزاحمت اور انکار کی صورت میر عبدالرحمان کرد کی شاعری میں یوں نظر آتی ہے :۔

"پھدا جیل و زنجیر نا دور لس
پھدا ٹوفک و تیر نا دور لس
پھدا گولہ و بمب باری نا زور
پھدا ملک ٹی قہر و آفت نا شور
پھدا نعرہ ئس خلک مینگل علی
پھدا لڑزہ ٹی بسو گھٹ و گلی
پھدا میر سفر خان ھکل و توار
اونا دہشتان دشمناک بے قرار
آغا میر سلیمان غازی نا زور

اونا تیر و باری اونا گشت و شور

لونگ خان مینگل گچینا امیر

وطن نا شہید آتا او زندہ پیر

شفیع جان مُنگل تُغان لش مروک

شہادت نا کیف و خُمارے خنوک

شہادت نا درجہ شہادت نا شان

خوش اوفتیان پیغمبر آخر زمان

سیاہ مست نوداک مش تیا تفیتر

شہد آتا قبر آتیا پھر دسیر "(۱)

ترجمہ :- آج پھر بلوچوں پر زندان اور جولان کا دور آیا ہے۔ آج پھر گولہ وبارود کا زور ہے۔ آج پھر قہر و آفت کا شور ہے۔ آج پھر بوڑھے علی محمد مینگل کی للکار۔ آج پھر حاکمِ وقت کے درو بام لرزہ براندام ہوئے۔ آج پھر میر سفر خان نے للکارا۔ جس سے دشمن کانپ جاتے تھے۔ آج پھر غازی سلمان سینہ سپر ہوئے۔ جو شب خون مارنے کیلئے یکتا ہیں۔ آج پھر بوڑھے لونگ خان نے گولہ وبارود کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سینے کو چھلنی کر دیا۔ اور مادر وطن کے بوڑھے شہید کا درجہ حاصل کیا۔ اس جنگ میں شفیع جان بھی پیش پیش تھے جنکی آنکھیں شہادت کی خُمار سے مخمور رہتی تھیں۔

یہ وہ مجموعی موضوعات تھے کہ جن میں براہوئی شاعری اور خصوصاً براہوئی غزل کے نفسیاتی رجحانات کا ہمیں پتہ ملتا ہے۔ یہ نفسیاتی رجحانات اچانک براہوئی غزل میں داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ ان سماجی رویوں کی دین ہیں جن کا تسلسل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ کہنا بھی بے محل نہیں کہ براہوئی غزل نے اپنے نفسیاتی مزاج کو اپنی کلاسیک سے وابستہ کر رکھا ہے اور غزل میں زیادہ تر رجحانات کا ماخذ قدیم براہوئی شاعری ہے۔

۱۔ کرد، عبدالرحمان، میر، "شف گردک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 107,108۔

باب ہفتم : براہوئی غزل گو شعراء

ا۔ دورِ قدیم کے براہوئی غزل گو شعراء

(1801تا1947ء)

۲۔ درمیانی دور کے براہوئی غزل گو شعراء

(1947تا 1980ء)

۳۔ جدید دور کے براہوئی غزل گو شعراء

(1980ء تاحال)

براہوئی غزل گو شعراء

جب سے براہوئی شاعری کے تحریری دور کا آغاز ہوتا ہے اسی دور کو براہوئی شاعری کا پہلا دور خیال کیا جاتا ہے۔ براہوئی زبان میں پہلی شاعری کی کتاب تحفۃ العجائب ہے جسے مولانا ملک داد قلاتی نے 1760ء میں تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کو حاجی نبو جان قلندرانی نے 1906ء میں چھپوا کر منظر عام پر لایا۔ ہمارا موضوع چونکہ براہوئی شاعری میں صرف براہوئی غزل کی تاریخ، آغاز اور ارتقاء ہے لہذا یہاں انہی موضوعات کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

براہوئی غزل کو ادوار کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی :۔

ا۔ قدیم دور کے براہوئی غزل گو شعراء

۲۔ درمیانی دور کے براہوئی غزل گو شعراء

۳۔ جدید دور کے براہوئی غزل گو شعراء

براہوئی غزل نے چونکہ اپنی سفر کا آغاز دستیاب معلومات کے مطابق انیسویں صدی عیسوی سے کیا ہے اسلئے براہوئی زبان میں غزل گو شاعری میں سب سے پہلا نام مُلا محمد حسن کا آتا ہے اور پھر چونکہ انیسویں صدی 1801ء سے شروع ہوتا ہے لہذا براہوئی زبان کے قدیم غزل گو شعراء کے دور کو 1801ء تا قیامِ پاکستان 1947ء تک تصور کیا جاتا ہے۔ اس طویل دور میں براہوئی غزل نے اگرچہ غزل کے فن کی رو سے بہتر آغاز کیا لیکن بعد میں براہوئی غزل پر اسلامی رنگ غالب رہی لیکن براہوئی غزل کا دوسرا دور جو قیامِ پاکستان سے لیکر 1980ء تک پھیلا ہوا ہے۔ براہوئی غزل کا یہ درمیانی دور براہوئی غزل کے قدیم اور جدید کے درمیان پُل کا کام دیتی ہے۔ 1947ء کے بعد کے ایام میں بلوچستان اپنی سیاسی اور معاشی تاریخ کے کئی مرحلوں سے گزرا جن کے اثرات نے براہوئی غزل پر نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس دور میں ایسے نامور شعراء پیدا ہوئے جو براہوئی شاعری اور خاص طور پر جدید براہوئی غزل کی ترقی کا سبب بنے۔ اس دور کے براہوئی غزلوں میں جہاں مذہبی رنگ موجود ہے وہاں اس میں حب الوطنی، گل وبلبل کے قصے، حُسن وجمال کے عاشقانہ مضامین کے علاوہ تصوف پر بھی مضامین نظر آتے ہیں۔

براہوئی غزل کا تیسرا دور اس کا جدید دور ہے جو 1980ء سے لیکر تاحال ہے۔ یہ دور براہوئی غزل کا ذرخیز ترین دور ہے۔ اس دور کے براہوئی غزلوں میں ان تمام فنی لوازمات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا جو غزل کے لئے مخصوص سمجھے

جاتے ہیں۔اس دور میں براہوئی غزل نے نہ صرف حسن وعشق سے لیکر سماج میں روزمرہ رونما ہونے والے واقعات، احساسات، کیفیات کو اپنے اندر سمولیابلکہ اس دور میں تیز ترانفارمیشن اور میڈیا کے ذریعے وہ تمام عالمی واقعات بھی براہوئی غزل کا موضوع بنے جن کے اثرات مختلف انداز میں مختلف ممالک اور مختلف خطوں پر پڑے۔

لہذااس باب میں براہوئی غزل گو شعراء کی تفصیل سے ذکراُن کے عہد کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ذیل میں اس عہد کے شعراءاوراُن کے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

دورِ قدیم کے براہوئی غزل گو شعراء (1801 تا 1947ء)

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ براہوئی غزل نے انیسویں صدی سے اپنی سفر کا آغاز کیا۔ اسی دور کے غزل پر اُس عہد کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تاریخی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہی وہ وجوہات واسباب تھے جن سے براہوئی غزل نے اثر لیا۔ اُس دور کے چند نمایاں شعراء اور اُن کے کلام کی تفصیل درج ذیل ہے :۔

مُلا محمد حسن بدوزئی

انگریزوں نے جب انیسویں صدی میں ہندوستان پر مکمل قبضہ جمالیا۔ برصغیر میں مغل تاجدار بادشاہوں کے آخری وارث بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے رنگون بھیج دیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زوال کے بعد انگریزوں نے بلوچستان کا رخ کیا تو اسی صدی کے چوتھے عشرے میں بلوچستان پر بھی انہوں نے چڑھائی کی۔ انگریزوں نے اپنی آمد کے ابتداء میں ہی ایک خونی جھڑپ میں بلوچستان کے حکمران خان محراب خان کو شہید کر دیا، انکے دربار کے جان نثاروں نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان جان نثاروں میں دوسرے لوگوں کے علاوہ مُلا محمد حسن اور اُنکے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے۔ بلوچوں کے مقابلے میں انگریزوں کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ بہت سی نامور ہستیوں نے اس جنگ میں مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ دوسری طرف اسی جھڑپ میں انگریزوں کے پینتیس (35) افراد مارے گئے۔ جنگ ختم ہوئی۔ قلات پر انگریزوں کے قبضے کا یہ پہلا دن تھا۔ انگریزوں نے خان محراب خان کے دربار کے بہت سی ہستیوں کو قیدی بنالیا۔ ان قیدیوں میں براہوئی کے سب سے پہلے غزل گو شاعر مُلا محمد حسن بھی شامل تھے۔ مُلا محمد حسن کی تاریخ ولادت کا بسیار کوشش کے باوجود پتہ نہ چل سکا البتہ اُن کی وفات کو مرحوم کے ایک بیٹے میر مولاداد نے ایک فارسی قطعہ میں ظاہر کیا ہے جسکے مطابق میر محمد حسن بنگلزئی (براہوئی) کا تاریخ وفات 5 رمضان 1272 ہجری ہے۔

"عاقبت زہر ریخت در ملقش۔   از کفِ حاسدان کین آور
شد شہید آن اسیر شہید کلام۔   رفت در خلد برلب کوثر
گفت باآہ و نالہ در کوشش۔   کہ دو ہفت از مغفور ساز بدر

1286ء۔ ۱۲۷۲ھ" (۱)

ا۔ "گلدستہ قلات" ، مرکز تحقیقات فارسی، ایران، سن ندارد، صفحہ 7۔

میر محمد حسن دربار قلات کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچے۔ انکی زندگی نے سیاست کے کئی پیچ و تاب دیکھے۔ اپنی زندگی کے آئینے میں مُلا محمد حسن کبھی قادر الکلام شاعر نظر آتے ہیں تو کبھی سفیر اور وزیر مملکت، تو کبھی میدان کارزار کا بہادر سپاہی، تو کبھی ضمیر کے قیدی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ مُلا محمد حسن کی جو بھی سیاسی زندگی ہو، انکے کردار کے بارے میں ملک الشعراء جناب میر گل خان نصیر اچھی رائے نہیں رکھتے۔ میر گل خان نصیر نے اپنی تصنیف تاریخ بلوچستان اور اخوند محمد صدیق کی کتاب اخبار اسرار کے اردو ترجمے "تاریخ خوانین قلات" کے حاشیوں میں مُلا محمد حسن کی کردار پر الگ الگ نوٹ بھی تحریر کیئے ہیں۔ تاریخ بلوچستان حصہ اول میں گل خان نصیر رقمطراز ہیں کہ :۔

"میر نصیر خان اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ ہوتے ہی ملا محمد حسن نے فوراً پہلو بدل لیا۔ ملا محمد حسن بلا ذہین، چالاک اور چاپلوس تھا۔ انگریزوں کی طرف سے اشارہ پا کر اس نے دو چار ملاقاتوں میں میر نصیر خان کا دل موہ لیا۔ میر نصیر خان نے زیادہ تر اس خیال سے بھی کہ ملا محمد حسن انگریزوں کے ساتھ وقت گزر چکا ہے۔ اُن کی خُو بُو اور سیاست سے واقف ہے۔ انگریزوں کے ساتھ گفت و شنید اور خط و کتابت کرنے میں اس کی صحیح راہنمائی کرے گا اور اس طرح اسے انگریزوں کی خوشنودی حاصل ہو گی۔ اپنے باپ کے قاتل اور بلوچستان کے غدار اعظم کو پھر آغوش میں لیکر اپنا وزیر بنا لیا میر نصیر خان اپنی کمال دانشمندی کے باوجود یہ نہ سمجھ سکا کہ غدار ہر حال میں غدار ہی رہتا ہے، چنانچہ ویسا ہی ہوا۔" (۱)

مرزا علی احمد احمد زئی خاندان کے ایک فرد تھے اور جن کا شمار خان اعظم میر خداداد خان کے اہم مخالفین میں ہوتا تھا۔ جو فارسی شعر د سخن کے بھی شناور تھے۔ انہوں نے اپنی یاداشت کو ایک کتابچے کی صورت میں تحریر کی ہے جو ایک حصے کے طور پر آخوند محمد صدیق کی کتاب اخبار البرار میں شامل ہے۔ اِن دونوں مسودوں کا میر گل خان نصیر نے اردو ترجمہ "تاریخ خوانینِ قلات" کے نام سے کیا ہے۔ گل خان نصیر اپنی کتاب میں مرزا علی احمد کے مسودہ یاداشت کے ایک اقتباس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

"ملا محمد حسن میر نصیر خان کا وزیر تھا۔ جو عموماً خان کے مرضی کے خلاف کام کیا کرتا تھا۔ جس سے

۱۔ نصیر، گل خان "تاریخ بلوچستان" (حصہ اول) 1979 (طبع دوئم) صفحہ 181-180۔

امورِ ملکی ومالی میں خلل پڑ جایا کرتا تھا۔ایک دفعہ میر نصیر خان نے ملا محمد حسن کو اپنا سفیر بنا کر میجر جان جیکب سی بی کے پاس خان گڑھ (جیکب آباد) بھیجا ملا محمد حسن نے سفارتی امور پر بحث کرنے کی بجائے جیکب کے ساتھ میر نصیر خان کی شکایت کی اور بتلایا کہ میر نصیر خان حکومت چلانے کے اہل نہیں ہیں اور انگریز سرکار کا دشمن ہے لٰہذا اُسے ہٹا کر مجھے قلات کی حکومت سونپ دی جائے تو میں تمام کام انگریز سرکار کی مرضی کے مطابق کرونگا۔ جیکب نے ملا حسن کی تمام باتوں کو ایک خط کے ذریعے نصیر خان کو روانہ کیا۔خان صاحب نے ملا محمد حسن اور اُس کے بھائی محمد امین کو گرفتار کر کے قید کر لیا۔ دو سال بعد محمد حسن قید ہی میں مر گیا۔(۱)

لیکن بلوچستان کے ایک اور دانشور محقق اور ادیب ملک محمد رمضان بلوچ مرحوم میر گل خان نصیر سے اس معاملے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ملک محمد رمضان "گلدستہ قلات" کے تعارف میں تحریر کرتے ہیں۔

مرحوم ملا محمد حسن کا شمار اپنے عہد کے جلیل القدر نامور ہستیوں میں ہوتا تھا۔ میر گل خان نصیر نے اپنی کتاب تاریخ بلوچستان جلد اول میں انہیں ایرانی نژاد بتایا ہے۔لیکن امر واقعی کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہے میری معلومات کے مطابق مرحوم ایرانی النسل نہیں بلوچ وبرائیوں کے مشہور قبیلہ بنگلزئی کے ذیلی طائفہ بدوزئی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ جنہیں بعد میں اپنے پردادا آغا علی کے نسبت سے آغا علی زئی بھی کہا جانے لگا۔میر گل خان نصیر نے اپنی کتاب میں جہاں کہیں بھی مرحوم اور اسکے خاندان کا ذکر کیا ہے۔انہیں اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا اور مرحوم کے ساتھ اُس کے پورے خاندان کو سازشی اور فتنہ پرداز ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے جواز میں داؤد محمد خلجی سے لیکر آخوند صالح محمد، آخوند فتح محمد اور اس کے آگے خود خان محراب خان کی شہادت کے خونیں واقعات کے اشتہاد کیا ہے۔میدان کارزار میں آگے بڑھنا اور اس مقابلے میں اپنے معاصرین لے نکل جانا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔اس کوشش میں مرحوم اور اُس کا خاندان اپنی جانگاہ مساعی کے نتیجے میں وزارتِ عظمٰی کے منصب جلیلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ایک مؤرخ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی پسند وناپسند کی بنیاد پر ملا محمد حسن کو غدار ثابت کرنے میں اپنا زور قلم صرف کرے۔وہ خان محراب خان کے خلاف سرداروں کی بغاوت سے لیکر انگریزوں کے ہاتھوں قلات کی تسخیر تک تمام واقعات کی ذمہ داری جن اکابرین پر ڈالتے ہیں ان میں نائب محمد حسن اور اُن کے خاندان کے افراد کا بطور خاص ذکر

۱۔ نصیر، گل خان، میر "تاریخ بلوچستان" حصہ اول، قلات پبلشرز جناح روڈ کوئٹہ 1979 بار دوئم، صفحہ 181-180

کرتے ہیں اور قاری کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ خان محراب خان کے عہد میں جو ناگفتہ بہ حالات رونما ہوئے وہ خان کی شخصی کمزوریوں کے مقابلے میں ان درباری سازشوں کے رہن منت ہیں۔ جو حصولِ اقتدار کے لیئے خان شہید کے درباریوں کی طرف سے روا رکھی گئیں۔ ایک کامیاب مورّخ کی سب سے بڑی نشانی یہی ہوتی ہے کہ ذاتی پسند و ناپسند کے جذبات سے بلند ہو کر واقعات کا تجزیہ کرے اور واقعات کی کوکھ سے نتائج اخذ کرے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ بلوچستان کے منصف میر گل خان نصیر نے اس معنی میں مرحوم ملا محمد حسن اور اُس کے خاندان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔(۱)

اس سے آگے بڑھ کر ملک محمد رمضان بلوچ صاحب ملا محمد حسن اور اُس کے خاندان کو بے گناہ ثابت کرنے کی بہت ساری مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر ہمارا تعلق ملا محمد حسن کے سیاسی تعلقات و کردار سے نہیں بلکہ ہمارا مقصد انہیں صرف بطور شاعر دیکھنا متعارف کراتا ہے۔

ملا محمد حسن نے بلوچی، فارسی اور براہوئی تینوں زبانوں میں شاعری کی ہے انکے فارسی کے چار مجموعے ہیں جنکا ذکر ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے "بلوچستان میں فارسی شاعری" میں کیا ہے۔ محمد حسن فارسی ادب کے شناور تھے اسلیئے اُنکے براہوئی کلام میں فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ مُلا محمد حسن اپنی ایک غزل میں اپنے محبوب سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں :۔

"او شام نا بروکا اُستے کنا وریس
احوال ءِ بندہ نا خور و پری کہ دیس

قاصد کہ نی کاسہ ہیتاتے نی چاسہ
خور و پری ائے پاسہ اسہ دم کہ نی بریس

ٹکاکءِ دانہ غاکو تیل و شانہ اکو
ہڑدے نا بہانہ آکو اسہ دم کہ نی بریس

آہو و مور و رنج اس دشمنیان رنج اس
محمد حسن کن گنج اس اسہ دم کہ نی بریس"(۲)

۱۔ بلوچ، محمد رمضان، ملک "گلدستہ قلات" صفحہ 6-5، پبلشرز مرکز تحقیقات فارسی، ایران، سن واشاعت نہ ندار۔
۲۔ براہوئی، عبدالرحمان، "قدیم براہوئی شعراء"، حصہ اول، پبلشرز ادارہ ادب بلوچستان کوئٹہ، 1968ء۔

ترجمہ :۔ اے شام کے قاصد جب تم پیغام لیکر میرے محبوب کی طرف روانہ ہوئے تو پیغام کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی لے گئے۔ ائے قاصد میرے اس غم اور کیفیت کو میرے محبوب سے بیان کرنا۔ میرا محبوب جو حور و پری سے زیادہ خوبصورت ہے۔ائے قاصد تم میرے محبوب کی طرف جارہے ہو۔وہ میرے حقیقت حال سے باخبر ہے۔ میرے محبوب سے یہ التجا کرنا کہ وہ ایک لمحے کیلئے میرے پاس آئے۔ ائے محبوب تمہارے چہرے پر مصنوعی خال اور بالوں میں تیل نے تمہارے چہرے کو اور خوبصورت بنادیاہے۔ تم ہر روز نہ آنے کی بہانے کرتے ہو۔ میں یہ التجا کرتا ہوں کہ ایک لمحے کیلئے میرے پاس آجاؤ۔ تمہاری غزال جیسی آنکھیں اور حور جیسی خوبصورت جسم اور مرغابی جیسی لمبی گردن کیساتھ اگر اپنے رقیبوں سے ناراض ہو لیکن محمد حسن کیلئے گنجینہ بے بہا ہو۔

جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا کہ مُلا محمد حسن کو براہوئی غزل گو شعراء میں اولیت حاصل ہے۔ اسی طرح براہوئی شاعری کے دوسرے اصناف میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مُلا محمد حسن کی شاعری براہوئی زبان وادب کیلئے عموماً اور براہوئی شاعری اور غزل کیلئے خصوصاً بے بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

عبدالحکیم

براہوئی غزل گو شعراء کی تاریخ میں مُلا محمد حسن ہنگلزئی کے بعد دوسرے غزل گو شاعر کی حیثیت پہلے مولانا عبدالجید چوتوئی کو حاصل تھی۔ لیکن نئی تحقیق کے بعد دوسرے نمبر پر مُلا عبدالحکیم آتے ہیں۔ اُن کے بارے میں تحقیق پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے کی ہے۔ گو کہ محققین نے براہوئی زبان وادب کی تحریری تاریخ کو ساتویں و آٹھویں صدی ہجری قرار دیا لیکن براہوئی غزل گو شعراء کی تاریخ انیسویں صدی عیسوی شمار کی جاتی ہے۔ جوں جوں تحقیق کے نئے در وا ہوتے ہی براہوئی زبان وادب کے بارے میں نئی نئی دریافت سامنے آتے جائینگے۔

براہوئی زبان میں غزل گوئی کا آغاز تو مُلا محمد حسن سے شروع ہوتی ہے لیکن اُنکے براہوئی غزلوں کا دیوان دستِ بردِ زمانہ سے نہ بچ سکا۔ البتہ مُلا عبدالحکیم کے غزلوں کے مجموعے "چارباغ" کو ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے حال ہی میں ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزارا ہے جو اس مقالے کی تکمیل سے پہلے چھپ کر منظر عام پر آئے گی۔

اس کتاب کی رو سے مُلا عبدالحکیم کے غزلوں کے دیوان "چارباغ" آج سے تقریباً 120 سال قبل تحریر ہوئی تھی۔ اس میں بھی مُلا عبدالحکیم کی پیدائش اور وفات کے بارے میں کوئی دستاویز شامل نہیں ہے جس سے مُلا عبدالحکیم کی سنِ ولادت یا تاریخ وفات کا تعین کیا جا سکے۔ مُلا عبدالحکیم کے غزلوں کا یہ مجموعہ بیک وقت چار زبانوں یعنی فارسی، عربی، پشتو اور براہوئی میں تحریر ہے۔ کتاب کے نام کا جو چارباغ کے نام سے موسوم ہے، وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالرزاق صابر تحریر کرتے ہیں کہ جو چار زبانوں میں غزل کہی گئے ہیں اسی وجہ سے کتاب کیلئے چارباغ کا نام رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کے غزلوں کی ترتیب سے پہلے عربی غزلیں، دوسرے نمبر پر فارسی غزلیں، تیسرے نمبر پر پشتو غزلیں اور آخر میں براہوئی غزلیں رکھی گئی ہیں۔

کتاب کے مصنف کا نام مُلا عبدالحکیم اور والد کا نام حکیم داد تحریر ہے۔ شاعر نے اپنا تعلق کو مشوانی قبیلے سے ظاہر کیا ہے۔ اور اپنے شہر یار بائی گاؤں "شرّوِد" ظاہر کی ہے جو آج کل پنجپائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

کتاب کے کل 145 صفحات ہیں۔ پہلے دو صفحات پر دیباچہ کے طرز پر کچھ تحریر کیا گیا ہے جسمیں مصنف نے اپنے خاندان، قبیلہ، شہر، گاؤں اور اپنے درس و تدریس کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ ویسے تو مصنف کا تعلق مشوانی قبیلے سے ہے جو ایک پشتون قبیلہ ہے لیکن اُسکے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے والدہ براہوئی بولنے والی بلوچ ہیں۔

"براہوئیک کہ کنا ماما مریہ

کہ مشوانی تے تینا اصل چانا"

یعنی براہوئی میرے ماموں ہیں لیکن میری پہچان اور قوم مشوانی ہے۔

کتاب میں چاروں زبانوں کیلئے الگ الگ رسم الخط استعمال ہوا ہے۔ یعنی عربی غزلوں کو عربی رسم الخط میں، فارسی غزلوں کو فارسی رسم الخط میں، پشتو کو پشتو رسم الخط اور براہوئی غزلوں کے لئے عربی اور پشتو رسم الخط کا امتزاج استعمال کیا گیا ہے۔

دیوان چارباغ کے اشعار کا اگر تاریخی تجزیہ کیا جائے کہ جن میں اُس زمانے کے حالات پیش کیئے گئے ہیں تو اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب 1870ء تا 1890ء کے درمیانی عرصے میں تحریر کی گئی ہوگی کیونکہ کتاب کے آخری حصوں میں سن 1300 ہجری اور 1316 ہجری تحریر کی گئی ہے۔ اس دور کے کابل کے امیر، امیر عبدالرحمان کے بارے میں ایک قصیدہ بھی شامل ہے۔

چارباغ دیوان میں براہوئی شاعری کے اشعار کی تعداد 284 ہے جن میں سے اکثر غزلیات ہیں۔ ہر غزل کے کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ تیرہ بند ہیں۔

مُلا عبدالحکیم نے ایک سو بیس سال قبل جس رنگ اور آہنگ میں غزل گوئی کی تھی۔ ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے:۔

"دنیا ٹی مخوب رُد تیان ہم ختوث دفائے

ہر کس کہ مخوب رُد ءِ کاریم تہ کُل جفائے

نئے اوفتے ٹی ختو جوانی و مہربانی

نئے اُست کنا مروئے دا مجلس آن پدائے

ہچکس تینا قطارٹ اودے حساب کپک

ٹی ہُر گنوکا اُستے بے عقل بے سمائے

ہر جاگہ غا کہ پھلس غاٹول نا مرے

ہندن کہ اونا داغے داغس اُستا کنائے

اونا کنا محبت تا زندہ آن مروئے

قیامت ئی حکیما کالخواہ ننا خدا ئے " (۱)

ملا حکیم کی براہوئی شاعری پر پشتوزبان کا اثر نمایاں ہے۔ جگہ جگہ ان کی شاعری میں پشتو الفاظ نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود محققین جب بھی براہوئی شاعری پر تحقیق کریں گے تو ملا عبدالحکیم کی شاعری کو وہ کسی بھی صورت میں نظرانداز نہیں کر سکیں گے۔

1- پروفیسر، صابر، عبدالرزاق، ڈاکٹر، اصل نسخہ مضمون "چارباغ" یہ مضمون براہوئی زبان میں جاری ہونے والے ہفت روزہ اخبار "ایلم" کے 97-1996ء کے شماروں میں چھپا۔

عبدالمجید چوتوئی 1867 تا 1938ء

عبدالمجید المعروف چوتوئی بلوچستان کے ریاست قلات کے تاریخی شہر مستونگ کے قریب چوتو گاؤں میں 1293 ہجری بمطابق 1869-1967ء کے قریب براہوئی زبان کے عظیم صوفی عالم و مفکر مولانا نبو جان کے ہاں پیدا ہوئے۔ اُنکا تعلق براہوئیوں کے قبیلہ قلندرانی کے طائفہ فقیرزئی کے مُلازئی شاخ سے ہے۔ مولانا نبو جان قلندرانی کے ہاں اولاد نرینہ میں تین بیٹے ہوئے۔اُن بیٹوں میں منجھلا بیٹا اپنے ولاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین، علم و ادب اور شاعری کے شمع کو روشن رکھا۔ چونکہ مولانا مجید چوتوئی ایک ممتاز عالمِ دین کے گھر میں پیدائے ہوئے لہذا اُن کے ابتدائی اور بنیادی تعلیم و تربیت کا بندوبست گھر پر ہی اُنکے والد حاجی نبو جان نے کیا۔ نبو جان نے اپنے بیٹے کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے کی اور بعد میں دوسرے فارسی کتب سے بھی استفادہ کروایا۔ اور اعلیٰ تعلیم کیلیئے والد نے انہیں اپنے دور کے مشہور مذہبی درس گاہ مکتبہ دُرخانی بھیجا۔ مکتبہ دُرخانی سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء میں مولانا عبدالمجید کا نام اُن چند علماء میں ہوتا ہے جو آگے چل کر بلوچستان کے مذہبی حلقوں میں خوب نام پیدا کیا۔ دُرخانی مدرسے میں مولانا عبدالمجید نے اپنے قابل اساتذہ کرام سے حدیث، فقہ اور تفسیر کے علوم حاصل کیئے۔ پھر اسکے ساتھ ساتھ اساتذہ کی صحبت سے جہاں انہوں نے دینی اور مذہبی تعلیم حاصل کی وہاں وہ شعر و شاعری کی طرف بھی راغب ہوئے۔ اور پھر اسی شوق نے اُسے درجہ کمال تک پہنچادیا۔

مولانا عبدالمجید نے کئی موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں اُن سب سے قطعِ نظر ہمارا موضوع صرف ان کی غزلیں ہیں۔ مولانا عبدالمجید چوتوئی کے براہوئی شاعری کے دو مجموعے "مفرح القلوب" اور "جوش حبیب" شائع ہوئے۔ مفرح القلوب براہوئی زبان کی غزلیات کا سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ اردو اور فارسی مجموعوں کے طرز پر حروفِ تہجی میں مرتب کی ہے جس میں نئی نئی ترکیبیں اور خیالات ہیں۔ آپ کا یہ کلام براہوئی ادب میں خاص مقام اور درجہ رکھتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1334 ہجری میں چھپی۔ اس کتاب کے کل 56 صفحات ہیں۔(۱) مفرح القلوب میں اشعار کی کل تعداد 580 ہے۔(۲)

کتاب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں نعت بھی شامل ہیں۔ کتاب کا اصل نام "مفرح

ا۔ براہوئی، عبدالرحمان، "قدیم براہوئی شعراء"، پبلشرز ادارہ ادب بلوچستان کوئٹہ، براہوئی اکیڈمی، اشاعت دوئم، پبلشرز ادارہ ادب، ہدہ کوئٹہ، سن اشاعت ندارد، صفحہ، 62۔

۲۔ براہوئی، عبدالرحمان، "براہوئی زبان و ادب کی مختصر تاریخ"، پبلشرز مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1980ء، صفحہ 98۔

القلوب فی نعتہ المحبوب المعروف بہ غزلیات" ہے۔ کتاب میں اکثر جابجا محبوب کے ثناء وصفت میں کہے گئے غزلوں کیساتھ ساتھ مولود شریف بھی شامل ہیں۔اشعار کے بند ایک دوسرے سے ہم ردیف و قافیہ ،زبان میں روانی، شیرینی اور عام فہمی ہے۔ کتاب کی ابتداء حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔(۱)

کتاب "جوش صیب " یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور انکے فراق میں دل کی گہرائیوں سے کہے گئے اشعار ہیں۔اس کتاب کی اشاعت 12 شوال 1357 ہجری بمطابق 1937 عیسوی سال میں ہوئی۔ گلزار یوسف کے خاتمے پر آپ نے جو غزل درج کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوئے۔(۲)

جوش صیب کے کل 120 صفحات ہیں۔اس مجموعے سے ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے:۔

بس کہ کباب ہے جناب ۔ اے ربابے صنم

اے ربابے صنم بس کہ کباب ہے جناب

ایتے شراب ءِ شراب ساقی ءِ دل و جان کنا

ساقی ءِ دل و جان کنا ایتے شراب ءِ شراب

تینے آ کش کر تتاب جور و جفا کپہ نی

جور و جفا کپہ نی تینے آ کش کہ تتاب

کپہ نی سردار حساب بیوس و بیچارہ تو

بیوس ءُ بیچارہ تو کپہ نی سعید حساب

ایتوہ نے انت جواب نورس خننا کنا

نورس خننا کنا ایتوہ نے انت جواب

خناٹ گل و گلاب اُستے ہشا یا جناب

اُستے ہشا یا جناب مونے خناٹ گل گلاب

ا۔ بیدار، عبدالقیوم، "عبدالمجید چوتوئی شخصیت وشاعری"، براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ، 1983ء، صفحہ 61۔

۲۔ براہوئی، عبدالرحمان، "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، پبلشرز مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1980ء، صفحہ 90۔

کنکن جوڑ مس غضب پاش کتہ وارث کنا

پاش کتہ وارث کنا کنکن جوڑ مس غضب

عبدالمجیدے جناب کپہ نی خوار و خراب

کپہ نی خوار و خراب عبدالمجید ے جناب" (۱)

ا۔چوتوئی، عبدالمجید، "جوش صیب"، پبلشرز عبدالباقی درخانی، 1357 ہجری، غزل صفحہ 24۔

مولانا محمد عمر دینپوری

مولانا محمد عمر 1882ء میں مستونگ میں پیدا ہوئے آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام بھیڑ بکریاں چرانے میں صرف کیئے۔ پندرہ سال کی عمر میں مولانا ذاہی کی شاگردی میں کلام پاک ختم کیا۔ مزید تعلیم کرنے کے لیئے مولانا عبدالغفور ہمایونی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تین سال کے عرصے میں کتب متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہوئے اس زمانے میں ڈھاڈر میں قائم مدرسہ درخانی مشہور تھا۔ آپ نے یہاں آکر مولانا محمد فاضل کے چچازاد بھائی اور شاگرد مولانا عبدالحیٔ کے کی شاگردی میں شامل ہوئے۔

محمد عمر دینپوری براہوئی زبان کے بہت بڑے شاعر اور کثیر التصانیف مصنف گزرے ہیں۔ آپ نے براہوئی میں اڑتالیس کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی سب سے زیادہ مقبول کتاب سودائے خام ہے۔ یہ کتاب غزلیات پر مشتمل ہے۔ کل صفحات 126 ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب 1915/1334 میں شائع ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن 1936/1355 میں شائع ہوا۔(ا)

مولانا محمد عمر دینپوری کا تعلق براہوئی قبیلے پندرانی سے ہے۔ بعد میں انہوں نے جیکب آباد سندھ کے قریب ایک نیا شہر بسایا۔ جس کا نام انہوں نے دین پور رکھا اور خود بھی پھر اس نام سے موسوم ہوئے۔ ان کی دوسری کتاب کا نام "مشتاقِ مدینہ" ہے اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ دینپوری صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے کل 40 صفحات ہیں جس میں 50 غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں کے علاوہ مولود شریف اور نعت بھی ہیں دوسرا حصہ مولانا عبدالکریم مینگل کی تحریر کردہ ہے۔ اس حصے میں 10 غزلیں مولود، نعت، مناجات وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا محمد عمر دینپوری نے 1948 میں وفات پائی۔

مولانا محمد عمر دینپوری کی ایک غزل پیش ہے۔

مس زی آن عمر تمامی غلط

گفت ئی شیطان نامسٹ فقط

خیال متودے سیآئے کنا

ھل ئی دِیتان گڑاس کیئر لقط

حرصِ ہواناپدٹ حلمہ کریٹ

ا۔ براہوئی عبدالرحمان ڈاکٹر "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ" صفحہ 102 مرکز اردو بورڈ لاہور 1980۔

ھلکٹ ای نفسا گفٹ ضبط

داسہ ھل ننگ خدائے کنا

گش جائے او گھستائے خط

مسٹ گمراہ دین آن مُرہناٹ

کیس گھٹن کنا میناصبط

انت بیان کیو تینا کردار تے ای

ہرچ گرک مسنٹ آکل غلط

داسہ محمد عمر عاصی کیک

دے دنن او ہردم آتوبہ فقط

قدیم براہوئی شعراء میں مولانا محمد عمر دینپوری کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ براہوئی ادب کے اس دور میں مولانا محمد عمر دینپوری جیسے اعلے پائے کے شاعر کے علاوہ ہمیں کوئی دوسرا نام نظر نہیں آتا۔

درمیانی دور کے براہوئی غزل گوشعراء (1947تا1980ء)

یہ دور براہوئی غزل کا درمیانی دور کہلاتا ہے۔ جو 1947ء سے لیکر 1980ء کے دورانیئے پر محیط ہے۔ اس دور کے چند نمایاں براہوئی غزل گوشعراء کی تفصیل یوں ہے :۔

مولانا عبدالحق لاکھوریانی

مولانا عبدالحق لاکھوریانی 1900ء میں پیدا ہوئے سندھ اور ہندوستان کے مختلف دینی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے علاقے لاکھوریان بلوچستان آئے۔1968ء میں لاکھوریانی میں وفات پائی۔ انکی ایک براہوئی غزل پیش ہے۔

"اریٹ ای بے بہاے کس اُست کہ پائنگ خدا چائنگ
ہر وقت گڑتی او غم تے نی عمر کائنگ خدا چائنگ

جدائی ہرا وختا کیسہ کنا ہوشے تین تو دیسہ
تولنگ تین توالپسیہ ہوش کنا کائنگ خدا چائنگ

دے کس اسہ جان تواسٹ ہرک داساجدامسٹ
نمادیدار کہ بسٹ اُست کناخوائنگ خدا چائنگ

الواوتم جسم کس ناپیدامس روح عاشق نا
ہے دے آن مست ے ناریٹ شائق خدا چائنگ

عبدالحق نی کرک قربان تینے محبوب نی محبت آن
سرے تینے ہموخوبان اگہ خوالک خدا چائنگ" (۱)

۱۔ جوہر، قیوم، براہوئی" براہوئی تخلیق کار" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1999ء صفحہ 57۔

مریضِ حجازی

مولانا محمد دین مریضِ حجازی 7نومبر 1913ء کو کٹھان گاؤں خضدار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر ملتان کے دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہوئے۔ براہوئی غزل گو شاعر ہیں۔ 28مارچ 1989ء کو فوت ہوئے۔ آپ کا ایک براہوئی غزل پیش ہے۔

" خبرئس کنے رسینگا دلبر کنا بروئے
فکر و غم آتے است آن اسہ دم ئی اودروئے

شہپ ئس دااست ناکہ ناسور مسونے
وصلان تینا او زیبا پٹی ملم کروئے

ویران خراب انگا است نا اُرائے
آباد جوڑ جانان دوئٹ تینا مروئے

کسر اتہ جوڑ کرے قبرے کنا کہ وختس
جِندا کنا ہو تو قبرا کنا بروئے

اِلے ہنک طبیب حاجت دوا نا افک
دامرض لاعلاجے انت فائدہ مروئے

اے ساہ تینا مریضے دارو دوا کرک نی
دارُو نُما مروئے مولانا شفا تروئے (۱)

۱۔ جوہر، قیوم، براہوئی "براہوئی تخلیق کار" براہوئی اکیڈمی 1999ء صفحہ 100۔

حکیم فیض محمد فیض

حکیم فیض محمد فیض 1920ء میں سندھ کے محمد پور اڈھو کے قریب گاؤں رسول بخش میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی اور مزید دینی تعلیم مولانا محمد عمر دینپوری اور دوسرے علماء سے حاصل کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثری مضامین بھی لکھتے رہے۔ 3 جون 1981ء کو سندھ میں انتقال کر گئے۔

ان کی ایک غزل پیش ہے۔

"ہر کنا حالے ہردکا سر بسر درنی سلام
بے نے آن چین اف وسیلہ سر بسر درنی سلام

نن مرے یادے مرے ناخننگ کن تغ ہنا
اف کروک گیرام گنوکا سر بسر درنی سلام

نی کریس صیاد شکارس بر ہرک حالے کنا
کردواوارو خنوکا سر بسر درنی سلام

نی طبیبُ اس نی حکیمُ اس نی اریس صاحب شفا
نی برک واسا کنے آ سر بسر ور نی سلام

دوست! ہیوس تو جتائی اف کنگ ہندن دوا
ہر کنا حالے ہردکا سر بسر در نی سلام

اُست کنا داڑے زہیرے ہیکہ پاڑث بیقرار
فیض نا حالے خنوکا سر بسر در نی سلام (ا)

ا۔ جوہر قیوم براہوئی "براہوئی تخلیق کار" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1999ء صفحہ 69۔

عبدالباقی دُرخانی

مولانا عبدالباقی درخانی 20 ربیع الثانی 1332 ہجری کوڈھاڈر کے قریب درخانی نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولانا عبداللہ درخانی سے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی آپ شاعری کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے نثری کُتب کے بھی مصنف ہیں آپ کچھ عرصہ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ آپ 27 مارچ 1985ء کو انتقال کر گئے آپ براہوئی کے غزل گو شاعر ہیں۔ایک غزل پیش ہے۔

مست زیباخن تے تونی مست مستانہ کریس
تیر خلکس نازنا بے ہوش دیوانہ کریس

بادشاہس زیب نانی اُس کنا محبوب جان
نی چراغس، عاشقے دا تینا پروانہ کریس

داعجب نا حسن ئی ای رمز حکمت ناخناٹ
ہر کنانی رنگ پچاتے فقیرانہ کیس

حسن والا تا چراغس درگہ ناناے اریٹ
صلح کرانتئے کنے بدحال ویرانہ کریس

نازتو بر لاڈتو بر خواہیوہ دیدارے نا
ہجر ئی تینا کنے نی قید مستانہ کریس

نی امیرس ای غریبٹ کر خطائے در گذر
درخانی نا حالتے ہیوس غریبانہ کریس (۱)

۱۔جوہر قیوم براہوئی "براہوئی تخلیق کار" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1999ء صفحہ 69۔

سید کامل القادری 1932 تا 1982ء

سید کامل القادری 5 جولائی 1932ء کو اجمیر شریف بھارت میں پیدا ہوئے تقسیم ہند کے زمانے میں آپ کا خاندان بھارت سے ہجرت کر کے کراچی میں آبسا۔ اُس زمانے میں کامل القادری اردو کے شاعر اور ادیب تھے۔ اس کے بعد آپ بلوچستان میں آکر آباد ہوئے۔ 1958ء سے 1960ء تک میر گڑہ میں مقیم رہنے کی وجہ سے براہوئی زبان پر کافی عبور حاصل کیا۔ آپ نے بلوچستان میں رہتے ہوئے یہاں کے لوگوں کی ادبی خدمت کی آپ کے تصانیف میں براہوئی انشائیے براہوئی کہاوتیں۔ مہمات بلوچستان نا جلد اول اور دوئم لائف ہسٹری آف اے براہوئی کا انگریزوں سے اردو میں ترجمہ شامل ہیں اس کے علاوہ آپ ایک غزل گو شاعر بھی تھے۔

آپ 3 جولائی 1982ء کو کراچی میں فوت ہوئے۔ اُن کی ایک براہوئی غزل پیش ہے۔

زمانہ کنارے خلک است ٹی
کروکا محبت ہلک است ٹی

تینا اینو ہستیں ہنیو کریس
کہ گل پھل نا موسم ہتیک است ٹی

محبت کروس تو محبت خنوس
عجب ہیت پیدا مریک است ٹی

ہُرے آن اسہ ایلوئے چانہ نن
وفائی نا کسرس سلیک است ٹی

مریوہ ای لفظاتا اثران کامل
ہرا ئم کہ وردس سلیک است ٹی (۱)

۱۔ براہوئی، عبدالرحمن، "قدیم براہوئی شعراء"، حصہ اول، پبلشر زادارہ ادب بلوچستان، کوئٹہ، 1968ء۔

فیض محمد فیضل 1301 تا 1377 ہجری

فیض محمد فیضل لاشاری 1301 ہجری میں گاجان (بلوچستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جامع مسجد گاجان میں حاصل کی فیضل براہوئی کے علاوہ فارسی بلوچی اور سندھی میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ فیض 13 ربیع الاول 1377 ہجری بمطابق 7 نومبر 1957ء کو فوت ہوئے۔ آپ صوفی شاعر تھے۔ آپ بلوچستان کے ایک برگزیدہ شخصیت سید پیر رکھل شاہ سے بے حد متاثر تھے۔

اُن کے براہوئی غزلوں میں سے ایک غزل پیش ہے۔

داڑے الپسہ نی دادے
درنی تین تو یار ہندادے

سوانے آن ای انت کیوہ
ہتو جتائی خاخر نادے

ہتہ ہیکی مُرنی نئے آن
نن تو مرک اے یارنی نن دے

بہ خواجہ است جہ نائے
ہرسہ نی پین جاگہ ارادے

مرے خوش دا فیضل اراڑے
نے تو دا خانہ آبادے" (ا)

ا۔ جوہر قیوم "براہوئی تخلیق کار" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1999ء، صفحہ 51۔

مولانا نور احمد

"مولوی نور احمد مرحوم براہوئیوں کے ایک ممتاز قبیلے محمد شہی کے میوازئی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنکے والد رسالدار میر فیروز خان نہایت ہی دیندار اور خدا ترس انسان تھے۔ اسی طرح انکی والدہ محترمہ بھی ایک نیک سیرت، پاک دامن اور دیندار خاتون تھیں۔ مولوی نور احمد نے چودہ سال کی عمر تک قرآن مجید کے علاوہ گلستان، بوستان، کنز قدوری کی تعلیم گاؤں کے قریبی درسگاہ میں حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے مندے حاجی منگچر کے اسکول میں داخلہ لیا۔ پرائمری تک اسی اسکول میں رہے۔ جماعت ششم میں داخلہ لینے کے لئے انہیں مستونگ کے احمد یار خان ہائی سکول میں جانا پڑا۔ 1942ء میں جب وہ صرف جماعت ہفتم کے طالبعلم تھے اس دوران انکے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد انکے گھر والوں کو سنبھالا دینے والا کوئی اور بڑا نہ تھا لہٰذا وہ اپنی تعلیم کو آگے جاری نہ رکھ سکے۔ مجبوراً انہیں گھر واپس جانا پڑا اور گھر کی تمام ذمہ داریاں نبھانی پڑیں۔ والد کے انتقال کے بعد نور احمد مرحوم کا تقریباً پانچ چھ سال تک تعلیم سے تعلق منقطع رہا۔ لیکن بعد میں وہ دوبارہ مذہبی تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ اور تقریباً 13 سال تک دوبارہ دینی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس عرصے میں انہوں نے صرف، نحو، حدیث اور قرآن مجید کو روانی سے پڑھنے پر عبور حاصل کی۔ وہ براہوئی کے علاوہ عربی اور فارسی بھی روانی سے بولتے تھے۔ مرحوم کو اپنی تمام زندگی میں پر آشوب دن دیکھنے پڑے۔ والد کی وفات کے بعد انکے جوانسال بھائی کریم انہیں داغ جدائی دے گئے۔ اس حادثے نے نور احمد کی زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور پھر اس حادثے نے اُسے شاعر کے رُوپ میں زمانے کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ بھی دوران تحقیق معلوم ہوا کہ انکے کئی پُر درد اشعار گم ہو گئے۔

مولوی نور احمد مرحوم کو براہوئی شاعری میں منفرد مقام حاصل ہے۔ مولوی صاحب نے شاعری کے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے زیادہ تر غزل کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن انکے تحریر کردہ حمد اور نعت بھی کافی پر تاثیر ہیں۔ مولوی نور احمد نے اپنا تخلص "احمد" رکھا۔ 15 اگست 1977ء بمطابق 19 ماہ رمضان 1397 ہجری کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ (۱)

پروفیسر خداداد گل نے مولوی نور احمد کے کلام پر تحقیق کر کے 1978ء میں انہیں منظر عام پر لایا۔ کتاب کے کل 24 صفحات ہیں۔ کتاب میں پروفیسر خداداد گل اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی کے تاثرات کے بعد مولانا کے حالاتِ زندگی

۱۔ گل، خداداد، پروفیسر، "کلام نور"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1978ء، صفحہ 8,9۔

کو قلمبند کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک نظم شرک اور بدعت کی مذمت میں کہی گئی ہے۔ اس کے بعد حمد باری تعالیٰ اور دو نعت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کہے گئے ہیں۔ اور پھر نو غزلیں تحریر کی گئی ہیں۔ مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نور احمد نے جتنی بھی شاعری کی ہے وہ سب ہجر، فراق، سوز و غم، وصل اور جدائی کو موضوع بنا کر غزلوں کی اسلوب میں کہی ہیں۔ انکے جس کلام کو کلامِ نور کے نام سے مرتب کیا گیا ہے ان نو غزلوں میں بھی انہی عنوانات کو اپنایا گیا ہے۔ انکی ایک غزل کو بطور نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

اینو نظر بریک ویران دا گلی نا
شاید اِنانے داکان زیبا انگا پری نا
اے دوستاک اِنانے بلبل کنا کہ باغ آن
او زیب اسکہ جان ہر پھُل ءِ ہر گلی نا
دا جہہ تا بلبل آتن اِچ تب بفک کنے چا
اِچ اُست کنا کہ خواپک مون کپرہ جہہ غا نا
نا زیب لوڈ تُن دافتا بفک اسٹ نا
بے زیب ہیدس نے آن دا کہ فنا جہہ ءِ نا
نور احمد انت کروس نی تقدیر تن قومی آ
تدبیر اِچ بفک چا تقدیر تن خدا نا" (۱)

۱۔ گل، خداداد، پروفیسر، "کلام نور"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1978ء، صفحہ 19۔

عبدالحق بابا 1911 تا 1983ء

عبدالحق بابا ممتاز عالم دین حاجی عبدالغفور شاہوانی کے ہاں 1911ء میں کلی حسنی دشت میں پیدا ہوئے۔ والد نے ان کا نام بہادر خان رکھا۔ انکے والد بزرگوار حاجی عبدالغفور ایک نیک سیرت، راست باز اور درویش صفت انسان تھے۔ غربت نے انہیں ملازمت کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ریلوے میں بحیثیت جمعدار بھی فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے گھوڑوں کا کاروبار شروع کیا۔ وہ دکن، حیدر آباد، بھارت اور افغانستان آتے جاتے رہتے تھے اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی خرید و فروخت کرتے رہے۔ حاجی عبدالغفور خدا ترس، دین دوست اور انسان پرور شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے پیدل چل کر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اور پھر 16 اگست 1983ء میں انتقال کر گئے۔ بابا عبدالحق کے بڑے بھائی میاں خان ایک وطن دوست سیاست دان گزرے ہیں۔ وہ مادر وطن کی آزادی کے لئے جرمنی سے شائع ہونے والے پروپیگنڈہ لٹریچر کو پورے ملک میں پھیلاتے رہتے تھے۔

بہادر خان نے حاجی عبدالغفور جیسے ایک باعمل والد اور وطن دوست جیالے بھائی کے زیر سایہ اپنی ابتدائی تعلیم شروع کی۔ وہ سندھ اور بلوچستان کے کئی مدرسوں میں زیر تعلیم رہے۔ مدرسہ دارالعلوم کھوسہ (کچھی) کے مہتمم نے بہادر خان کا نام تبدیل کر کے عبدالحق رکھا اور پھر زندگی کے آخری ایام تک بہادر خان اپنے استادِ محترم کے تجویز کردہ نام سے منسوب و ممتاز رہے۔ پھر عبدالحق بابا مدرسہ دُرخانی کے علماء مولانا محمد فاضل دُرخانی اور عبداللہ جان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ انہوں نے بلوچستان کے مختلف مدارس سے مختلف علوم، حدیث، تفسیر، قرآن، فقہ اور دیگر علوم حاصل کی۔

عبدالحق بابا کوئٹہ لیویز میں کافی عرصے تک ملازم رہے۔ اور پھر 1945ء میں اپنے گاؤں کی مسجد کی امامت شروع کی۔ اور اس مسجد کے مدرسے کے طلباء کو درس و تدریس بھی دیتے رہے۔ سینکڑوں طلباء جو سندھ و بلوچستان کے دور دراز علاقوں کا سفر طے کر کے آتے تھے اس مدرسے میں علم کی روشنی سے منور ہو کر واپس ہوتے تھے۔ 1936ء میں انکی شادی انکے ماموں زاد سے ہوئی۔ عبدالحق بابا بلوچی اور براہوئی کے نامور شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنا تخلص بابا رکھا۔ بابا نے عربی، فارسی، بلوچی اور براہوئی زبان میں شاعری کی۔ براہوئی شاعری میں بابا کی شاعری زیادہ تر عشق رسول، اسلام دوستی اور وطن دوستی پر مبنی ہے۔ انکے علاوہ انہوں نے دوسرے رنگوں میں بھی اشعار کہے ہیں۔ اشیر عبدالقادر شاہوانی نے تحقیق کر کے بابا کے کلام کو 1992ء میں دریافت کیا اور اسے براہوئی اکیڈمی کے تعاون سے چھپوا کر محفوظ کر لیا۔ انہوں نے بابا کی شاعری کو ”کسر ناچاری“

کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔اس شعری مجموعے میں شاعری کے دوسرے اصناف کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد انکی غزلوں کی ہے۔ عبدالحق آبلا کو زندگی میں درد آشوب کے بھرپور دن دیکھنے پڑے۔14 اگست 1948ء کو آبلا ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہوئے۔(۱)

انکی ایک غزل پیش ہے :

عشق ئی نا چک سلوکٹ مخیوہ ہم ہوغیوہ
تپرہ آرامے نودان بار خڑینک ای شولیوہ

ہر تہو آن بار ای چنڈی ہلیوہ دانگ و اینگ
اُف کنے آرام درخت آن بار کاٹمے خسیوہ

ای سہیل نا پھُل قادڑ باریسٹ دیدن کے نا
وہتم نا گوش تون دیدن کے نا ای مخیوہ

نا سدخہ سال اسٹے زندہ و مرکے ای خناٹ
باریفیس ہوغاٹ ای خرن کریس وا مخیوہ

مخیفیس یا ہوغیفیس ای نا گلیان بسونٹ
آبلا پارے یار عجب کیک ہوغیفک ای مخیوہ(۲)

۱۔ شاہوانی، عبدالقادر، اشیر، ''کسر ناچاری''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 22-13۔

۲۔ شاہوانی، عبدالقادر، اشیر، ''کسر ناچاری''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 47۔

عبدالکریم تراب 1913 تا 1994ء

عبدالکریم تراب 15 جنوری 1913ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی اور پرائمری تعلیم گوٹھ قلی میں حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں انسپکٹر مقرر ہوئے۔ آپ نے براہوئی زبان میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ 1994ء میں کراچی میں وفات پائی۔ غزل گو شاعر تھے۔ انکا ایک غزل پیش ہے:۔

"کنا عرضے مقبول کہ ذوالجلال
براہوئی تہ نی ایتہ عزت و کمال

صدی تیان مظلوم مفلس علیل
امر اوفتے تس دا زمانہ زوال

تیناک پینا اوفتے نسار خوڑت کریر
جہل بے کسی ٹی مسر پائمال

پھڑینکان بجر بر ٹی نی بجر کسپہ
بجر رحم آن نا ہر ترقی محال

نوازے براہوئی تہ نی ہر وڑث
علم ایتہ دین او ترقی تو مال

حکومت ہدایت قرب اتحاد
تو اسلام آمہنا نا بار و مثال

موحد و عاشق نبی نا مرین
کفر شرک بدعت مف نن ٹی شال

ہرے بیرہ نا کنی امر نا ارے
تراب نا دا عرضے کہ یا رب محال" (۱)

ا۔ جوہر، قیوم، براہوئی، "براہوئی تخلیق کار"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 118۔

نور محمد پروانہ

نور محمد پرواؔنہ ولد مہر ول پندرانی 15 فروری 1918ء کو تحصیل اوستہ محمد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی۔ پرائمری تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول سبی سے حاصل کی۔ براہوئی کے ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ 1960ء میں مستونگ سے ہفت روزہ "ایلم" جاری کیا۔ آپ نے 45 سال تک براہوئی زبان وادب کی خدمت کی۔ 13 دسمبر 1995ء کو کوئٹہ میں انکا انتقال ہوا۔ آپ کی ایک براہوئی غزل پیش ہے :۔

"مرک مونا مستی او ایلم ہنینا
برنگ نا مبارک برنگ نا گچینا

اسہ جہہ اواری ارے خیر و برکت
مرنگ کڑدہ کڑدہ چاگم کیک پنے نا

اواری ہزاری ہزاران زیاتے
خنک ہرکس لوڑان وے تے پدینا

توار کیوہ تولوک سلوکاتے کلے
ہو دانگ دودینگٹ کہ مچی مرے نا

براہوئی بہ ایلم گڑاس تے کرک نی
دہن لد تا تولنگ ایک خوش کنے نا

ہُرک دانگ اینگ کہ دنیا ارانگی
دنیا آن پدائی مر پہہ باز بدے نا

پائک دا پندرانی دا پروانہ نُم تو
نُما شوقے مشوتے خدا کے ہڑدے نا" (۱)

۱۔ جوہر، قیوم، براہوئی، "براہوئی تخلیق کار"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 124۔

پیر محمد زبیر انی 1927 تا 1998ء

پیر محمد زبیر انی ولد لال محمد لہڑی 1927ء میں دشت میں پیدا ہوئے۔ابتدائی دینی تعلیم کے بعد عربی اور فارسی علوم سے بھی استفادہ کیا۔ پیرل زبیر انی براہوئی اور بلوچی زبانوں کے کہنہ مشق شاعر وادیب ہیں۔انکی شائع شدہ کتابوں میں "کلام اقبال" کا براہوئی شعری ترجمہ گل دستہ غوثیہ ،"کریما سعدی"بلوچی ترجمہ شامل ہیں۔۔ پیر محمد زبیر انی نے کافی عرصے تک ماہنامہ"اولس"بلوچی کے پروف ریڈر کے فرائض سرانجام دیئے۔پیر محمد زبیر انی براہوئی کے صوفی اور عارفانہ کلام کے شاعر ہیں۔انکی شعروں کا مجموعہ "تجلی" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ نے 1996ء میں شائع کی۔انکی غزلوں میں اسلامی رنگ نمایاں ہے۔"تجلی" مجموعہ شاعری سے ایک غزل پیش ہے :

"سلوکٹ ہروکٹ ای نا پارغا
نوا کہ نی ہُرس کنا پارغا
ہرانگی کہ نی کاسہ نیتون اُٹ ای
کنا خنک تورو کو نا پارغا
کنا اسٹ ملنگسال نیتون ارے
کنا ہوش پاے کہ نا پارغا
کنے لیتہِ نی پنڈ پنڈوکٹ ای
کنا خنک تورو کو نا پارغا
کنے پاء کہ اِلو اُمر نادرے
اُمر کاؤ چین کس نا پارغا
ارے نا وڑٹ نئے دھنو زیبلس
اُمر پا کہ ہُبر کہ نا پارغا
کنا خنک ءُ چاری کسر ناذ نا
بریسہ ہراتم کنا پارغا

ارے دیمہ پیرل فقیرس ارے

ہرک کہ پنڈ کنی درکہ تا پارغا"(۱)

ا۔زیرانی، پیر محمد، "تجلی"، پبلشر براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 170۔

احسن خارانی 1941 تا 1983ء

عبدالغفور احسن ولد مولانا شیر محمد ہجوانی بلوچ 1941ء میں یوسف وال بڈو خاران میں پیدا ہوئے۔ 1950ء میں انکے والد نے خاران چھوڑ کر شہداد کوٹ میں آکر سکونت اختیار کی۔ احسن نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اسکے بعد اعلیٰ دینی تعلیم خیر المدارس ملتان سے حاصل کی۔ 1962ء میں شاعری شروع کی۔ اُنکا براہوئی اور بلوچی میں غزلوں کا مجموعے چھپ چکے ہیں۔ 4 فروری 1983ء کے دن بروز جمعہ نماز پڑھنے کے بعد خود کشی کر لی۔ اُنکا ایک براہوئی غزل پیش ہے:۔

" امر ای کیوہ کہ تیناوفا نا ہیت آتے
تینا وفا نا ہِتاتے او بے وفا نا ہِتاتے
کنا قصورے یا لونا نُم پاہو
نمائے ہیت فیصلہ نا ہِتاتے
مریضِ عشق نا مطلب ارے کہ دیدار
طبیب کیسہ امر نی دوا نا ہِتاتے
اُرہٹ اونا خریدار ای بہر صورت
کرورے اُخس اونا بیان ہِتاتے
ئی حق "احسن" ہر نا خدا نا مونا ہِنِ
بغیر خوف کہ ثامت خُدا نا ہِتاتے " (۱)

۱۔ جوہر، قیوم، براہوئی، "براہوئی تخلیق کار"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 79۔

میر عبدالرحمٰن کُرد

میر عبدالرحمٰن کُرد اگست 1928ء کو دشت جلوگندان میں پیدا ہوئے۔ کلام اللہ اور دینی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ پرائمری تعلیم گورنمنٹ اسکول کولپور سے حاصل کی۔ 1947ء میں اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ سے میٹرک کے امتحان میں شامل ہوئے۔ (۱)

میر عبدالرحمٰن کُرد براہوئی کے کہنہ مشق شاعر اور محقق ہیں۔ آپ کا کلام ماہنامہ بلوچی، کراچی، ایلم، مستونگ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں اردو میں ایک جامعہ کتاب "ہمارا کاروان" تحریر کر چکے ہیں۔ (۲)

میر عبدالرحمان کرد کا شعری مجموعہ "شف گروک" 1996ء میں براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کے تعاون سے شائع ہوئی۔ انکی ایک غزل پیش ہے:

"دڑد و رنجاتے کنا دوست نی درمان کپہ
اے صنم ٹھپیا دا اُست کہ ارمان کپہ

عشق نی ہیل کرین جان تخنگ نا رسے
قصہ تینا جفا نا ہیکہ قربان کپہ

اینو گڈیکو دے عشقنا شیدائی نا
مرگ نا ساعتا نی زندنا سامان کپہ

اِستو پروانہ عجب سوزنا ہیت نی پارے
دوست نا دیر کہ پرہیز ہشنگان کپہ

پھُل ءِ سے گواڑخ ءِ بینا کہ شم تا رنگے
اے صنم زیب تو نی گواڑخے بے شان کپہ" (۳)

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، ساراوان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 129

۲۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، 1982ء، صفحہ 152

۳۔ کُرد، عبدالرحمٰن، "شف گروک"، پبلشر براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 89, 90۔

نادر قمبرانی

پروفیسر نادر قمبرانی 24 مارچ 1938ء کو سریاب کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم کے بعد میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ غربت کی وجہ سے تعلیم باقاعدگی سے جاری نہ رکھ سکے۔ لیکن مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایف اے اور 1958ء میں بی اے پاس کیا۔ لیکن اس سے پہلے منشی فاضل فارسی کے امتحان میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ 1976ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان اور 1988ء میں ایم اے براہوئی پاس کیا۔ اسکے بعد بلوچستان یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈیز سنٹر کے شعبے میں براہوئی شعبے کے چیئرمین بنے۔ کچھ عرصے تک فارسی شعبے کے رئیس اور پاکستان اسٹڈیز سنٹر کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ کم سنی سے ہی مزاج میں شاعرانہ صلاحیت تھی۔ جس میں ترتیب کی کمی تھی لیکن 1950ء سے انکی شاعری میں خاصی ترتیب آئی اور وہ براہوئی کے ممتاز اور منفرد قومی اور لازوال شاعر کے طور پر اُبھرے۔ انکی غزلوں کا مجموعہ "شنزہ گروک" 1992ء میں چھپ گیا ہے۔ نادر قمبرانی براہوئی اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری، انجمن فارسی کے صدر نشین بھی رہ چکے ہیں۔(۱)

انکی ایک غزل پیش ہے:

"نے آن بسے اُستے قرار اینو افک
کنا زندگی ئی بہار اینو افک

اُمر منّے دیوان اخس پودینے
دا مجلس نا زیبا خُمار اینو افک

تینا ڈکھ و رنجاتے کین دیر تو تالان
او غم خوار آ سنگت او یار اینو افک

نہ سازے سرونزے نہ چنگے ربابے
غزل سر کروکا توار اینو افک

دا گوڈی نا دود اَک بدل اُخہ مُر
جفا بے وفائی میار اینو افک" (۲)

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، ساراوان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 128۔
۲۔ قمبرانی، نادر، پروفیسر، "شنزہ گروک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 138۔

محمد اسحاق سوز

اصل نام محمد اسحاق اور تخلص سوزؔ ہے۔ والد کا نام مولوی عطا محمد ہے۔ 1948ء میں ضلع مستونگ میں شیخ واصل میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک شہداد کوٹ میں سندھی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد عربی اور فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ آپ براہوئی غزلوں میں جدّت کے علمبردار ہیں۔ اس لئے آپ کو ادب دوستوں نے "غالب براہوئی" کے خطاب سے نوازا۔ آپ کے غزلوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بالترتیب غزلیات سوز، گلشنِ سوز اور جذباتِ سوز ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "گروشک" 1995ء میں منظر عام پر آیا۔ "گروشک" سے ایک غزل پیش ہے :۔

"یات اینو ہم ارے مہر و وفا نا صبح و شام
نا ہمو جنگ دُزی ئٹ مدانا صبح و شام
بال تِسّہ کپوتاتے کنا نی شوق نا
بال نا تا اُس ندارہ نا گدانا صبحِ و شام
نا گلاٹی آ ہمو ہچّاتا جادُو نا غزل
بلبلاتا ہم ارے اینو زبانا صبح و شام
اے ہتم نا وخت نا یاتاک اُستے کیرہ ٹھپ
گواڑخاتے تِسّہ چِٹ نا گدانا صبح و شام
سیل کی دیدار نا دا سوزؔ اومیتس تمک
وخت وخت مونا بریک اونا ادا نا صبح و شام (۱)

ا۔ سوز، اسحاق، "گروشک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 105۔

یٰسین بسمل

یٰسین بسمل ولد فیض محمد (فقیر) 1940ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ اُنکا تعلق بلوچوں کے طائفے رَنگی زئی سے ہے۔ پرائمری تک تعلیم خالصہ اسکول گوردت سنگھ روڈ سے حاصل کی۔ چھ سال کی عمر میں قرآن مجید پڑھنا سیکھا۔ انکے والد فیض محمد فقیر تخلص کے ساتھ براہوئی، بلوچی اور سندھی میں شاعری کیا کرتے تھے۔(۱)

یٰسین بسمل کے والدین اور ان کے کئی اور قریبی رشتہ داروں کے اموات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ جس کا اثر بسمؔل کے مزاج پر پڑا۔ یکےبعد دیگرے رشتہ داروں کے اموات اور جدائی نے بسمؔل کے کلام میں درد، رنج والم اور غم کی کیفیتیں طاری کر دیں۔ انہی کیفیات نے انکے کلام کو پُر تاثیر اور سحر انگیز بنادیا ہے۔ بسمؔل نے اپنی شناخت بحیثیت غزل گو شاعر کروائی ہے۔ وہ بچپن سے اپنی والد کی قریب سے شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ براہوئی شاعری کے حوالے سے انکا شعری مجموعہ ''گیادان ناپھُل'' اور ''سنبل'' بالترتیب 1994ء اور 1997ء میں براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کے تعاون سے شائع ہوئے ہیں۔

''گیادان ناپھُل'' سے ایک غزل پیش ہے۔

''اے عشق نا گلی ٹی مگانہ اُٹ ای اینو
کل پارہ ای گنوکٹ دیوانہ اُٹ ای اینو

اے دیک کنے یاد ءُ محنگ ءُ یا گل تا
ای قصہ غاتے بٹٹ افسانہ اُٹ ای اینو

ہر فکر کنا اُستان گیرام ائر اے تم
درداک کنا مُر غم خانہ اُٹ ای اینو

دوستاک کنے اِلانو دشمنک اَمہ نخس
لگا اسہ چراغس پروانہ اُٹ ای اینو

اے دیک ہرانگ ہنانو! محبوب ہرانگ ہمے
بسمؔل تو اَسُٹ مالو۔ مستانہ اُٹ ای اینو'' (۲)

۔ مینگل، عزیز، تبصرہ ''سنبل''، شعری مجموعہ یٰسین بسمل، 1997ء، صفحہ 7۔

۔ بسمل، یٰسین، ''گیادان ناپھُل''، پبلشرز براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 58۔

عبدالقیوم جوہر براہوئی

عبدالقیوم جوہر براہوئی ولد قاضی عبدالکریم ذبیح ساسولی 29 جنوری 1950ء میں پنو عاقل ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ لیکن ذبیح مرحوم 25 جمادی الثانی 1378 ہجری مطابق 16 جنوری 1958ء کو وفات پاگئے اسطرح جوہر یتیم ہوگئے۔ قاضی عبدالکریم ذبیح اپنے وقت کے جید عالم، مفکر اور ادیب تھے۔ آپکے مضامین ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند، ماہنامہ ''القرآن'' لکھنؤ، ماہنامہ ''مقامِ رسالت'' کراچی ، ماہنامہ ''الصدیق'' ملتان، سہ روزہ ''بجنُور'' میں اردو زبان میں چھپتے تھے۔

مذہبی علوم کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے آبائی گاؤں فرید آباد میں اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ عربیہ محمدیہ میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دینے شروع کیے۔ سندھی، براہوئی شاعری، مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ سہ ماہی ''سنگت'' کے مدیر بھی ہیں۔ براہوئی شاعری میں ''احوالِ غم''، ''دردانہ'' اور براہوئی نثر میں ''گور یچ'' اپتک چھپ گئے ہیں۔ جوہر براہوئی پبلیکیشن، بزم شاہ گودڑیہ ہسٹاریکل سوسائٹی سب ڈویژن میھڑ کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر کام کرتے رہے ہیں۔ جوہر براہوئی زبان کے بہترین انشائیہ نگار، افسانہ نگار بھی ہیں۔ شاعری میں قطعہ، رباعی اور ہائیکو بھی تحریر کیے ہیں(۱)

جوہر براہوئی دور جدید کے بہترین غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں اسلامی رنگ، تصوف اور سماجی اقدار کی پامالی کے عنوانات ان کا موضوع ہیں۔ اُن کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں :

عجب شوخ طبس صنم اللہ اللہ
ہیفوہ زہب نا ای قسم اللہ اللہ

صنم ذیب تو ناز لا کتے
کہ تؤبے ءِ تِس شرم اللہ اللہ

ہراتم کہ تینا نقابِ ملیسہ
تنارمہ ننے لس جَم اللہ اللہ

او لیلٰی ہراتم جتا مَسَس نی

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، ''براہوئی زبان وادب''، ساراوان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 141 ,140۔

کہ جوڑاتیا ٹس کہ دم اللہ اللہ
نی ٹسُس کہ ہراتم کنا شہرٹی
تو ٹس نے تو دلبر ہتم اللہ اللہ
برک دُولٹی مرنی کنتو صنم
لکھاتیا نے اف حسن کم اللہ اللہ
ننے غم نی تِسُس شکر نا مرے
خوشی ءِ نما منک غم اللہ اللہ
کرک جوہرے تینا دُو اُٹ کفن
کہنگان پد دا کرم اللہ اللہ (۱)

ا۔جوہر، قیوم، براہوئی، "براہوئی تخلیق کار"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 124۔

امیر الملک مینگل

امیر الملک براہوئی زبان کے ایک نمائندہ شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔اس وقت تک ان کی دو شعری مجموعہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ہیں جو بالترتیب "جورنا پُل" اور "چِلہ نا ٹوبے" کے نام سے منظرِ عام پر آئے ہیں۔

انکی غزلوں کی کتاب "جورنا پُھل" سے ایک غزل بنام جورنا پُل پیش ہے:۔

" دا کسر مُرغنے مُر نا منزلے
ہر اسٹ دم ورے۔ ہر کس اس کاہلے

مچُ وے بوز اِنا۔ مچے جانے ہُشا
ہر کہ زُلپاتا بیتاتا رندٹ ٹلے

نن خلیئن ہزار پلمہ جوڑ کین
نن لغوری آن ہر ہٹے پان منزلے

وے کہ نیمورچ مرے ترّ بیتاک بریر
زورنا مون ءِ زاری ہم لا حاصلے

دُروہ کرے اوڑتن کپیس چ دوستی
چاءِ مون اونا ٹوبے آن بار بلہلے

بازماروں ورنائی نا دیتے نن
باز اُستے ہتون پُل نا مچلے

جورنا پُل آن بار۔ باز زیبا ارے
خوک مَسَس تو چاس مرنا قاتلے

اُستنا لارے شعراتے اُٹ شیف شاذ
پارہ پاداک امیؔر باز پھُ ءِ قابلے " (۱)

۱۔ مینگل، امیر الملک، جسٹس، "جورنا پُل"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1992ء، صفحہ 130 ,129۔

عزیز راہی

عزیز راہی 13 ستمبر 1940ء کو خضدار میں پیدا ہوئے۔ انکے والد نظر محمد ایک نیک سیرت انسان تھے۔ عزیز راہی نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے ماموں مولانا دین محمد مریض کے مدرسے میں حاصل کی۔ جہاں انہوں نے قرآن مجید ختم کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی کے پنج کتاب، گلستان و بوستانِ سعدی جیسے کتب سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ 1960ء میں خضدار ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور انٹر کالج کوئٹہ میں داخلہ لیا۔ لیکن والد کی معذوری کو دیکھ کر انہیں واپس اپنے گاؤں خضدار جانا پڑا۔ اکتوبر 1961ء میں جے وی ٹیچر تعینات ہوئے۔ لیکن پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم کو آگے جاری رکھا۔ 1963ء میں ایف اے، 1965ء میں بی اے اور 1968ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا۔ اسطرح ترقی کرتے کرتے 1974ء میں ہیڈ ماسٹر اور 1988ء سے ضلعی تعلیم آفیسر D.E.O. مقرر ہوئے اور تاحال اسی عہدے پر کام کر رہے ہیں۔

عزیز راہی کی شاعری کا آغاز 1966ء سے ہوا۔ اس زمانے میں انہوں نے براہوئی غزل کے ساتھ ساتھ منظوم خطوط بھی لکھے۔ اسکے علاوہ وہ براہوئی کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے مختلف اصناف پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ لیکن انہیں جلد احساس ہوا کہ اردو کو میری شاعری کی خاص ضرورت نہیں ہے جتنی ضرورت براہوئی کو ہے۔ عزیز راہی کے شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مجموعے میں حمد، نعت، منقبت، قومی نظم، دینی نظم شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ دینی و قومی کیفیات کے ساتھ ساتھ غزل، رباعی، مثنوی، قطع اور مسدس پر مشتمل ہے جبکہ تیسرا مجموعہ "دیوان راہی" ہے۔ "دیوان راہی" عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ لیکن ان میں جگہ جگہ اصلاحی اشعار بھی درج ہیں۔(۱)

"دیوان راہی" 1995ء میں چھپا۔ عزیز راہی کے غزلوں کے دیوان راہی سے ایک غزل پیش ہے:

"عاشقاتا انت سیخہ کیسہ ذُن اُستے کباب
خواہنہ دیدار لیکن شاغسہ مونا نقاب
اُست خواہس نیتو دلبر نن محبت ئس کرین
تتون نن ذُن مروئے زندگی مُچا عذاب

ا۔ راہی، عزیز، "دیوان راہی"، پبلشر خود، کوئٹہ۔، 1995ء، صفحہ 24 ,23 ,22۔

ساہ د اُستے نی دریکس چین ہم نی حکم کر

دُو تفوکن ۔ نن سلوکن حکم کین عالی جناب

نا محبت تِسنے کہ زندگی تو اُلفتے

سادہ اسک مُست داڑان زندگانی نا کتاب

ہل کنا دُوٹی لیحہ تا برے اُستے قرار

دشمناتا دُوتیان ای غم سانٹ بے حساب

چاسہ راہی گر اسِٹ نا اُست سے راضی کریس

کر یقین داوے کہ نی صدج نا ملک ثواب "(۱)

ا۔ راہی، عزیز، "دیوان راہی"، پبلشر خود، کوئٹہ۔، 1995ء، صفحہ 75۔

جدید دور کے براہوئی غزل گو شعراء (1980 تا حال)

یہ دور براہوئی غزل کا زرین دور ہے۔ اس دور میں براہوئی غزل نے بہت ترقی کی۔ اس دور میں ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی ہوئی ہے۔ اس دور کے غزل گو شعراء کی تفصیل اسطرح ہے :۔

پروفیسر عزیز مینگل

عزیز مینگل 9 جنوری 1947ء کو بنجپائی میں نور محمد مینگل کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ 1963ء میں میٹرک کا امتحان اسپیشل ہائی سکول کوئٹہ سے پاس کیا۔ 1967ء میں لاہور بورڈ سے ڈپلومہ آف کامرس کیا۔ 1969ء میں سندھ مسلم کالج کراچی سے بی کام 1975ء میں براہوئی فاضل بلوچستان یونیورسٹی سے پاس کیا۔ 1976ء میں ایل ایل بی اور ایم اے اکنامکس پاس کیا اور پھر بعد میں ایم اے براہوئی بھی اسی بلوچستان یونیورسٹی سے پاس کیا۔ نظم و نثر میں انکی کئی کتابیں چھپ کے منظر عام پر آئی ہیں۔ آجکل کوئٹہ میں کمرشل کالج کے پرنسپل ہیں۔

پروفیسر عزیز مینگل کے غزلوں کا مجموعہ "شلی" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 1995ء میں چھپا۔ انکی غزلوں میں سے ایک غزل پیش ہے۔ (۱)

"پارین کہ دا جور د جفا انتئے؟
پارے کنے او ۔مہر و وفا انتئے

پارینہ اود ءِ نن صنم آشنا ہرین
پارے ننے گڑانا خدا انتئے ؟

مُس ناحق نی نے آ خفا
پاپیسہ اسٹن نی خطا انتئے؟

بُس تو مُر کہ نی بوکی ءِ تینا
ننے آن شرم و حیا انتئے

مرض ءِ نی ودِف عزیزؔ عشق نا
دارُو عشق نا دا دوا ائسے ؟ (۲)

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، ساراوان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 151۔

۲۔ مینگل، عزیز، پروفیسر، "شلی"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 59۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر

عبدالرزاق ولد میر عبدالصمد سرپرہ تخلص صابر 14 اگست 1954ء کے دن ضلع مستونگ کے ایک گاؤں کردگاپ میں پیدا ہوئے۔ مڈل کردگاپ کے مڈل سکول میں پڑھا۔ 1971ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا 1975ء میں ایف اے 1977ء میں براہوئی فاضل اور ایم اے اُردو امتیازی نمبر لیکر پاس کیا۔ 1978ء میں انکی ادبی کاوشوں کو مدنظر رکھکر انکو پاکستان اسٹڈیز میں لیکچرار کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ ایک سال بعد انہوں نے ایم اے براہوئی اور پھر ایم اے پاکستان اسٹڈیز میں کیا۔ (ا)

1995ء میں بلوچستان یونیورسٹی میں پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی کے زیر سرپرستی میں "براہوئی اور بلوچی زبانوں کی لسانی مماثلت" پر پی ایچ ڈی کا اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ 1987ء تا 1994ء تک شعبہ پاکستان اسٹڈیز سے وابستہ رہے۔ 1994ء سے تاحال براہوئی شعبے سے وابستہ ہیں۔ وہ اس دوران شعبے کے سربراہ بھی رہے۔ آج کل بلوچستان یونیورسٹی میں بلوچستان اسٹڈیز سینٹر کے قائمقام ڈائریکٹر کے عہدے پر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ رزاق صابر براہوئی زبان کے ممتاز ادیب، شاعر اور محقق ہیں۔ انکی تحریر کردہ کتب میں "چراغ صابر" جو انکی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اسکے علاوہ ادبی اصناف کے موضوع پر براہوئی میں "ادب نا لشکاک" براہوئی کے ممتاز صوفی قادرالکلام شاعر تاج محمد تاجل کے کلام کو تحقیق کرکے دریافت کیا۔ اور انھیں "کلامِ تاجل" کے نام سے ترتیب دیکر شائع کروایا۔ اس کے علاوہ "سیرت النبیؐ" اور براہوئی ضرب المثل پر مبنی کتاب "شاہی خرواز" تحریر کی ہے۔

عبدالرزاق صابر کا شعری مجموعہ "چراغِ صابر" کے نام سے 1981ء میں منظر عام پر آیا۔ صابر نے اپنے کلام میں براہوئی غزل کو انفرادیت دی اور پرانی روایات سے ہٹ کر نئے رنگ و آہنگ میں غزلیں کہیں۔ اور براہوئی شاعری میں نئے خیال اور رجحانات کو رواج دی۔ ان کے شعری مجموعہ چراغ صابر سے ایک غزل پیش کیا جاتا ہے :

"شراب محبت کنف ساقیا

اینو میکدہ ءِ پلٹ ساقیا

ا۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، سارا وان ادبی اکیڈمی، مستونگ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 143,144۔

دا رِنداک صوب اسکان تولوک ارہ

شراب اینو گیشتر اتف ساقیا

بخلپی ءِ اے صراحی ءِ پرغ

شر آباتا جوئے وہف ساقیا

نا نیام ٹی رازدار نی اریس

صنم ھمو ملاقات کرِف ساقیا

نشہ ٹی حقیقت نا مسرت ارے

بناوٹ نا کیف ءِ درف ساقیا

اینو راز نا کینہ ایتاتے

دا پردہ ءِ نیام آن مُرف ساقیا" (ا)

ا۔صابر، عبدالرزاق، "چراغِ صابر"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1981ء، صفحہ 17۔

میر محمد اُلفت

میر محمد اُلفت ولد لکری محمد اعظم یکم مئی 1953ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسپیشل ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد 1974ء میں ایف اے، براہوئی فاضل کا امتحان امتیازی نمبر لیکر پاس کیا۔1982ء میں بی اے 1984ء میں ایم اے اردو اور 1988ء میں ایم اے براہوئی اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ انکے براہوئی غزلوں کا مجموعہ "مرواری" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ کی جانب سے 1987ء میں چھپ چکا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بہترین اناؤنسر اور کمپیئر ہیں۔ ریڈیائی اور ٹیلی کاسٹ ہونے والے براہوئی ڈراموں میں اداکار کے طور پر بھی کام کرتے آئے ہیں۔ سنگت دیوان ثقافت کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر بھی مامور ہو چکے ہیں۔ براہوئی اکیڈمی کے عہدیدار اور براہوئی ادبی سوسائٹی کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہو چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ مرکز میں براہوئی کے پروڈیوسر کے طور پر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ (۱)

میر محمد اُلفت کے غزلوں کی مجموعہ "مرواری" کے نام سے 1984ء میں براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ نے چھپوائی۔ کتاب کے کل 80 صفحات ہیں۔ اس میں کتاب کے بارے میں سوسائٹی کے چیئرمین رزاق صابر کے تاثرات اور دیباچہ کے بعد جن عنوانات کو اُلفت نے اپنی غزلوں کی دیوان میں موضوع بنایا ہے ان موضوعات میں سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول، غوث الاعظم دستگیر کے شان میں ایک صوفیانہ کلام، لال شہباز قلندر اور حضرت دوپاسی بابا کے شان میں ایک ایک عارفانہ کلام کے بعد 62 غزلیں اور آخر میں وطن دوستی اور عید کے تہوار پر ایک ایک نظم تحریر کیا گیا ہے۔ اُن کے غزلوں میں خوبی اور رنگ موجود ہے اور موسیقیت، رومانیت سے بھرپور ہیں۔ اُن کے کلام میں سے ایک غزل پیش ہے:

اینو دلربا کنا مہمان مس
کنے ءَ خدانا دا احسان مس

اریٹ خوش داخس کہ حد آن زیات
کنا روح ئنا او سامان مس

خنار دلربا ءِ کنے غمک اِلّار
کنا اُست نا پورہ ارمان مس

ا۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان و ادب"، سارا وان ادبی اکیڈمی، مستونگ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 153۔

بسک انجمن ٹی کرے روشنائی

کنا دین مسک ہم کنار ایمان مس

اُمر خوش مفر اینو پاہو کنے

اُلفت نا دردآتا درمان مس" (ا)

ا۔اُلفت، میر محمد "ٹمرواری"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1983ء، صفحہ 34۔

انور براہوئی

انور براہوئی کی غزلوں کا مجموعہ "دترئی ہور" جنوری 1985ء میں چھپا۔ براہوئی زبان وادب کی دنیا میں نئے وارد ہونے والوں میں انور براہوئی بھی شامل ہیں۔ شاعری کی دنیا میں پہلے قدم نے انہیں درد دیئے اور پھر اسی درد نے انہیں شاعر بنادیا۔ انور خود جن درد والم کے لمحات اور کیفیات سے دوچار ہوئے انہیں کیفیات کو اشعار کے قالب میں ڈالکر غزلوں کا رُوپ دیا۔ انکی شاعری میں الفاظ کی ترتیب، ردیف، قافیہ، جدید انداز و آہنگ میں لکھے گئے ہیں۔ جس میں تمام عام روایتی انداز کو یکسر مسترد کر کے بالکل نئے انداز میں شاعری کی ہے۔ گو کہ بعض غزلوں میں بحر و وزن کے خیال سے زیادہ پختگی اور مقصدِ بیان کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ انور براہوئی سماج کے عدم مساویانہ تقسیم، ظلم و جبر سے دلی طور پر بہت ہی مایوس نظر آتے ہیں اور اس غیر انسانی عمل نے اس کے دل پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاید انہوں نے اپنے زیادہ تر غزلوں میں "دل" کو موضوع بنالیا ہے۔

"اُست پائک ہوغو داخس کہ ہوغنگ اے سر مرے
خوشی آن نخو داخس کہ نخنگ اے سر مرے

اونا جدائی نا یاد برے تو برسہ کائے
اودے یاد کیو داخس کہ کننگ اے سرمرے

توار کنا کائے سر مرے مچا جہان ٹی
غریب نا اُست ءِ آزار کننگ اے سرمرے

ہُردہ بازی اٹ مَٹ نا دُواٹ رہنگ اک
لس منہ دے چین کہ انکار کننگ اے سر مرے

دا سر آن اے سر مرے ھر ہیت تو گڑا انوؔر
اُست ءِ قرار ملے زند نا جنگ اے سر مرے" (۱)

۱۔ براہوئی، انور، "دترئی ہور"، محبوب آرٹس پریس، کوئٹہ، 1985ء، صفحہ 78۔

محمد عارف ضیاء

محمد عارف ضیاء یکم دسمبر 1953ء کو کوئٹہ کے قریب کلی کرانی میں پیدا ہوئے۔ انکے والد علی محمد اور ضیاء ان کا تخلص ہے۔ ابتدائی پرائمری تعلیم پرائمری اسکول شالدرہ سے حاصل کی۔ 1968ء میں لاہور بورڈ سے میٹرک پاس کیا۔ 1976ء میں کوئٹہ بورڈ سے ایف اے کیا۔ اس کے بعد بی اے اور ایم اے بلوچستان یونیورسٹی سے کیا۔ بلوچستان کے شعبہ محکمہ تعلیم میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوسرے انتظامی عہدوں پر بھی فرائض سرانجام دیئے۔ عارف ڈرامہ اور افسانہ نویسی کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ (۱)

عارف ضیاء کی شاعری کا مجموعہ "سیشل" کے نام سے براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ نے 1991ء میں شائع کیا۔ انکی شاعری کے مجموعہ سیشل سے ایک غزل کا انتخاب ہے:

"تینا مَٹ دنیا ٹی او زیبا اے
دُن کہ پھُل اس باغ ٹی تینا مرے

زیب انا گودی سلوک ءِ بے نقاب
جائزہ نا طوبے ہمر بزا برے

اوڑان ہیدس ہر گڑا گیرام ہنا
مہربانی داخہ در اُست آ کرے

تیرمہ نا نیمروچ تنیا ٹی نا دے
او تینا زُلف آتے اٹ سیخا کرے

اُف کنا اُست ءِ دم ئس صبر و قرار
اُست ٹی دُن لگّے او خاخرے

نا تصوّر زیبدارے او ضیاء
زیب و زینت تسوئس نی دلبرے"(۱)

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، بار دوئم، سارا وان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 47, 146۔

۲۔ ضیاء، عارف، "سیشل"، پبلشرز براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 49,50۔

پروفیسر عبدالواحد مینگل

عبدالواحد مینگل میر نظیر محمد مینگل کے ہاں خضدار میں کلی کھٹان میں پیدا ہوئے۔ انکے والد ایک دین دار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے پرائمری اور میٹرک کا امتحان 1966ء میں خضدار سے پاس کیا۔ ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے فارسی امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ 1974ء میں لیکچرار گورنمنٹ کالج خضدار میں تعینات ہوئے۔ اور آجکل ایسوسی ایٹ پروفیسر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ کالج میں طالبعلمی کے دور سے ہی شاعری کرتے تھے۔ آپ کے شاعری رسائل و جرائد کے علاوہ ہفت روزہ "ایلم" میں چھپتے رہے ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "اُست ناتوار" 1999ء میں آپ نے خود چھپوایا۔ آپ کے غزلوں کی کتاب "اُست ناتوار" سے ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے:

"ہائے غریبی دا زیبائے مکانس دُو بتو
بے زمینس دُو بتو نے آسمانس دُو بتو

حُسن نا نی تاجدارُس درگہ نا نے نن فقیر
لنگران او بادشاہ نا آب و دانس دُو بتو

غیر نا ہیتاک ہشوکا انتئے نا پوغا تخور
نا خُرینکا ہیئہ دلبر مہربانُس دُو بتو

دیرنا خفا خُرینکاتے خنو مونجھا مرد
دیر خیال سے نا کروئے پاسبانس دُو بتو

نی کریسہ ظلم لاڈی شوق ناہس خاطران
سگ و سینہ نے متو نے اُست خانُس دُو بتو

خاخُرس لگانے مینگل سینہ نا عشق نا
اودے سکوس مشکلے نے دھنو جانُس دُو بتو

ا۔ مینگل، عبدالواحد، "اُست ناتوار"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء، صفحہ 124۔

حاجی محمد حسن غمخوار

حسن غمخوار ولد حاجی محمد امین 22-12-1958ء کو مستونگ کے قریبی گاؤں غلام پڑینز میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول سے 1977ء میں میٹرک پاس کیا۔1995ء میں ایف اے اور 1998ء میں بی اے پاس کیا۔انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز 1970ء سے کیا۔

بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔انہوں نے اپنی پہچان بحیثیت غزل گو شاعر کروایا ہے۔وہ براہوئی کے صوفی شاعر کے طور پر منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے اسکول استاد ہیں۔ حسنؔ کا شعری مجموعہ "تو بے نا ہنا" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 1996ء میں شائع ہوئی۔ ان کے ایک غزل کا نمونہ پیش ہے :

" امر اُست نا داسا خل جوڑ مَس

صنم ہجر ٹی نا غزل جوڑ مَس

لکیر آتہ کشانہ ای مش تیا

ولے زُف کسینا ناول جوڑ مَس

کریٹ شیشہ سازی ای نا شوق ٹی

کنے آن آدینک تل جوڑ مَس

کنا یوک خواریک مُر ہنار

پدا کعہ روزے ازل جوڑ مَس

ہمو شہر والا تہ مِن پاء حسنؔ

کنا عشق ممعہ مثل جوڑ مَس" (ا)

ا۔ غمخوار، محمد حسن، "طوبے ناہنا"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1996ء، صفحہ 77۔

ملک ظاہر شمیم

اصل نام ملک محمد ظاہر، والد کا نام حاجی ملک عنایت اللہ خان ہے۔ قدیم سے مستونگ کے قریبی گاؤں اشکنہ کاریز میں ہائش پزیر ہیں۔ ملک ظاہر کا تخلص "شمیم" ہے۔ آپ بلوچستان کے ممتاز قبیلے خواجۂ خیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مادری زبان فارسی ہے۔ 22 فروری 1966ء کو ڈھاڈر میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک کلی اشکنہ کاریز میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ پائلٹ ہائی اسکول مستونگ سے 1981ء میں، ایف اے 1985ء میں، بی اے 1988ء میں، ایم اے انگریزی ادب 1980ء اور ایم اے سیاسیات 1991ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے پاس کیا اور 1995ء میں ایل ایل بی کیا۔

براہوئی، اردو اور فارسی میں بہترین شاعری کرتے ہیں۔ شاعری میں وہ اپنا استاد اسحاق سوز کو قرار دیتے ہیں۔

ظاہر شمیم نے براہوئی میں شاعری کا آغاز 1982ء سے کیا۔ انکی غزلوں کا مجموعہ گلزار شمیم 1989ء میں چھپ چکا ہے۔ اور آجکل انکا غزلوں کا دوسرا مجموعہ "مہرنا مسافر" 2001ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ (۱)

اُن کے غزلوں سے ایک غزل پیش ہے :

"کنا پھُل ءِ کشکار دریر ظالماک
کنے غمتا گواچی کریر ظالماک

ہمو پھُل کہ پھلاتا سرتاج ئس
سڑان اودے اینو تریڑ ظالماک

ای حیرانٹ اینو آبڑ کیو امر
کنے تینا زندان ہثیر ظالماک

کنا حق ءِ ادفتے آن ھلے لس خدا
تباہ خوار برباد دیر ظالماک " (۲)

۱۔ شمیم، ظاہر ملک، "گلزار شمیم"ء، نادر پبلشرز، کوئٹہ، 1986ء صفحہ ۔
۲۔ شمیم، ظاہر ملک، "گلزار شمیم" ، نادر پبلشرز، کوئٹہ، 1986ء، صفحہ 83۔

ان کی ایک اور غزل پیش ہے :

''انت ظلم دنو گلفام کریس نی

مُفت کنے بدنام کریس نی

راز نا ہیتے رازُٹ تخائُٹ

شہرٹی اودے عام کریس نی

ای تو ہناٹہ منزل خلِسہ

انتئے کنے پدگام کریس نی

وختس ملاس نی گیسو کے تینا

روشنا دے تے شام کریس نی

تینا گتوکا ظاہر شیمؔ ءِ

اینو ام گیرام کریس نی (ا)

ا۔ شیم، ظاہر ملک، ''مہر نا مسافر''، قلات پبلشرز، جناح روڈ کوئٹہ۔2001ء، صفحہ 103۔

محمد حنیف مزآج

محمد حنیف مزآج ولد فیض محمد 22 مئی 1968ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔براہوئی فاضل اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔شاعری کے علاوہ نثر میں بھی لکھتے ہیں۔براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ کے ممبر اور سہ ماہی "دے تِک" کے ایڈیٹر ہیں۔شاعری میں اپنے استاد ضیاء الرحمان ضیاء، پرنسپل گورنمنٹ کالج مچھ کو کہتے ہیں۔انکا غزلوں کا مجموعہ "لمبہ" شائع ہو چکا ہے۔اسکے علاوہ انکا رباعیوں کا مجموعہ اور علم عروض کے بارے میں کتاب غیر مطبوعہ کتابیں چھپ کر آنے والے ہیں۔

محمد حنیف مزاج کے غزلوں کا مجموعہ "لمبہ" جو براہوئی ادبی سوسائٹی کولنے کی جانب سے 1996ء میں شائع ہوئی سے ایک غزل پیش ہے:

"بے سبب زندگی نی عذابے تخاس
عشقنا اُستٹی نی ذرابے تخاس

خاخرس ہم لمبہ کیک نا جان ٹی
نی اوار حُسن تو گر شبابے تخاس

غری اٹ تیر مسک امر وخت نماء
انتئے سنگت خوٹیک اَٹ جوابے تخاس

حسن نا شمبلاخ اٹ تفہ نی درو
ای ملائسٹ نی موننئے سرابے تخاس

دیر خواہک خنوکاتے ہردم اُرنگ
شون پِنا کنا پھُل تابے تخاس

دیر اِلا کرے دیر رخصت مزآج
نی کتاٹ کھوکا گارے تخاس" (۱)

ا۔ مزاج ، محمد حنیف،" لمبہ" ، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ،1996ء، صفحہ 141۔

محمد اسلم پروانہ

محمد اسلم پروانہ ولد نور محمد پرولنہ پندرانی 1953ء کو سندھ میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے ساتھ پرائمری سے میٹرک تک مستونگ میں حاصل کی۔ اس کے بعد کمپاؤنڈر کورس کر کے محکمہ صحت میں ملازمت اختیار کر لی۔ انکے والد براہوئی ادب سے وابستہ تھے۔ براہوئی زبان وادب کا چرچا گھر میں عام تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی ادبی شعور حاصل تھا۔ 1974ء سے براہوئی میں باقاعدہ شاعری شروع کی۔ اپنے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے منفرد شاعر ثابت ہوئے۔ 10 اگست 1989ء کو چند دوستوں کے ساتھ پکنک منانے پیر غائب گئے جہاں پانی میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے۔ مستونگ میں دفن ہوئے(۱)

محمد اسلم پروانہ مرحوم کا کلام "جذباتِ اسلم" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ نے یکجا کر کے 1995ء میں شائع کیا۔ اُن کے غزلوں کا مجموعہ "جذباتِ اسلم" سے ایک غزل پیش ہے:

"از نا انتظار استار مرین
اصل نے بے رُخی غت ئس نظر بس

برک نا انتظار اُستے ہُشانے
خڑینکاک بارُر خلتے آن دتر بس

غزل نا ہند ہند آتا توارے
سلامی شعر نا مونا نثر بس

رقیب ءِ جی کرین مخوکا مونٹ
امر دا جی نا مونا تفر بس

دُو پنگا عقل والا مس گنوکس
گنوکی نا تہ مونان ہر کئر بس

ا۔ جوہر، براہوئی، قیوم، " براہوئی تخلیق کار"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 101۔

تینٹ ہلکن گنوکی نا لغافے
تینٹ موتان نا ہیتا ہُنر بس

ہراکا ہیل کریس ہیتانہ اسلم
ہراکا ولدا ہیت ئی اثر بس" (۱)

ا۔ پروانہ، اسلم، "جذبات اسلم"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 93۔

طاہرہ احساس جتک

طاہرہ احساس جتک 16 اکتوبر 1955ء کو خضدار کے قریب کرخ میں پولیس آفیسر رسالدار میر غلام رسول کے ہاں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم خضدار میں حاصل کرنے کے بعد 1972ء میں میٹرک پاس کیا۔ ایف اے، بی اے کرنے کے بعد بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے اردو پاس کیا۔ کچھ عرصہ پبلک اسکول خضدار میں درس و تدریس سے وابستہ رہی۔ بعد میں بحیثیت لیکچرار محکمہ تعلیم میں تعینات ہوئی۔ مختلف کالجوں میں استاد کے فرائض سرانجام دے چکی ہیں۔ اُنکی غزلوں کا مجموعہ ''صدف'' براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 1995ء میں شائع ہوئی۔ اُن کا ایک غزل پیش ہے :

''انجان ءُ چہرہ اسر تا نشان ائر
دکھ و درد نا عجیبو او داستان ائر
درخت آتا پناک پوسکن شاخاک لڈیرہ
پھلاک چمن نا تازہ اوفتا دم آن ائر
نوداک شلارہ زیباتا چپ چاپ ائر
باحوصلہ باہمت او سخت جان ائر
کس قدرے نا ہم کتو احساس حیاتی ٹی
تینا دے قوم نا کہ او عز و شان ائر'' (۱)

ا۔ احساس، طاہرہ، جتک، ''صدف''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1995ء، صفحہ 50۔

عبدالقیوم بیدار

عبدالقیوم بیدار ولد عبدالوہاب مستونگ کے ممتاز قبیلے سارنگزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ 15 مئی 1956ء کوہُدہ کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم ہُدہ اور میٹرک 1977ء میں سینٹرل ہائی اسکول کوئٹہ سے پاس کیا۔ ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم اے براہوئی پاس کیا۔ آپ مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں اور پی ٹی وی کوئٹہ سینٹر میں پروڈیوسر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔(۱)

عبدالقیوم بیدار کا شعری مجموعہ "شمبلاخ" براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ نے 1989ء میں چھاپا۔ آپ کا ایک غزل پیش ہے:

"داڑے ہیت ءِ کنا کس بچک
دیرتون نا غمے کروٹ بیان

تیر کروٹ زندے یادٹی نا ای
رِندی او قول ٹس ای کریٹ اُستان

درد و غم داخہ در کے کنے تسوس
یاد ہڑدے ای کیوہ نے جانان

مفہ بے ہوش ، ہوش کہ بیدآر
عشق نا پیالہ ءِ کروس تاوان" (۲)

۱۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، سارلوان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 147۔
۲۔ بیدآر، عبدالقیوم، "شمبلاخ"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1989ء، صفحہ 110۔

افضل مراد

افضل مراد 1961ء میں ہدہ کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ جامع ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے براہوئی 2000ء میں امتیازی نمبر لیکر کامیاب ہوئے۔ آپ 1976ء سے ادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔ شعری مجموعہ گندار، دنیا کی بہترین شعراء کے کلام سے انتخاب براہوئی میں ترجمہ کر کے "ڈغار ناڈکھ" کے نام سے شائع کیا۔ براہوئی زبان کے بہترین افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، کالم نگار ہیں۔ حال ہی میں انکا شعری مجموعہ "سمند" براہوئی اکیڈمی کوئٹہ نے شائع کیا۔ (۱)

شعری مجموعہ "کادیل" پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کوئٹہ کی جانب سے 1996ء میں شائع ہوئی۔ اُن کے شعری مجموعہ کادیل سے ایک غزل کا انتخاب پیش ہے :

"وخت نا توار مرین نن
ببو تاب دار مرین نن
اولس ءِ بکار مرین نن
تینا اعتبار مرین نن
کسے تینا انتئے ایتن
کس نا انتظار مرین نن
تینا واخبی نا ہیت ءُ
مچے باز خوار مرین نن
مرغنا کسرتے گوئڈ کین
اوڑا اختیار مرین نن
تہارمی تے بے مراد کین
مچہ نا توار مرین نن

ا۔ شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براہوئی زبان وادب"، سارا وان ادبی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء بار دوئم، صفحہ 139, 138۔

خوانہ ڈن جاگہس بڑے

کسرءَ اوار مرین نن

واڑے کن زبادءِ تالان

خلک نا بہار مرین نن

صفاءَ مراد نا ہیتاک

نن دوے اوار مرین نن"(۱)

۱۔ مراد،افضل،" کاویل"، پروگریسو سائٹرز ایسوسی ایشن، کوئٹہ،1996ء، صفحہ90 ,89۔

اقبال ناظر

اقبال ناظر ولد غوث بخش کوئٹہ میں یکم جنوری 1972ء کو پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی کہتے ہیں۔ اپنا ادبی استاد محمد انور بھٹی کو مانتے ہیں۔ براہوئی ادبی سوسائٹی اور تنظیم کارواں ادب کوئٹہ کے ممبر ہیں۔

اقبال ناظر کا شعری مجموعہ "پن ریچ"، کاروان ادب کوئٹہ کی جانب سے 1999ء میں چھپا۔ انکے شعری مجموعہ "پن ریچ" سے ایک غزل پیش ہے:

"نے ائے طوبے دیار ئی پٹاٹ
نے ای استار تا شار ئی پٹاٹ
ہفتیکو نے آسان اسکان
ہم نے شیف ای ڈغار ئی پٹاٹ
نے ای بُلبُل تا آہ و زاری ئی
پھُل و پھُل اُٹ بہار ئی پٹاٹ
تیر کل نن وا جستجو ئی مس
روشنی ئے تہار ئی پٹاٹ
گُم ءُ منتراک یا تو ای گُم اُٹ
تینے تینا مدار ئی پٹاٹ
وڑو انتئے ای اینو وا ناظر
مہربانا تا شار ئی پٹاٹ" (۱)

۱۔ ناظر، اقبال، "پن ریچ"، کاروان ادب، کوئٹہ 1999ء، صفحہ 45۔

منظور بلوچ

منظور بلوچ یکم جنوری 1970ء کو قلات کے قریب پنچہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے براہوئی اور ایم اے جنرلزم امتیازی نمبر لیکر کامیابی حاصل کی۔ آپ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق صحافی کے طور پر بھی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن، ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے مختلف پروگراموں سے منسلک رہے۔ملک کے ممتاز اخبارات روزنامہ پاکستان لاہور، روزنامہ زمانہ کوئٹہ، روزنامہ کوہستان کوئٹہ، روزنامہ باخبر، اے پی پی اور آجکل روزنامہ مشرق سے وابستہ ہیں۔انکی غزلوں کا مجموعہ "برگشت" 1998ء میں براہوئی ادبی سوسائٹی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی۔ انکی ایک غزل پیش ہے :

"چندی چندی مہرباناک غم نشانی اتیرہ
وخت وقس آسماناک غم نشانی اتیرہ

دیرے پان دیرے گلہ ایتن کاٹم اِچ تمپک
انت اکے دا مہرباناک غم نشان ایترہ

دور انا دنیا سے آباد انت اکے ھر اُستئی
ہر انا بٹے گماناک غم نشان اتیرہ

خندلا منظور اریٹ منزل نا واہم اف گمان
اینو منزل نا نشاناک غم نشانی ایترہ " (۱)

ا۔ناظر، اقبال، "پن ریچ"، کاروان ادب، کوئٹہ 1999ء، صفحہ 45۔

عاصم فرید جمالدینی

عاصم فرید جمالدینی قاضی آباد نوشکی میں 1975ء کو پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم کے بعد 1993ء میں کوئٹہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ براہوئی کے کم سن شاعر کا غزلوں کا مجموعہ ''سُہیل'' صرف 18 سال کی عمر میں راسکوہ ادبی دیوان نوشکی نے 1994ء میں چھاپا۔ اُنکے شعری مجموعہ ''سُہیل'' سے ایک غزل پیش ہے:

''نی انت کن کنے آن دلدار جتا مُس
ہردم خوینک خلیوہ غمخوار جتا مُس

چار دے اے آواری خنتیان کنا ہمارک
قست اڈ الو خوشی اے یار جتا مُس

زیبا ای پاؤ اخس دا دنیا نا روائے
نا اُست ءِ ظالماک کہ پدغار جتا مُس

لگا خیسنو تیرس ٹپی مس جغر دا
عاصم فرید درداک کشکار جتا مُس''(۱)

۱۔ فرید، عاصم، جمالدینی، ''سُہیل''، راسکوہ ادبی دیوان، نوشکی، 1994ء، صفحہ 52۔

Conclusion ماحصل

ماحصل Conclusion

براہوئی زبان جو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے ، میں نے اسی قدیم زبان میں کہی گئی غزلوں کی تاریخ، آغاز وارتقاء کے موضوع کا اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے کیلئے انتخاب کیا ہے۔ براہوئی زبان کی قدامت اور تاریخ کو جب ہم ثابت کرتے ہیں تو پھر اسی طرح اس زبان کے ادب کا بھی دنیا کے قدیم ترین ادب میں شمار ہوتا ہے۔

کسی قوم کے اندازِ فکر وعمل، ذہنی ارتقاء اور تہذیب وتمدن کا اندازہ اُسکے ادب کے ذریعے سے ہی لگایا جاتا ہے کیونکہ ادب زندگی کے اظہار کا نام ہے۔ ادب لفظوں کی ترتیب وتنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ وفکر بھی شامل ہوتے ہیں۔ احساس یا فکر وخیال کے اظہار کو ادب کہا جاتا ہے۔ ایک ایسی تحریر کو ادب کا نام دیا جاسکتا ہے کہ جس کا پڑھنے والا اُس تحریر سے لطف اندوز ہو اور اس کے بولنے سے مسرت اور خوشی حاصل کرے ادب ایک ایسا اظہار ہے جو زندگی کا شعور اور ادراک حاصل کرنے کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کی تخلیقی تجربے کو اُبھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اُس تجربے کا ادراک کرلیتا ہے۔ یہ ادب کا خاص منصب ہے۔ ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ادب کی سطح پر ہم اپنی ذات سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ ادب عمل ادراک کی غیر معمولی قوت کے ذریعے ہماری عام ہستی کو بیدار کر کے شعور کی سطح پر لے آتا ہے۔

ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا نام ہے اور اسی لئے ادب میں زندگی کے شعور کا عمل دخل زیادہ ہے ۔ اسی شعور کے ذریعے ہم بدلتے ہیں ہم وہ نہیں رہتے جو اس وقت ہیں اور اسی سے ہماری قوتِ عمل بیدار ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے جن سے ہمیں کبھی واسطہ نہیں پڑا ادب کے ذریعے ہمارے تجربے بن جاتے ہیں جو ہمیں اور ہمارے اندازِ فکر کو بدل دیتے ہیں۔ ادب ہی کے ذریعے ہم کسی قوم کی اخلاقی قدروں سے متعارف ہوتے ہیں۔ اسکے مطالعے سے اُس قوم کی اسلاف کے اندازِ بیان اور خیالات سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ یہی ادب لوگوں کی اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

میرا موضوع چونکہ براہوئی غزل کے آغاز وارتقاء سے متعلق ہے مگر براہوئی غزل کی جو مقامی شناخت ہے اُسکو اُجاگر کرنے اور سامنے لانے کے اسباب میں براہوئی قدیم شاعری بھی شامل ہے۔

براہوئی لوک شاعری میں عشقیہ ، رزمیہ ، مزاحیہ منظومات کے علاوہ مختلف رسوم کے گیت ، لوریاں ،

مرثیوں کے اصناف وغیرہ بھی شامل ہیں۔ براہوئی لوک شاعری میں عشقیہ موضوعات پر مبنی شاعری مثلاً مرنازنا، ماہ لنج، لیلڑی لا، سومری وغیرہ ہیں جو براہوئی شاعری اور خصوصاً غزل کے ماخذ ہیں۔ براہوئی شاعری کے تحریری دور کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ براہوئی زبان میں شاعری کی پہلی کتاب "تحفتہ العجائب" جسے مولانا ملک داد قلاتی نے 1760ء میں تحریر کیا ہے اس کتاب کو بعد کے سالوں میں براہوئی کے شاعر حاجی نبو جان نے 1906ء میں چھپوا کر منظر عام پر لے آیا۔

براہوئی غزل کی تاریخ کو بیان کرنے سے قبل خود غزل کی اپنی داستان ہے۔ شاعری کے اصناف میں غزل ایک مستقل اور اہم صنف مانا جاتا ہے۔ غزل کی تکنیک یہ ہے کہ اُس میں عام طور پر پانچ، سات یا نو شعر ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جسے مطلع کہا جاتا ہے۔ غزل میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہوسکتے ہیں۔ باقی اشعار کا مصرعہ ثانی قافیہ دار ہوتا ہے۔ آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا نام یا تخلص استعمال کرتا ہے۔

عام طور پر عشقیہ مضامین ہی غزل کی اصل روح ہوتی ہے اور مے نوشی بھی اس کے خاص موضوع ہیں، لیکن بہت سے شعراء نے غزل میں تصوّف اور اخلاقی موضوعات پر مبنی شاعری کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے شعراء نے قومی، وطنی، سیاسی، سماجی حالات کو بھی غزل میں ذریعہ اظہار بنایا ہے۔

یوں تو غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا اور اُن سے عشق بازی کرنا ہے لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ غزل زخمی ہرن کی چیخ اور آہ و بکا کو بھی کہتے ہیں۔ ایران کے ایک ممتاز شاعر شمس قیس رازی غزل کی تعریف اسطرح کرتا ہے :۔

"نسیب جو قصیدہ کے آغاز میں ہوتا ہے، جس کو تغزل بھی کہا جاتا ہے روایتی عشقیہ باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ غزل میں ذکر عشق اور وصف حُسنِ محبوب ہوتا ہے۔ نیز وہ ذاتی عشقیہ حالات در احت و شادمانیِ دل ہے۔ اسلئے اس کا وزن خوش آئند، اسکے الفاظ سادہ اور معنی روشن ہونے چاہئیں"۔

شمس قیس رازی کا غزل کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے :۔

"جب کتا ہرن کو شکار کرتا ہے اور ہرن بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں نحیف سی آواز نکالتا ہے اور اس نحیف اور پُردرد آواز سے کتا ایسا متاثر ہوتا ہے کہ وہ ہرن کو چھوڑ دیتا ہے اسے "غزل القلب" کہتے ہیں"۔

جو شخص بھی عام آدمیوں سے بڑھکر کوئی دلکش اور مؤثر تقریر کرتا اہلِ عرب اُسی کو شاعر کہتے تھے۔ اُنکی اس شاعری میں برجستہ اور دلآویز فقرے و مثالیں بھی پائی جاتی تھیں جو عربوں کے عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں اور

تقریباً یہی وجوہات اور اسباب تھے کہ قریش نے قرآن کے نرالی اور عجیب عبارت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہنے لگے۔ قبل از اسلام عربوں میں یہ دستور ہوا کرتا تھا کہ اگر کوئی آدمی شاعری کرتا یا شعر گوئی میں کمال رکھتا تو اسکے کلام کا اُس وقت تک کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ وہ مکہ میں آکر قریش کی مجلس میں اپنا کلام پیش نہ کرتا۔ اگر اہلِ مجلس اسے اچھا سمجھتے تو داد دیتے اور دل کھول کر داد دیتے ورنہ اس کلام کو لغو اور بیکار سمجھ کر زائل کیا جاتا اور شاعر اپنا سا منہ لیکر شرمندۂ مجلس ہوتا اور پھر آہستہ آہستہ یہ رواج بھی عام ہوا کہ جو زیادہ قابلِ تعریف شاعر ہوتا اس کے کلام کو جو قصیدے کی شکل میں ہوتا خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تاکہ لوگ خود آکر اس کلام کو دیکھیں اور شاعر کی عمدگیِ کلام کی داد دیں۔ پھر یہ رواج رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن کے بعد ختم ہوا اور ان قصائد کو خانہ کعبہ کے دروازے سے ہٹا دیا گیا۔

تقریباً سو سال پیشتر جب غزل کا الگ رنگ اور وجود قائم نہیں ہوا تھا شعرائے عرب و عجم اپنے فنی شاہکار قصیدوں کی صورت میں پیش کیا کرتے تھے۔ اُسوقت بھی کلام کی ابتداء عشقیہ اشعار سے ہی ہوتی تھی۔ اگرچہ ان عشقیہ اشعار کو غزل نہیں بلکہ نسیب یا تشبیب کہا جاتا تھا۔ اہلِ عرب التزاماً اپنے قصیدوں کے اولین اشعار میں محبوب سے مخاطب ہوکر اُسکے حُسن و شباب کا ذکر کرتے تھے۔ اہلِ ایران بھی اُن کی تقلید میں قصیدوں کے شروع میں تشبیب لانے لگے پھر اسمیں رفتہ رفتہ حُسن و شباب کے ذکر کے ساتھ ساتھ واردات، واحساساتِ قلب کا ذکر بھی شامل ہوگیا اور عشقیہ اشعار کی زبان میں لطافت آتی گئی تو تشبیب غزل کا نام پایا اور پھر قصیدے سے الگ لکھی جانے لگی اور اسطرح غزل کا مفہوم متعین ہوگیا۔

غزل ایشیا کی پیداوار ہے اسلئے یہ قدرتی طور پر ایشیائی ذہن وفکر سے قریب تر ہے۔ براہوئی زبان بھی چونکہ اسی خطے کے حوالے سے اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہے اسلئے شاعری کے اس صنف کے اثرات بھی اس زبان میں نمودار ہونے لگے۔

براہوئی غزل کا آغاز مُلا محمد حسن نے انیسویں صدی عیسوی میں کیا بعد میں مُلا عبدالحکیم مشوانی، مولانا عبدالمجید چوتوئی اور دوسرے قادرالکلام غزل گو شعراء کی حیثیت سے سامنے آئے۔ مُلا محمد حسن چونکہ فارسی کے شناور تھے اسی لئے اُن کے براہوئی غزلوں میں بھی فارسی کی سی رعنائیت رچی بسی ہے لیکن بعد کے شعراء جن میں مولانا محمد عمر دینپوری بھی شامل تھے کے کلام میں مذہبی رنگ غالب رہی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں مذہبی تبلیغ کو موضوع بنالیا۔

براہوئی شاعری میں مذہبی یا اسلامی تبلیغ کا سلسلہ مکتبہ دُرخانی سے شروع ہوا۔ بلوچستان پر انگریزوں کے قابض ہونے کے بعد یہاں اُنہوں نے عیسائی مبلغین کے ذریعے عیسائیت کا پرچار شروع کردیا تھا۔ انگریزوں نے بلوچستان میں

عیسائیت کی پرچار کیلئے مشن اسکولوں اور ہسپتالوں کے علاوہ کئی دوسرے خیراتی ادارے بھی قائم کیئے تھے جو یہاں کے لوگوں کی اقتصادی، معاشی، تعلیمی پسماندگی کو مدنظر رکھ کر لوگوں کو عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

انگریزوں کی اس روش کو دیکھ کر بلوچستان کے مقامی علماء نے حضرت پیر سید ابوالخیر کی سرپرستی میں بلوچستان میں بڑھتے ہوئے عیسائیت کے اثرات کو روکنے کے لئے مختلف تدابیر سوجھیں لہذا انہوں نے اس معاملے کو سلجھانے کیلئے دوسرے بہت سے مذہبی علماء کے ساتھ کئی ایک بیٹھک کیئے۔ آخرکار وہ اس بات پر متفق ہوئے کہ بلوچستان میں عیسائیت کے اثرات اور پرچار کو روکنے کیلئے مقامی زبانوں یعنی بلوچی اور براہوئی کو تدریسی زبان کے طور پر استعمال کیا جائے اور اسی ضمن میں 1883ء میں ڈھاڈر کے مقام پر دُرخان گاؤں میں ایک مدرسہ بنام مدرسہ دُرخانی قائم کیا جس میں علماء کرام طلباء کو تمام اسلامی علوم براہوئی اور بلوچی زبانوں میں پڑھانے لگے۔ کئی اسلامی شرعی قوانین کے براہوئی اور بلوچی زبانوں میں تراجم کیئے۔ مکتبہ دُرخانی عیسائیت کو روکنے میں اس تجربے کی بنیاد پر کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس مدرسے سے جو علماء فارغ ہوتے گئے انہوں نے آگے جاکر بلوچستان کے چپہ چپہ میں بلوچی اور براہوئی زبان میں شاعری کے ذریعے اسلامی قوانین کی پابندی، بُرے رسوم کی مخالفت اور ارکانِ اسلام کی پاسداری کو موضوعِ سخن بنالیا لیکن اسی دور میں اور بہت سے ایسے بھی براہوئی شعراء موجود تھے جو مذہبی شاعری نہیں بلکہ عشقیہ اور رزمیہ شاعری کیا کرتے تھے۔ ان شعراء میں ریکی، بشام، بلو اور قیصر خان جیسے نامور شاعر شامل تھے۔ مُلا محمد حسن کے بعد کے شعراء یعنی ملا عبدالحکیم مشوانی، مولانا عبدالمجید چوتوئی، مولانا محمد عمر دینپوری جیسے علماء نے اپنے اشعار میں صرف اور صرف اسلامی شعار، مذہبی تبلیغ اور ارکانِ اسلام کو روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ابتداء میں براہوئی غزل میں صرف سادہ انداز میں مذہبی عقائد بیان ہوئے تھے یا پھر اس میں سادہ عشقیہ مضامین ادا کیئے جاتے تھے۔ غزل میں الفاظ، تشبیہات اور استعارے بھی سادہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن مولانا عبدالحکیم مشوانی نے غزل میں عرفان و تصوف کا رنگ بھر ا اور پھر اس روایت کو بعد کے شعراء مثلاً مولانا محمد اسماعیل مینگل کے ساتھ ساتھ قیامِ پاکستان کے بعد کے شعراء پیر محمد زبیرانی، پیر محمد نیمرغی، جوہر براہوئی اور مولانا عبدالخالق ابابکی نے بھی اپنایا۔

بلوچستان میں قبائلی طرزِ حکومت، تعلیمی پسماندگی، سماجی، معاشرتی اور معاشی بدحالی اور پھر بلوچستان پر انگریزوں کے قبضے نے پسماندگی کے اس طوقِ غلامی کو اور مضبوط کر لیا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل بلوچستان میں پہلے سے قائم قدیم طرزِ حکومت کی حکمتِ عملی جس کے ذریعے سرداروں نے یہاں کے لوگوں کو محکوم بنالیا تھا، انگریزوں نے بھی اپنی مقاصد کے

حصول کیلئے اُسی طریقے کو اپنایا اور انہیں یہی طرزِ عمل راس آئی۔ بلوچستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے بلوچستان کی سیاسی اور انتظامی اُمور میں اُس طرح مداخلت نہیں کی جسکا تجربہ انہوں نے برصغیر پر قبضہ جمانے کے دوران کیا تھا۔

بلوچستان میں پسماندگی کے یہ مختلف کیفیات بعد میں بھی نہیں بدلے جس سے یہاں کے مقامی ادیب، شاعر متاثر ہوئے اُنکی طویل زبان بندی بلوچستان کے عوام کے مفلوک الحال مزاج اور مفلوج ذہنوں کو مزید ناکارہ کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی لیکن اس صورتحال میں اُس دور کے نوجوانوں نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے بلوچستان کے مفلوک الحال عوام کی زبوں حالی کی داستان کو برصغیر کے نامور سیاست دانوں اور ادیبوں تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا۔ ان میں نواب یوسف عزیز مگسی، میر عبدالعزیز کرد، ملک فیض محمد یوسف زئی، میر گل خان نصیر، خان عبدالصمد خان اچکزئی کے علاوہ اور بہت سے زعماء شامل تھے۔

بعد ازاں قیامِ پاکستان (1947ء) کے بعد اس تحریک کو براہوئی کے ادیب و شاعر نادر قمبرانی نے جلا بخشی جو اُس دور کے سیاسی جلسوں میں قومی گیت اور نظمیں گاگا کر لوگوں کی ذہنوں میں تبدیلی لانے کی تحریک کو اُبھارتے رہے۔ براہوئی کے اس شاعر نے براہوئی غزل میں پہلی بار معاشرتی اور سیاسی عنوانات کو موضوعِ سخن بنایا اور پہلی بار براہوئی غزل میں یہ نئی جہت روشناس کرائی جن سے براہوئی غزل کا دامن خالی تھا۔

غزل میں یہ عوامی شعور کا آغاز تھا۔ ابتداء نادر قمبرانی نے کی اور بعد میں یہ صورتحال میر عبدالرحمٰن کرد، محمد اسحاق سوز، امیر الملک مینگل، عزیز مینگل، عزیز راہی، محمد حسن غمخوار وغیرہ کے کلام میں عروج کو پہنچا۔ ان شعراء نے عوامی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ غزل میں قومی اُمنگوں، قومی اور ملی مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا۔ اگرچہ غزل کی ہیئت عام طور پر ان مقاصد کو بیان کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لیکن نادر قمبرانی نے غزل میں ان مضامین کو ایسے فنکارانہ انداز میں پیش کیا کہ غزل اپنی ہیئت اور لوازمات کے ساتھ عوامی اور قومی مسائل کی ترجمان بن گئی۔

شاعر جتنی بھی قُدرتِ سخن کیوں نہ رکھتا ہو غزل میں آہنگ غزل کے ساتھ اجتماعی اور سیاسی مسائل اسوقت بیان کر سکتا ہے جب وہ غزل کی مزاج سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور روایتِ غزل پر اُسے عبور اور کمال حاصل ہو۔

اس عہد کی غزلوں میں سیاسی اور معاشرتی موضوعات کے دخل سے براہوئی غزل میں مقصدیت کا عنصر واضح اور نمایاں شکل میں سامنے آگیا۔ غزل میں مقصدیت کا عمل دخل اتنا زیادہ تھا کہ یہ نظریہ اُبھر کر سامنے آیا کہ براہوئی غزل مقاصد کے حصول کا ذریعہ ٹھہرا۔ معاشرے میں جب یکسانیت ختم ہوتی رہی تو براہوئی غزل میں دوسرے رجحانات بھی داخل ہوتے رہے

جن میں رومانویت اور عشقیہ موضوعات پر مبنی رجحانات بھی شامل ہیں۔ ان رجحانات کے سامنے آنے سے براہوئی غزل اپنی اصل موضوعات کی جانب پلٹ گئی۔ اس عہد کا نفسیاتی مزاج غزل کے ابتدائی تصور کے ساتھ اُبھر کر سامنے آیا۔ مقدار اور معیار کے لحاظ سے یہ عہد براہوئی غزل کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوا۔

اگر اس عہد کی غزلوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس عہد کی غزلوں میں اثرات مرتب کرنے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں جو دیرپا ثابت ہوسکتی ہیں۔

رومانوی موضوعات اور رجحانات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی غزلیں دوسرے رجحانات کو بھی سموئے ہوئے ہے لیکن اس دور کے براہوئی غزل میں غالب رجحان رومانویت کو ہی حاصل ہے۔

کوئی بڑی تہذیب جب ارتقاء کی منزل طے کرلیتی ہے تو اختصار کی صورت میں سامنے آتی ہے جس طرح آج کی سائنسی ترقی نے دنیا بھر کی معلومات کو سمیٹ کر کمپیوٹر میں مقید کرلیا ہے اسی طرح شعر و ادب نے جب ارتقاء کی منازل طے کیں تو قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ جیسی طویل اصناف سے نکل کر غزل کی طرف سفر شروع کیا۔ غزل اختصار کی تہذیب ہے کوئی ایسا خیال جسے بیان کرنے کیلئے کسی طویل نظم، قصیدہ، مثنوی یا مرثیہ لکھنے کی ضرورت ہو تو اچھا شاعر جو غزل کو اور غزل کے شعر کو سمجھتا ہو اسے غزل کے ایک شعر میں بیان کردیتا ہے اور پھر بھی پختگی کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے جیسا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی نامعلوم سے معلوم اور نامکمل سے مکمل کی طرف ایک سفر ہے۔ لہذا ادب بھی کسی طور مکمل اور پختہ نہیں اتنا ضرور ہے کہ زندگی کی کمزوریوں اور ناپختگیوں کو ختم کرنا ادیبوں کا خواب اور ادب کا مقصد رہا ہے۔ شاعر صدیوں سے معاشرے کی تباہ کاریوں، انفرادی مسائل اور جذباتی زندگی کے اُتار چڑھاؤ پر شاعری کرتے رہے ہیں اسی طرح وہ شاعری کو اصلاح کا ہتھیار بھی بناتے اور ساتھ شاعری کا مقصد اولین (to provide pleasure) یعنی راحت وشادکامی بھی پورا کرتے رہے۔

براہوئی غزل ارتقائی مراحل کے جس مقام پر آج کھڑی ہے یہ ایک طرف کہنہ مشق شعراء کی نئی نئی عنوانات پر طبع آزمائی کی مرہونِ منت ہے تو دوسری طرف جدید عہد کے نوجوان شعراء بھی برابر کے حصہ دار ہیں جو غزل کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، اس میں نت نئے تجربات کرنے اور موضوع کے لحاظ سے اس میں وسعت لانے کا سبب بنے ہیں۔ نامساعد حالات کے باوجود ہر سال ان نوجوان شعراء کے کئی معیاری شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہوتے ہیں ان میں مجموعی طور پر عزیز راہی، عزیز مینگل، جوہر براہوئی، جباریار، عبدالرزاق صابر، افضل مراد، قیوم بیدار کے علاوہ اسلم پردانہ،

تاج رئیسانی، ظاہر شیم،وحید زہیر،عارف ضیاء ،اقبال ناظر، حنیف مزاج، حمید عزیز آبادی، شمس ندیم، منظور بلوچ،عاصم فرید جمالدینی اور دوسرے بہت سے شعراء کے نام شامل ہیں۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ براہوئی غزل نے بھی ادب کی اس طویل تاریخ میں جنم لیا جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے جن جہتوں پر براہوئی غزل رواں دواں ہے اور جن بلندیوں تک پہنچی ہے وہ منفرد، قابلِ ذکر اور اچھوتی ضرور ہیں لیکن اب بھی اس میں کئی نئی جہتوں کا اضافہ کرنے اور اس میں نئے افق کو نمایاں کرنے کی بہت گنجائش موجود ہے۔

کتابیات (Bibliography)

۱۔ اُردو کُتب

۲۔ براہوئی کُتب

۳۔ پشتو اور فارسی کُتب

۴۔ انگریزی کُتب

۵۔ جرائد، رسائل، اخبارات اور غیر مطبوعہ کُتب اور مقالے

اُردو کُتب

1 آحمد زئی، نصیر خان، آغا، تاریخ بلوچ وبلوچستان"، جلد سوئم، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1993ء

2 آحمد، کمال الدین، "صحافت وادی بولان میں"، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1978ء

3 آخوند، محمد صدیق ، "تاریخ خوانین قلات"، مترجم میر گل خان نصیر، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1984ء

4 آخوند، محمد صدیق ، "کوُردگال نامک"، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1970

5 آخوند، محمد صدیق ، "کوُردگال نامک"، ترجمہ پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 1984

6 لابکی، عبدالخالق، "کومیں رحیل"، پبلشرز مکتبہ آبابکی، مستونگ، 1999ء

7 احمد، اکبر آبادی، نقدِ ادب، اکیڈمی آف ایجوکیشن، کراچی، 1963ء

8 اختر، سلیم، ڈاکٹر، "تخلیق اور لاشعوری محرکات"، سنگِ میل پبلشرز، لاہور، 1993ء

9 ادبیاتِ سرحد، "منتخب مضامین ومقالے، سن اشاعت ندارد

10 الطاف، علی، سلطان، پروفیسر، "تاریخ نامہ ہرات"، یونائیٹڈ پرنٹرز، کوئٹہ، 1985ء

11 باقر، ساجد، محمد، "مغرب کے تنقیدی اصول"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

12 بجارانی، خدابخش، میر، مری، "قدیم بلوچی شاعری"، بزم ثقافت، کوئٹہ، 1963ء

13 بخاری، سید، محمود شاہ، "بلوچستان زمانہ قدیم سے قیام پاکستان تک"، بخاری ٹریڈرز، کوئٹہ، 1987ء

14 بخاری، سہیل، ڈاکٹر، "اُردو کا رُوپ"، آزاد بک ڈپو، لاہور، 1971ء

15 براہوئی، عبدالرحمٰن، "قدیم براہوئی شعراء، حصہ اول"، ادارہ ادب بلوچستان، کوئٹہ

16 براہوئی، عبدالرحمٰن، "براہوئی نامہ"، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، 1978ء

17 براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "براہوئی زبان وادب کی مختصر تاریخ"، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، 1982ء

18 براہوئی، عبدالرحمٰن، "براہوئی لوک کہانیاں"، قومی لوک ورثہ، اسلام آباد، 1985ء

19 برے، ڈینس، "براہوئی رسوم"، ترجمہ کامل القادری، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1984ء

20 بلوچ، محمد رمضان ملک، "بلوچ سماج کے خدوخال"، مکتبہ ساربان، مستونگ، 1976ء

21 بلوچ، محمد سردار خان، "بلوچ قوم کی تاریخ"، ترجمہ ایم انور رُومان، نساء ٹریڈرز کوئٹہ، 1989ء

22 بلوچ، محمد سعید ملک دہوار، "بلوچستان ما قبل تاریخ"، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 1971ء

23 بلگرامی، علی سید، "تمدنِ عرب"، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1960ء

24 ثقافت وادب وادی بولان میں (مرتب)، بزم ثقافت، کوئٹہ، سنِ اشاعت ندارد

25 جالب، حبیب، "حرفِ حق"، مکتبہ دانیال، سن اشاعت ندارد

26 جالبی، جمیل، ڈاکٹر، "ادب، کلچر اور مسائل"، پاکستان نیشنل اکیڈمی، کراچی، 1981ء

27 جعفر، رفیق، "نفسیات میں بنیادی موضوعات"، پبلشرز آغا سہیل، لاہور، 1999ء

28 چند گیان، ڈاکٹر، "تحقیق کا فن"، پبلشرز مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1994ء

29 حالی، الطاف حسین، "مقدمہ شعر وشاعری"، پبلشرز چوہدری رحیم بخش، کشمیر کتاب گھر 131، اُردو بازار لاہور، سن اشاعت ندارد

30 حسن، محمد ہادی، "شاعری اور تخیل"، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1966ء

31 حیدر، سندھی، ڈاکٹر، "ہمار السانی وادبی ورثہ"، قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، 1995ء

32 حبیب، احمد چوہدری، "تحریکِ پاکستان اور نیشلسٹ علماء"، پبلشرز محمد حنیف رامے، لاہور، 1966ء

33 خان، احمد یار خان، "مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ"، ایوان قلات، کوئٹہ، 1974ء

34 دہوار، محمد سعید ملک، "بلوچستان ماہ قبل تاریخ"، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1971ء

35 رضوی، باقر سجاد، ڈاکٹر، "تہذیب وتخلیق"، پبلشرز مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء

36 رشید احمد، "تاریخِ مذاہب"، قلات پبلشرز مستونگ، 1960ء

37 رُومان، انور، پروفیسر، "براہوئی لوک کہانیاں"، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 1965ء

38 زور، قادری، محی الدین سید، ڈاکٹر، "روحِ تنقید"، مکتبہ معین الادب، تعلیمی ادارہ اردو بازار، لاہور، 1955ء

39 سلیم اختر، ڈاکٹر، "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"، سنگ میل پبلشرز، لاہور (دسواں ایڈیشن) 1984ء

40 سکینہ دام ہاہو، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اُردو"، لاہور، 1967ء

41 سندھی، عبدالمجید میمن، ڈاکٹر، "لسانیاتِ پاکستان"، پبلشرز مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992ء

42 "سخن کے پھول"، (مرتب) خان پبلشرز لکشمی چوک، لاہور، سنِ اشاعت ندارد

43 سیالکوٹی، عبدالحق، حافظ، "تاریخ گوجراں"، گوجرا کیڈمی، لاہور، 1985ء

44 شبلی، مولانا، "شعر العجم (حصہ اول تا پنجم)، لاہور

45 شاہوانی، رحیم داد میر، "تاریخ قلات"، بلوچی اکیڈمی، پٹیل روڈ، کوئٹہ، 1945ء

46 صابر، عبدالرزاق، ڈاکٹر، "چارباغ"، (مرتب) براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 2002ء

47 صدیقی، خلیل، "آواز شناسی"، پبلشرز زیکن بکس گلگشت، ملتان، 1992ء

48 صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر، "فارسی غزل اور اُس کا ارتقاء"، پبلشرز مجلسِ تحقیق و تالیف فارسی، 1993ء

49 طفیل، احمد، میاں، (مترجم) کشف المحجوب" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، کراچی، ڈھاکہ، 1968ء

50 عبدالرشید، سید، ڈاکٹر، "اشاراتِ تنقید"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1993ء

51 عزیز احمد، (مترجم)" فنِ شاعری (بوطیقا)، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1974ء

52 علوی، عبدالحئی، پروفیسر، "اصول نفسیات (جلد اول)، پبلشرز مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء

53 علوی، عبدالحئی، پروفیسر، "اصول نفسیات"، حصہ دوئم، پبلشرز مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1989ء

54 عین الحق، سید "قدیم مشرق"، مکتبہ فریدی، کراچی، سنِ اشاعت ندارد

55 عین الحق، سید، "تہذیبیں"، علی بک ڈپو، کراچی، 1987ء

56 فاروق احمد، ڈاکٹر، "بلوچستان میں اردو زبان وادب"، بولان اکیڈمی، کوئٹہ، 1998ء

57 فتح پوری فرمان، ڈاکٹر، "اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ"، وکٹری بک بنک، لاہور، 1990ء

58 فیض، احمد، فیض، "شام شہر یاران"، کلیاتِ فیض مکتبہ کاروان، لاہور

59 کاشمیری، ظہیر، "ادب کے مادی نظریے"، کلاسیک، لاہور، 1975ء

60 کامل القادری، "قدیم بلوچستان"، بولان بک کارپوریشن، سن اشاعت

61 کاکوئی، عطا، "محفلِ غزل"، ملک بک ڈپو، اردو بازار، لاہور

62 کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، "بلوچستان میں فارسی شاعری"، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1968ء

63 کوثر، انعام الحق، "بلوچستان میں اُردو"، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، سنِ اشاعت

64 کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، "بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1991ء

65 کھیتران، غلام محمد، ڈاکٹر، "کھیترانی نامہ"، سوداں پبلشرز، بارکھان، 2001ء

66 قاسم، محمود، سید، "قدیم تہذیب اور جدید انسان"، شیش محل، لاہور، 1962ء

67 گنڈا سنگھ، ڈاکٹر، "احمد شاہ ابدالی"، پبلشرز ادب منزل پاکستان، کراچی، 1977ء

68 لدھیانوی، ساحر، "تلخیاں"، رابعہ بک ہاؤس انار کلی، لاہور، سن اشاعت ندارد

69 محمد تقی، سید، "رُوح اور فلسفہ"، اردو اکیڈمی، کراچی، 1963ء

70 مری، شیر محمد، "بلوچی زبان و ادب کی تاریخ"، ترجمہ آغا نصیر خان احمد زئی و پیر محمد زبیرانی، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 1993ء

71 محمد ناصر، آغا، "بلوچستان میں اردو شاعری"، کوڑک پبلشرز، کوئٹہ، 2000ء

72 محمد احسان، پروفیسر، "اصولِ تنقید"، عملی کتاب گھر، اردو بازار، لاہور، 1988ء

73 مخدوم غلام جیلانی، پروفیسر، "ادب عربی"، علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، سن اشاعت ندارد

74 مراد، افضل، بیسویں صدی میں بلوچستان کا ادب، قلم قبیلہ، کوئٹہ، 2000ء۔

75 مولائی، شیدائی، میر رحیم داد شاہوانی، "تاریخِ قلات"، جلد اول، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، سنِ اشاعت

76 نادر قمبرانی، "وحدتِ افکار"، حصہ براہوئی مضمون (براہوئی رزمیہ شاعری)، سن اشاعت

77 ندوی، عبدالسلام، "شعر الہند"، (حصہ اول)، عشرت پبلشنگ ہاؤس، انار کلی، لاہور

78 ناگی انیس، "تنقید شعر"، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1987ء

79 نصیر، گل خان، میر، "تاریخ بلوچستان"، جلد اول و دوئم، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 1979ء

80 نصیر، گل خان، میر، "بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں"، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1982ء

81 نصیر، گل خان، "کوچ و بلوچ"، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 1983ء

82 نصیر، گل خان، میر، "بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی"، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1976ء

83 نصیر، گل خان، میر، "تاریخ خوانین قلات"، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1982ء

84 مصنفین حمیرا ہاشمی، ناصرہ فاروق، رفیق جعفر، عبدالحمید، "بنیادی موضوعات، حصہ اول "اطلاقی موضوعات، حصہ دوئم"

85 ہاشمی، رفیع الدین، "اصنافِ ادب"، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1991ء

86 ہیتو رام رائے، "تاریخِ بلوچستان"، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1987ء

87 یوسف، ٹی۔ایم، "جدید نفسیات"، پبلشر علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، 95-1994ء

براہوئی کُتب

88 اُلفت، میر محمد، "مُر واری"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1989ء

89 بیدار، عبدالقیوم، "عبدالمجید چوتوئی (فن و شخصیت)"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1983ء

90 بیدار، عبدالقیوم، "شجلاخ"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1984ء

91 براہوئی، انور، "دِترئی ہور"، پبلشر خود، 1985ء

92 براہوئی، جوہر، "ذردلنہ"، براہوئی پبلیکیشن فرید آباد میٹرھ، سندھ، سن اشاعت ندارد

93 براہوئی، جوہر، "احوالِ غم"، براہوئی پبلیکیشن، سندھ، 1976ء

94 براہوئی، جوہر، "گور بیچ"، براہوئی پبلیکیشن، سندھ، 1980ء

95 براہوئی، جوہر، قیوم، "سیرت رحمت العالمین"، فرید آباد پبلیکیشن حیدر آباد، سندھ، 1993ء

96 براہوئی، عبدالرحمٰن، "خلقی قصہ غاک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ

97 براہوئی، عبدالرحمٰن، "مثنوی ماہ گل"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1967ء

98 براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "گواڑخ"، ادارہ ادب بلوچستان، کوئٹہ، 1969ء

99 براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، "وساہتاک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1979ء

100 براہوئی، عبدالرحمٰن، "مستائی"، مجموعہ مقالات "براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1976ء

101 براہوئی، عبدالرحمٰن، "چاچا"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1981ء

102 بسمل، یٰسین، "گیاوان ناپھل"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1992ء

103 بسمل، یٰسین، "سنبل"، پبلشر خود، 1997ء

104 بلوچ، منظور، "برگشت"، زمرد پبلشرز، جناح روڈ، کوئٹہ، 1998ء

105 بلسم، رنگ، "مجموعہ مضامین و شاعری"، قلات پبلشرز کوئٹہ، 1983ء

106 ہنگرزئی، گل محمد، "دریہو"، براہوئی ناول، قلات پبلشرز کوئٹہ، 1989ء

107 ہنگرزئی، گل، "زندنا چراغ"، سعد پبلشرز، کوئٹہ، 1991ء

108 پروانہ، اسلم، "جذباتِ اسلم"، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ، 1995ء

109 توشہ ،(مرتب)، براھوئی اکیڈمی کوئٹہ ،1977ء

110 ٹیکی،(مرتب)، براھوئی اکیڈمی، کوئٹہ ،1976ء

111 جنک، احساس طاہرہ، "صدف"، پبلشرز براھوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ ،1995ء

112 جمالدینی، عاصم فرید، "سہیل"، راسکوہ ادبی دیوان، نوشکی ،1994ء

113 چوتوئی، عبدالمجید، حاجی، مولانا، "جوشِ حبیب"، 1357 ہجری

114 دینپوری، محمد عمر، مولانا، "آئینہ قیامت"، مکتبہ دینپوری، 1935ء

115 راہی، عزیز، "دیوانِ راہی، پبلشر خود، 1995ء

116 راہی، غلام نبی، "سیرت النبی"، پاکستان پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، کوئٹہ ،1976ء

117 رئیسانی، تاج، "انجیر نا پھل"، قلات پبلشرز جناح روڈ کوئٹہ ،1982ء

118 زہیرانی، پیر محمد، "تجلی"، براھوئی اکیڈمی، کوئٹہ ،1996ء

119 ساسولی، حیات غمخوار، "اُست نا ہتا"، راسکوہ ادبی دیوان، نوشکی، 2001ء

120 سوز اسحاق، "جذباتِ سوز"، پبلشر براھوئی ادبی دنیا شیخ واصل بلوچستان، 1972ء

121 سوز اسحاق، "گروشک"، پبلشر براھوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ ،1995ء

122 شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "جدید براھوئی نثری ادب"، سارلوان اکیڈمی، مستونگ ،1999ء

123 شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "تاریخ بلوچستان"، سارلوان اکیڈمی، مستونگ ،1995ء

124 شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "رواج"، سارلوان اکیڈمی، مستونگ، 1997ء

125 شاہوانی، عبدالحمید، پروفیسر، "براھوئی زبان و ادب"، سارلوان اکیڈمی، مستونگ، 1999ء

126 شرودی، محمد یعقوب، مولانا، "شکرپارہ"، پبلشر خود، سن اشاعت ندارد

127 شمیم، ظاہر ملک، "مہرنا مسافر، پبلشر تعمیر ادب مستونگ، 2001ء

128 صابر، عبدالرزاق، "چراغ صابر"، براھوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1981ء

129 صابر، عبدالرزاق، "شاہی خرواد"، شال پبلشرز ایسوسی ایشن، کوئٹہ ،1984ء

130 صابر، عبدالرزاق، "کلامِ تاجل"، براھوئی ادبی سوسائٹی پاکستان، کوئٹہ ،1988ء

131 صابر، عبدالرزاق، "براھوئی لکھوڑ"، براھوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ ،1999ء

132 ضیاء، عارف، ''سیشل''، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1995ء

133 قمبر انی، نادر، پروفیسر، ''بلبلِ مخزدار''، پبلشر براہوئی اکیڈمی پاکستان، کوئٹہ، 1995ء

134 قمبر انی، نادر، پروفیسر، ''شنزہ وگروک''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء

135 قلاتی، ملک داد، ملا، ''تحفۃ العجائب''، پبلشر حاجی نوجان قلندرانی، 1906ء

136 عبدالحق، میاں، مولانا، ''سخنِ حق''، پبلشر خود، 1951ء

137 غمخوار، محمد حسن، حاجی، ''طوبے ناسّنا''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1996ء

138 غمرد، عبدالرحمٰن، ''شف گروک''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1996ء

139 کنیتی، محمد عمر، حاجی، ''راغب المسلمین''، پبلشر خود، کوئٹہ، 1958ء

140 ''قدم قدم آباد''(مرتب) بارڈر پبلسٹی آرگنائزیشن، کوئٹہ، 1978ء

141 محمد اسماعیل، مولانا، ''گفتارِ عاشق''، پبلشر خود، کوئٹہ، 1958ء

142 مراد، افضل، ''سمند''، پبلشر براہوئی ادبی سوسائٹی پاکستان، کوئٹہ، 2001ء

143 مراد، افضل، '' ترنک''، ہائیکو سوسائٹی بلوچستان، کوئٹہ، 2001ء

144 مراد، افضل، ''کادیل''، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن، کوئٹہ، 1998ء

145 ندیم شمس، ''دریاب''، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 2001ء

146 نوشکوی، گل محمد، خلیفہ، ''پُو سکنادور''، پبلشر خود، کوئٹہ، 1972ء

147 نوشکوی، گل محمد، خلیفہ ''تحفۃ البلوچ''، پبلشر خود، 1946ء

148 نصیر، گل خان، ''مشہدنا جنگ نامہ''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1981ء

149 ناظر، محمد اقبال، ''پن ریچ''، کاروانِ ادب، کوئٹہ، 1999ء

150 مرزا ظفر، ''براہوئی گرائمر''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1980ء

151 مزاج محمد حنیف، ''لمہ''، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1996ء

152 مینگل، افضل، ''شوشنک''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء

153 مینگل، افضل، ''چوٹوبی''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1994ء

154 مینگل، افضل، ''منگی''، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 2000ء

155 مینگل، امیر الملک، "جور ناپھل"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1992ء

156 مینگل، عبدالواحد، پروفیسر، "اُست ناتوار"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1999ء

157 مینگل، عزیز، "تلوسہ"، پبلشر خود، 1991ء

158 مینگل، عزیز، " برفیچ "، رستم پبلشرز، پٹیل روڈ، کوئٹہ، 1995ء

159 مینگل، عزیز، "شلی"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1995ء

160 مینگل، عزیز، "تیرہ نک"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 2000ء

161 عبدالحق، ببلا، "کسر ناچاری"، براہوئی اکیڈمی، کوئٹہ، 1992ء

162 نور احمد، مولانا، "کلامِ نور"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 1978ء

163 یار، عبدالجبار، "دروشم نا ہنا"، براہوئی آرٹس اکیڈمی، کوئٹہ، 1991ء

164 یار، عبدالجبار، "بشخندہ"، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ، 2002ء

پشتو اور فارسی کُتب

165 کاکڑ، سیال، پروفیسر، "دَکسے دَ لمنی پشتانہ لیکوال"، (جلد اول)، بولان بک کارپوریشن، کوئٹہ، 1974ء

166 کاکڑ، سیال، پروفیسر، "دَکسے دَ لمنی پشتانہ لیکوال"، (جلد دوئم)، پشتو ادبی دنیا، 1983ء

167 لابکی، عبدالخالق، مولوی، "نجم کاروان"، مکتبہ لابکی (جامعہ اشرفیہ)، مستونگ بلوچستان، 1995ء

168 ہنگزئی، محمد حسن خان، نائب، "گلدستہ قلات"، پبلشرز مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، کوئٹہ، سن اشاعت ندارد

169 مگسی، زیب، نواب گل محمد، "خزینۃ الاشعار"، انجمن فارسی، کوئٹہ، 1996ء

170 مگسی، زیب، نواب گل محمد، "زیب نامہ"، انجمن فارسی بلوچستان، کوئٹہ، 1995ء

182 جرائد ،رسائل،اخبارات اور غیر مطبوعہ کُتب اور مقالے

1 ہفت روزہ ایلم، مستونگ، نور محمد پروانہ، سالانہ ریکارڈ، 1960ء

2 ہفت روزہ ایلم، مستونگ، نور محمد پروانہ، دو سالہ ریکار، 85-1984ء

3 لبلاغ، شعبہ لبلاغیات، جامعہ بلوچستان کوئٹہ، 1992ء

4 توئی توار، مستونگ، خادم لہڑی، (سالانہ ریکارڈ)، 1992ء

5 توئی توار، مستونگ، خادم لہڑی، (سالانہ ریکارڈ)، 1994ء

6 ماہنامہ ماہِ نور، لاہور، پروین ملک، نومبر، 1997ء

7 لبلاغ، شعبہ لبلاغیات، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 1999ء

8 سہ ماہی دے تک، کوئٹہ، قیوم بیدار، جنوری تا جون، 2000ء

9 استمان، کوئٹہ، اری اسیر ، مئی تا جولائی، 2000ء

10 توئی استار، سوراب، انجم براہوئی، 15 اپریل تا 15 مئی، 2001ء

11 توئی توار، مستونگ، خادم لہڑی، نومبر، 2001ء

12 توئی توار، مستونگ، خادم لہڑی، دسمبر، 2001ء

13 سروش (فارسی)، اسلام آباد، جنوری، فروری، 2002ء

14 توئی توار، مستونگ، خادم لہڑشی، جنوری، 2002ء

15 ماہنامہ ماہ نو (فیض نمبر)، لاہور، پروین ملک، فروری، 2002ء

16 توئی توار، مستونگ، خادم لہڑی، مارچ، 2002ء

17 "بلوچی اور براہوئی زبانوں کے روابط" (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، عبدالرزاق صابر، 1994ء

18 براہوئی زبان میں نثری ادب کا ارتقاء (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، عبدالحمید شاہوانی، 1996ء

19 نت شپاد، (غیر مطبوعہ شعری مجموعہ)، حمید عزیز آبادی، مستونگ۔

انگریزی کتب

171 Allah Bakhsh " The Book of the Brahui Language" Karachi, 1977, Reprint 1883, Brahui Academy, Quetta

172 John " Dictionary of Words Origin.

173 Andrenav, M.S. " The Brahui Langauge" , U.S.S.R. Academy of Sciences, Institute of Oriental Studies Masco, 1980.

174 Baloch, Muhammad Sardar Khan, "A Literary History of Balochies", Balochi Academy, Quetta, 1984.

175 Bray Denys, " The Brahui Language Intgroduction and Grammar",1907, Reprint Brahui Academy, Quetta, 1977.

176 Bray Denys, " The Brahui Language" , 1934, Seond Impression 1978, Brahui Acadcemy, Quetta.

177 District Gazzatier Balochistan (Full Set)

178 Grierson G.A. " linguistic Survey of India" Vol.V-Vi, Reprint Law Price Publications, Delhi, 1990.

179 Hughes A.W. " The Country of Balochistan" , Gosha-e-Adab, Quetta, 19

180 Pottinger Henery Lt., " Travels in Balochistan and Sind", (1816), Indus Publications, Karachi, 1976.

181 The Gazetteer of Balochistan, Quetta - Pishin, 1986 (Second Edition).